دعویٰ نہ کیا جاسکے؟ یہ صحیح ہے کہ پادری انہیں ذرائع سے حکومت کرتے تھے۔
جنھیں روحانیت کہا جاتا تھا یعنے اخراج از ملت، تعطل فرائض مذہبی، قہر خداوندی کے
تہدیدات، اور عنایت خداوندی کے دعوے لیکن یہ طریقے اگر فی الجملہ کچھ موثر تھے
تو وہ ایک دنیاوی غرض کے حصول کے لئے موثر ہو سکتے تھے، اور جیساکہ کلیسائی
اہل قلم کا دعویٰ تھا اگر اس امر کو ایک مرتبہ تسلیم کرلیا جاتا کہ ان طریقوں کے نفاذ کے
حدود کا تعین کرنا صرف کلیسا کا کام تھا تو بظاہر اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حدود
اس قدر وسیع قرار دئے جاتے کہ ان میں حقیقتاً آزاد دنیاوی حکومت کے لئے
کوئی جگہ ہی نہ باقی رہتی، اور چونکہ جاگیری نظریہ اور جاگیرانہ عمل کے درمیان قابل افسوس
فرق موجود تھا جس کا ذکر پہلے ہی ہوچکا ہے اس لئے دنیاوی حکمرانوں کو ان
کے فرض کا پابند رکھنے کے لئے ہر طرف سے مذہبی انقیاد کا شور مچا ہوا تھا (پھر
بھی وہ کب کسی کو خاطر میں لاتے تھے) پس ہلڈے براند کا یہ خواب کہ ایک ایسا
ذی اقتدار پوپ ہو جو تمام تنازعات کا عقدہ کشا ہو معاملات صلح و جنگ میں
اسے اعلیٰ اختیار حاصل ہو سلطنتوں کی متنازعہ فیہ وراثتوں کا تصفیہ، ظالموں کی معزولی اس
کے ہاتھ میں ہو، خلاصہ یہ کہ بادشاہ یا شہنشاہ کے بجائے جاگیری انتظام کا حقیقی مرکز
پوپ ہو جائے، یہ ایک ایسا خواب تھا کہ صلیبی جنگہائے عظیم کے دور میں خیالات
وحسیات کی جو کیفیت اور جاگیری نظم کی نامکمل ترتیب میں واقعات سیاسیہ کی جو حالت
تھی وہ بہ شدت تمام کلیسا پر یہ زور دے رہی تھی کہ وہ اس خواب کو عملی صورت
میں لے آئے۔

۵۔ کامل حکومت مذہبی کی اس کوشش کو اہم ترین عروج انوسنٹ سوم
(۱۱۹۸ء تا ۱۲۱۶ء) کے دور پاپائیت میں حاصل ہوا، مگر اس تمام کوشش کے
آغاز و انجام کو ہم دو شہرۂ آفاق و افسانہ وار کشمکشوں کے ساتھ وابستہ کرسکتے ہیں،
یعنی آغاز اس کا ہلڈے براند (یعنی پوپ گریگوری ہفتم ۱۰۷۳ء) اور شہنشاہ ہنری چہارم
کی کشاکش سے ہوا اور انجام اس کا چودھویں صدی کے آغاز میں پوپ
بانیفیس ہشتم اور فلپ (خوبرو) شاہ فرانس کی کشمکش پر ہوا، جبکہ بادشاہ اپنی تمام
مملکت کو اپنی تائید میں لئے ہوئے پوپ کے اس تقدس مآب دعوے

کے ساتھ بہ تقابل پیش آیا کہ وہ جس طرح چاہیے قوموں اور شاہیوں کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے، تباہ و برباد کر دے اور (پھر اپنے حسب دلخواہ) انھیں صورت پذیر اور استوار کر دے" اس کے فرمان کو عوام کے سامنے جلا ڈالا، اور خود پوپ کو گرفتار کر لیا اسے مذہبی حکومت کا خاتمہ قرار دینے سے میرا یہ منشا نہیں ہے کہ پاپائیت نے اپنے دعاوی کو ترک کر دیا، میرا خیال تو یہ ہے کہ ان دعاوی سے باضابطہ طور پر کبھی (بلکہ اس وقت تک بھی) دست برداری نہیں کی گئی ہے مگر اس سے یہ عیاں ہو جاتا ہے کہ اس وقت پر پہونچکر اس کا اقتدار لوگوں کے دلوں سے اس قدر گھٹ گیا تھا کہ کامل حکومت مذہبی کی کوئی توقع باقی نہیں رہ گئی تھی اگرچہ ہنوز اس میں اتنی قوت تھی کہ وہ وقتاً فوقتاً یورپ کے دنیاوی معاملات میں عام طور پر زبردست مداخلت کر سکے، اور اطالیہ کی سیاسی معرکہ آرائیوں میں باقاعدہ مقدم جگہ حاصل کر سکے۔

یورپ انوسنٹ سوم جس نوعیت اور جس حد کا مذہبی اقتدار عمل میں لایا اس پر زیادہ غایر نظر ڈالنا باعث دلچسپی ہوگا۔ جس عہد کا اس وقت ہم خیال کر رہے ہیں اس وقت عام طور پر دنیاوی طاقتوں کا جو حال تھا وہ حال اس کا نہیں تھا کہ جس قطعہ اراضی پر وہ حاوی ہو وہ اپنے مرکز پر تو زیادہ قوی ہو اور مرکز سے جتنا ہی بعد ہوتا جائے اسی نسبت سے اس میں کمزوری آتی جائے، بلکہ اس کے برعکس ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعد کے ساتھ ساتھ اس کا اثر امتیازی بڑھتا جاتا تھا یہ دیکھنا حیرت سے خالی نہیں ہے کہ انوسنٹ تک کے وقت میں اطالیہ کے اندر پاپائیت کی حکمت عملی کی خصوصیت یہ تھی کہ ہوشیاری و تدبیر سے کام نکالا جائے اور اس کے مقابلے میں دور کے حکمرانوں پر پوپ بڑی شان کے ساتھ احکام صادر کرتا تھا اور اس میں اسے کامیابی بھی ہوتی تھی، مثلاً انوسنٹ نے ہنگری کے ڈیوک اندریاس کو حکم دیا کہ وہ ارض مقدس کی طرف کوچ کر جائے تاکہ اس کے بھائی بادشاہ ہنگری کو اطمینان نصیب ہو، اور اس کے بھائی کو یہ حکم دیا کہ وہ سزا دہی کے لئے بوسینا کے بان، (صوبہ دار) پر حملہ آور ہو کیونکہ اس نے مرتدوں کو پناہ دے رکھی تھی۔ شاہان ڈنمارک و سویڈن کو

یہ اشتعال دلایا کہ وہ شاہ نارویے کو اس کے تاج و تخت سے محروم کر دیں، اور
ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ کو وہ اس حالت میں لے آیا کہ انھوں
نے خود کو مسند مقدس کا باجگزار قرار دیدیا کلیسائی وقائع نگار کے دعوی کے بموجب
سنہ ۱۱۹۸ء میں پرتگال کا بادشاہ اور اس کی بادشاہی پوپ کی باجگزار بنکر "مقدس بطرس"
کی حفاظت میں آگئی۔ سنہ ۱۲۰۴ء میں شاہ اریگان نے اپنی بادشاہی انوسنٹ کے
حضور میں پیش کی اور اسے ہمیشہ کے لئے اس کا اور اس کے جانشینوں کا باجگزار
بنادیا۔ سنہ ۱۲۰۷ء میں شاہ پولستان نے اور (جیسا کہ ہم سب کو معلوم ہے) سنہ ۱۲۱۳ء میں
جان شاہ انگلستان نے یہی حیثیت اختیار کی۔

یہ صحیح ہے کہ ان ملکوں میں سے کسی ملک میں بھی پوپ کی سیادت کے
ان اعترافات کی قوم نے توثیق نہیں کی، درحقیقت (جیسا کہ ہمیں انگلستان کے
متعلق معلوم ہے) ان اعترافات سے بادشاہ کی اس سعی کا اظہار ہوتا ہے کہ امرا
کے ساتھ جدوجہد میں وہ اپنی تائید کے لئے کلیسائی طرف جھکتا جاتا تھا، مگر یہ امر
واقعہ کہ ایک بادشاہ کے بعد دوسرے بادشاہ نے اس قسم کا اعتراف کیا بجائے
خود بہت ہی حیرت افزا معلوم ہوتا ہے۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے
کہ پوپ اس حیثیت کے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ازمنۂ وسطیٰ کے قدیم
سیاسی تخیل کے بموجب (جسے انوسنٹ سوم کے ایک صدی بعد دانتی نے
از سر نو زندہ کرنا چاہا) جاگیری طبقۂ حکمراں کے سرتاج شہنشاہ کو حاصل ہونا چاہیئے
تھی، پاپائیت نے مغربی یورپ کے دنیاوی معاملات میں فوقیت حاصل کرنے کی
جو مسلسل و متصل کوشش کی اس پر غور کرتے ہوئے اس امر کا خیال رکھنا بھی بہت
ضروری ہے کہ اس نے اپنی کمان میں دو تیر جوڑ رکھے تھے، بقول اسٹبز ایک عام
دعویٰ تو وہ تھا جسے گریگوری ہفتم اور اس کے جانشینوں نے پیش کر رکھا تھا،
کہ پوپ کو دنیاوی بادشاہوں پر تفوق حاصل ہے یعنی روئے زمین پر جس روحانی
طاقت کا مخزن اعلیٰ پوپ ہے وہ فی نفسہ دنیاوی طاقت سے فائق ہے[۱] مگر جیسا کہ

[۱] اسٹبز تاریخ دستوری جلد سوم باب نوزدہم صفحہ ۳۰۰۔

ہم دیکھ چکے ہیں اس کے سوا خاص خاص ملکوں پر سیادت کے خاص دعاوی بھی تھے جنکی بنا خاص قانونی مفروضات اور خاص قوانین پر تھی۔ یہ سمجھ لینا بہت آسان ہے کہ ہوشیاری کے ساتھ فکر و تدبیر سے یہ آخر الذکر مخصوص قسم کی فوقیت کیونکر موقع و محل پا کر خود اس عام فوقیت سے پیدا ہو جاتی تھی، اور پھر اپنی باری میں اس عام فوقیت کو تقویت دیتی تھی۔ اس دور میں اس خاص قسم کی فوقیت انگلستان کی طرح اسکاٹلینڈ اور آئرستان پر بھی قائم ہو گئی تھی یا اس کا دعوی کیا جاتا تھا، اور مدت تک نیپلز پر بھی قائم رہی اور جیسا کہ ابھی ذکر ہو چکا ہے کچھ دیر کے لئے اریگان و پرتگال پر بھی اپنا پرتو ڈال گئی۔

۶۔ جن قطعی نیم قانونی دلائل سے حکومت مذہبی کے ان دعاوی کی تائید کیجاتی تھی، اب ایک بڑی حد تک ان کی دلچسپی زائل ہو گئی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے طرز استدلال میں تعمق نظر، جولانی ذہن اور محنت پژوہی کے باوجود جس قسم کا امکان محال، ضعف بنا اور عدم ربط عام طور پر پایا جاتا ہے وہ ان دلائل میں ضرورت سے زیادہ موجود ہوتا تھا۔ اس دعوی کی بنیاد وضعی تاریخ، جعلی دستاویزات، انجیل کی خرافات تحریفوں اور تشبیہوں پر رکھی گئی تھی۔ نویں صدی کے مجموعہ فرامین میں سابق کے پاپاؤں کے بہت سے جعلی خطوط شامل ہیں، جن میں دنیاوی حکمرانوں کو اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ انھیں میں قسطنطین کا فرضی عطیہ بھی ہے جس کا ذکر پہلی مرتبہ ۷۹۱ء میں ہوا مگر گیارھویں صدی تک نمایاں طور پر اسے آگے نہیں بڑھایا گیا۔ بہت سنجیدگی کے ساتھ یہ دعوی کیا جاتا اور اس پر یقین بھی کیا جاتا تھا کہ شہنشاہ مذکور جب خود قسطنطنیہ کو چلا گیا تو اس عطیہ کے ذریعہ سے اس نے پاپائے مقدس سلوسٹر کو نہ صرف شہنشاہی نشان، قبا، عصا، اور محل دیدیا بلکہ تمام صوبے اور شہر یعنی اطالیہ و مغرب کا کل ملک اس کے حوالے کر دیا۔ اوٹو اعظم نے جب دسویں صدی میں مقدس رومانی شہنشاہی کی تجدید کی اور جان دوازدہم سے "مسند مقدس" کی حفاظت اور روما کی آزادی کی وقعت کا وعدہ کیا تو اس وعدے کے متعلق بھی یہ تلبیس کی گئی کہ اس پر جاگیرانہ اطاعت کے حلف کا رنگ چڑھا یا گیا۔ دنیاوی حدود کے اندر پوپ کی فوقیت کے نتائج اس قسم کے

خارج العقل دلائل سے نکالے گئے کہ بطرس کو کنجیاں عطا ہوئی تھیں یا یہ کہ شہنشاہی اور پاپائی کی مثال علی الترتیب "چاند اور سورج" سے دیگئی ہے۔

اس قسم کے دلائل کے پڑھنے سے ہم یہ عاجلانہ نتیجہ اخذ کرنے کی طرف مائل ہو جاتے کہ مذہبی حکومت کی تمام بنائے قوت نیم مہذب زمانے کی وہم پرستانہ زود اعتقادی پر تھی مگر یہ نتیجہ عاجلانہ و یک طرفہ ہوگا۔ ان مضحکہ انگیز و مغالطہ آمیز مفروضات و نتائج کی تہ میں یا ان کے ساتھ ایسے حقیقی وزن رکھنے والے مباحث بھی ہیں جن پر غور کرنا ضروری و اہم ہے۔ اول یہ کہ کلیسا کی جداگانہ و نیم خود مختارانہ تنظیم کی بنا اس یقین پر تھی کہ مسیحی نظم معاشرت کے اتحاد کا دار و مدار کلیسا کے اتحاد پر تھا، اور کلیسا کے اتحاد کے لئے ایک ایسے داخلی ارتباط کی حاجت تھی جس کا قیام و دوام بغیر اس کے نہیں ہو سکتا تھا کہ قسیسوں کی خود مختاری کو بالاستقلال قائم رکھا جائے۔ اس وجہ سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ قسیس دنیاوی عدالتوں اور دنیاوی محصولوں سے علٰحدہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ ایک یقین صادق یہ تھا، کہ حق و انصاف کے مفاد کے لئے کلیسا کی مداخلت کی مسلسل ضرورت ہے اور یہ یقین بھی اسی نتیجہ پر پہنچاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ازمنۂ وسطیٰ کے نظم معاشرت کی خصوصیت خاص یہ تھی کہ سلطنت خداوندی civitas Dei کے اندر (جو اصلاً مغربی یورپ کے تمام مسیحی عالم پر چھا گئی تھی) تقدس و امن کا ایک اعلیٰ تخیل قائم رہنا چاہئے مگر اس کے ساتھ عملی واقعات یہ تھے کہ جور و زیادتی اور زبردستوں کے ہاتھوں زیردستوں کی حق تلفی کا بازار گرم تھا۔

پس جس طرح ارسطاطالیس کا اثر روایتی مسیحی عقیدۂ مسلمہ سے ملکر ازمنۂ وسطیٰ کے فلسفے کے وجود میں لانے کا باعث ہوا اسی طرح زندگی کے مسیحی نقطہ نظر پر ارسطاطالیسی خیال کا اطلاق سلطنت کے اوپر کلیسا کی فوقیت کا موید بن گیا۔ ارسطو نے بہبود انسانی کے عنصر کی حیثیت سے سیاسی افعال پر غور و فکر کی فوقیت کے متعلق جو کچھ کہا تھا اسے اس معنی میں پھیر لیا گیا کہ اس سے دنیاوی زندگی پر مذہبی زندگی کی فوقیت کی تائید ہوتی ہے اور اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ جس تنظیم کا مقصد روحانی بہبود ہے اسے اس تنظیم پر تفوق حاصل ہے

جو صرف دنیاوی بہبود کے حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ مزید براں، صحیح بادشاہ جو تمام قوم کی بہتری کے لئے قانون کے بموجب حکمرانی کرتا ہے، اور وہ خودسر جو اپنے ذاتی مقصد کے لئے قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے، ان دونوں کے درمیان ارسطو نے جو فرق قائم کیا تھا اسے بھی ازمنۂ وسطیٰ کے اہل فکر نے پوری طرح سمجھ لیا تھا اور اس پر بحثیں کرنے لگے تھے۔ اس بے لگام، خود غرض کے لئے کسی نہ کسی تدارک کا ہونا ضرور تھا، اور اس کا صرف ایک سہل علاج یہی معلوم ہوتا تھا۔ جہانبانوں کی طرف سے زجر و توبیخ ہوتی رہے، لیکن اگر ایسا ہوا تو اس تدارک کے عمل میں لانے کا فریضہ نائب عیسیٰ کے ہاتھ میں ہونا چاہئے کیونکہ وہی تنہا بادشاہوں اور حکمرانوں سے بالاتر تھا۔ اس سے یہ دعویٰ نکلا کہ جو حکمران مقدس پطرس (حواری) کے جانشین کے احکام کی خلاف ورزی کرے پوپ اسے معزول کر دے، اور اس سے بالطبع یہ مزید ادعا پیدا ہوا کہ جو صاحب اقتدار معزول کر سکتا ہے وہ نصب و تقرر سے انکار بھی کر سکتا ہے، اور اس تقدیس سے بھی انکار کر سکتا ہے جو عیسائیوں کے احساس عام کے بموجب بادشاہوں کے صحیح طور پر نصب ہونے کے لئے ضروری تھی۔ جب اسے ایک مرتبہ تسلیم کر لیا گیا تو پھر ایک ایسی فوقیت تسلیم ہو گئی جسے اب اور کمال تک پہنچانے میں جاگیری اطاعت شعاری سے کچھ ایسی مدد نہیں مل سکتی تھی۔

یہ تو ظاہر ہے کہ کلیسائی طبقۂ حکمراں یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ دنیاوی حکومت کے فرائض اختیار کرنا چاہتا ہے، ازمنۂ وسطیٰ کے لوگوں اور خاصکر متکلمین کے طبایع میں بال کی کھال نکالنے کی جیسی عادت تھی مذہبی حکومت کی حمایت کرنے میں بھی اس سے کام لیا جاتا تھا اور وہ ہوشیاری کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ اگرچہ کلیسا کے پاس روحانی و دنیاوی دونوں تلواریں ہیں مگر وہ دنیاوی تلوار سے کام نہیں لیتا ہے، بلکہ دنیاوی اختیار کے واقعی نفاذ کو وہ دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے مگر وہ یہ دعویٰ رکھتا ہے کہ اسکا نفاذ مذہب کے اقتدار کے تحت میں اور اس کی منظوری سے ہونا چاہئے۔

بہر حال، (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) سترھویں صدی کے اختتام کے بعد دنیاوی حکومتوں کی خود مختاری کی راہ میں یہ دعویٰ زیادہ اہم طور پر سد راہ نہیں رہا، مگر پادریوں کی تنظیم و ترتیب ایک ایسے غیر ملکی حکمراں کے تحت میں باقی رہ گئی جس نے اصلاح کے زمانے تک اپنے اس حق یا عادت سے دست کشی نہیں کی کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں پادریوں پر محصول لگاتار ہے، نہ اپنے اس حق کو ترک کیا کہ مذہبی عدالتوں کا مرافعہ اس کے سامنے پیش ہو اور قانون مذہبی کے قواعد سے وہ معافیاں دیسکے، اور اس سے قومی اتحاد وار تباط میں، (مختلف جگہوں میں) مختلف زور و قوت کے ساتھ رکاوٹ ہوتی رہی، لیکن چودھویں صدی میں ۱۳۰۵ء سے ۱۳۷۶ء تک اوی نیو کے قیام کی وجہ سے جو "قید بابل" کے نام سے مشہور ہے، اور جس کی وجہ سے پاپائیت ضرورت سے زیادہ فرانس کے اثر میں آگئی، پاپائیت میں ضعف آگیا، اس کے بعد ۱۳۷۶ء-۱۴۱۷ء کے "افتراق اعظم" اور اس کوشش کی وجہ سے کہ کلیسا کی شاہانہ مطلق العنانی کو موثر طور پر عام کونسلوں کے تحت میں لاکر دبا دیا جائے (اس میں مزید ضعف پیدا ہو گیا) جب پندرھویں صدی میں اس کوشش کی ناکامی سے پاپائیت کا امتیاز خاص از سر نو زندہ ہوا، تو اس وقت "نشاۂ جدیدہ" کا پورا زور شور تھا جس نے ان مذہبی عقائد ہی کو کمزور کر دیا تھا جن کے اوپر پاپائیت کا انحصار تھا، اور اس کے بعد پھر پاپائی بادشاہی نے اپنی کوشش کو اسی امر پر مرکوز رکھا کہ اطالیہ کے اندر اپنی مملکتی حیثیت کو مستحکم کرے۔

خطبۂ شانزدہم

بلاد ازمنۂ وسطیٰ - طرز عام

۱- ازمنۂ وسطیٰ کے نظم حکومت کے وہ تین عناصر جن کی ترقی جاگیری دور میں بھی، حاوی و غالب جاگیریت سے معاشر و مباثن تھی، ان میں سے میں اب دوسرے عنصر کی طرف توجہ کرتا ہوں، یہ دوسرا عنصر تجارتی و حرفتی عنصر تھا اور جس کے قائم مقام بلدیات سمجھے جا سکتے ہیں۔

عام الفاظ میں یہ کہنا چاہئے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں پر دو حیثیت سے غور ہو سکتا ہے۔ ایک طرف تو اس وسیع تر مجموعے کے اجزا تھے جسے ہم قوم کہتے ہیں، اور قوم کے مقدر پر اس کے نشو و نما کا اہم اثر پڑتا تھا، اس حیثیت کے متعلق میں بعد کے (سلسلہ) بیان میں پھر کچھ کہوں گا۔ دوسری طرف یہ کہ جاگیری نظم کو جیسا نا مکمل انضباط و انصرام حاصل ہوا خود اسی کی وجہ سے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کو بہت معقول حد تک خود مختاری حاصل ہو گئی۔ یہ ضرور ہے کہ وسیع تر مجموعے کا انضباط جس قدر زیادہ تھا اسی نسبت سے اس خود مختاری میں کمی تھی اور میں، کچھ تو اس خطبے اور کچھ آئندہ کے چار خطبوں میں اسی نقطۂ نظر سے اس ارتقاء کا درجہ بدرجہ پتا چلانا چاہتا ہوں، میں پہلے بلاد ازمنۂ وسطیٰ کے عام طرز پر بحث کروں گا۔

میں نے ایک سابق کے خطبے میں مغربی یورپ کی قوموں کے

سیاسی ارتقا کی عام یکرنگی پر زور دیا ہے۔ میرا منشا یہ نہیں ہے کہ ان سب میں ایک ہی وقت میں ایک ہی طرز کی حکومت نظر آتی ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اگر ہم بحیثیت مجموعی ان کا تصور اپنے ذہن میں قائم کریں۔ تو یونانی شہری سلطنتوں کیطرح یہاں بھی ہم یہ دیکھیں گے کہ بالواسطہ ان کے ارتقا کے مبہم مدارج میں معاشری ترکیب اور حکومت دونوں اعتبارات سے ایک خاص طرز کی طرف میلان غالب موجود ہے۔ چنانچہ میں خطبۂ چہاردہم میں یہ تشریح کر چکا ہوں کہ قطعی معنی میں اگرچہ جاگیریت مغربی یورپ کے صرف ایک حصّے میں مستحکم طور پر قائم ہوئی تھی تاہم یہ حصّہ بہت بڑا حصّہ تھا اور اس جاگیریت صحیحہ کی حد سے باہر ہمیں وہ حالات نظر آتے ہیں جنھیں ہم نیم جاگیری کہہ سکتے ہیں اور پھر حکومت مذہبی کیجانب گامزن ہونے کا بھی یہی حال تھا۔ اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حکومت مذہبی کی اس تحریک نے مغربی یورپ کے تمام ملکوں پر یکساں اثر ڈالا تھا (مثلاً یہ کہ پوپ کے ساتھ اطالیہ کا تعلق ہمیشہ نہایت ہی خاص قسم کا رہا ہے) تاہم مغربی یورپ پر اس کا اثر بہت ہی عجیب و غریب طور پر پھیلا ہوا تھا، جیسا کہ ہمیں ان ملکوں کی فہرست سے معلوم ہو چکا ہے جن پر پوپ کو دعوائے سیادت تھا۔ علیٰ ہذا جیسا کہ میں بعد کو ظاہر کرونگا، ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور یعنے تیرھویں یا چودھویں صدی سے سولھویں یا سترھویں صدی تک مغربی یورپ کے اکثر و بیشتر ممالک ایک ایسے دور سے ہو کر گذرے تھے جس میں قومی معاملات کی نگرانی میں (اسٹیٹس، ڈائٹ یا پارلیمنٹ وغیرہ کے نام کی) کسی نہ کسی قسم کی نیابتی جمعیتوں کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور ہوتا تھا خواہ یہ اثر عارضی ہی کیوں نہ ہو۔ سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں مطلق العنان بادشاہی کے غلبے کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ طرز اگرچہ مستثنیات سے خالی نہیں تھا اور ان مستثنیات میں انگلستان سب سے زیادہ اہم تھا، مگر اس میں شک نہیں کہ اسکو رائج الوقت واقعہ کہہ سکتے ہیں۔

ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعت جس کی جانب میں اب خیال رجوع کرنا چاہتا ہوں، اس کی بابت بھی یہی کچھ کہا جا سکتا ہے اور یہاں اس پر

زور دینے کی اور بھی زیادہ ضرورت اس وجہ سے ہے کہ مختلف ممالک میں شہروں نے جیسی خود مختارانہ قوت اور شان و شکوہ حاصل کی ان کے عظیم الشان و حیرت افزا اختلافات کی وجہ سے ان کے طرز کی یہ عام یکسانی تاریخ کے عام مطالعہ کرنے والوں کی نظر سے مخفی رہجاتی ہے، مگر اسی طرز نے مختلف یورپی ممالک میں جس طرح ترقی کی اس میں مذکورۂ بالا اختلافات کے ہوتے ہوئے بھی ہم نمایاں مشابہت کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ انگلستان، فرانس، جرمنی، سوئیڈن، اطالیہ جہاں کہیں بھی ازمنۂ وسطیٰ میں شہروں کو کافی اہمیت حاصل ہوئی اور انہی سیاسی زندگی کو پوری طرح نشو و نما دینے کے لئے کافی آزادی میسر آئی، وہاں عام طور پر شہروں میں ایسی حرفتی تنظیم پیدا ہوئی جو زمانہ جدیدہ سے تو کچھ مشابہت ہی نہیں رکھتی تھی، اور قدیم شہری سلطنتوں کی زندگی میں جو عجائبات نظر آتے ہیں ان سے بھی نمایاں حد تک مغائر تھی، یہ مغائیرت مختلف اسباب کے اجتماع کا نتیجہ تھی ایک حد تک اس کا سراغ اس نہایت ہی اساسی فرق میں ملتا ہے جو قدیم و جدید یورپی تمدن میں پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ اول الذکر کی بنا غلامی پر تھی اور اس لئے آزاد اشخاص کا محنت مزدوری کرنا فلسفیوں تک کی نظر میں بالطبع غلامانہ پیشہ معلوم ہوتا تھا، اسکے برخلاف ازمنۂ وسطیٰ میں محنت مزدوری کرنے کا جس وقت سے ہمیں قطعی علم ہوتا ہے اس وقت سے ہم اسے آزاد دیکھتے ہیں اور اس دور کے موخر زمانے میں تو اس عمل بالید کو تاریخ یورپ میں پہلی مرتبہ تمام یورپ میں عروج حاصل ہوا۔ لیکن قدیم شہری سلطنتوں کے نظام حکومت اور زندگی کے بالمقابل ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے نظام حکومت اور زندگی کے پورے فرق کا پتا ایک حد تک اس سے چلتا ہے کہ جب ان کا مقابلہ یونان کی قدیم شہری سلطنتوں سے کیا جاتا ہے تو جن ملکی سلطنتوں کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں ان کے عجائب کی پیچیدگی بہت بڑھی ہوئی نظر آتی ہے اور اسپنسر اسے انکے اجزا کی تفریق مزید کہتے گا، یہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم شہری سلطنتوں کی تکوین محض ایک چھوٹی سی قومی جماعت کے اجتماع سے ہو جاتی تھی اور اس طرح بڑے

زمیندار جو قدیم خاندانوں اور ارباب دول پر مشتمل تھے شہر کے سر برآوردہ باشندے بن جاتے تھے۔ اس کے برخلاف ازمنہ وسطیٰ کے شہروں کی نشوونما ایک ایسی قوم کے اندر ہوئی تھی جن کا حکمراں طبقہ، عموماً ان شہروں سے باہر رہتا تھا۔ بڑے بڑے جاگیری زمیندار اپنے ٹیوٹنی عادات و اطوار کو برقرار رکھتے اور شدت کے ساتھ دہقانی بنے رہتے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر حرفتی شہروں سے کبھی بہت ہی قریب میں اور کبھی بالکل ہی دیہات میں رہتے تھے، اور جب پختہ جاگیریت کی نیم انتظامی حالت نے ترقی کی تو ان لوگوں نے براعظم یورپ میں ہر جگہ دیہاتوں کے اندر دفاعی اور جارحانہ ضرورتوں سے قلعے تعمیر کر لئے۔ شہر زیادہ تر ان لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے گئے جنھیں اولاً نظم معاشرت کا نسبتاً وہ حقیر جزو سمجھا جاتا تھا جسے حرفت و تجارت پر گذراوقات کرنا پڑتی تھی اور شہر جس قدر اہمیت و خودمختاری میں ترقی کرتے جاتے تھے۔ اسی قدر وہ اپنی سیاسی ہیئت اور زندگی کے اعتبار سے خود کو دیہاتوں سے (فی الجملہ) ممیز کرتے جاتے تھے۔ شہروں کے باشندے بلکہ شہروں کے ان سر برآوردہ لوگوں تک کی نسبت جو شہروں کے معاملات کا انتظام کرتے تھے، مسلّم طور پر یہ سمجھا جانے لگا تھا کہ وہ اپنے طرز زندگی اور اپنے غالب و حاوی اغراض و مفاد کے لحاظ سے قوم کے ان سر برآوردہ ارکان سے حقیقتاً مغائر ہیں جو اردگرد کے دیہاتی اضلاع میں حکمرانی کرتے اور ابتک ملک کی مجموعی حکومت میں غلبہ رکھتے تھے، Citizen ("شہری") اب ایک نئے مفہوم میں استعمال ہونے لگا اب اس کے وہ معنی نہیں رہے جو یونانی لفظ πολιτης ("پولی تیس") اور لاطینی لفظ ("سِوس") کے تھے یعنی سلطنتوں کے وہ رکن جنھیں سلطنتوں کے سیاسی اختیارات اور اقتدار حکومت میں کچھ حصّہ حاصل ہو اور مملکت جس قدر عمومیت کی طرف قدم بڑھاتی جائے اسی قدر اس حصے میں اضافہ ہوتا جائے، بلکہ اب اس کے معنے دیہات کے باشندوں سے ممیز شہر کے ان باشندوں کے تھے جو مخصوص طور پر شہری اغراض و مفاد Bourgeois

اور شہری طرز زندگی کے حامل ہوں اور یہ اختصاص سربرآوردہ شہریوں کو بھی بہ حیثیت ایک طبقے کے ان دیہاتی شرفا سے متغائر بنادیتا تھا جن کے ساتھ اکثر صورتوں میں مدت دراز تک ان کے معاندانہ تعلقات قائم رہے۔

پس ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے مختلف مجموعوں کے درمیان بہت ہی اہم سیاسی فرق کی موجودگی کے باوجود بھی یہ حالت وسیع معنی میں صحیح وصادق رہی اور یہ سیاسی فرق نتیجہ تھا ان مختلف تعلقات کا جو شہر اور شہر کے حکمراں طبقے اور گرد و پیش کے ملک کی حکومت اور اس کے حکمراں طبقے کے درمیان قائم تھا۔ ان فرقوں میں سب سے زیادہ تعجب انگیز فرق کا آخری سراغ مقدس رومانی شاہی اور اس کے اس اثر میں ملتا ہے جس نے (اس تفریق پذیر قلمرو کے اندر جس پر اصولاً شہنشاہ فرمانروا تھا) مرکزی حکومت کو کمزور کردیا تھا۔

اس پر ہم ایک سابق خطبے میں[1] غور کرچکے ہیں مگر اس وقت مجھے جس امر کو خاص طور پر زیر بحث لانا ہے وہ یہ ہے کہ ازمنۂ جدیدہ کی جرمنی اور شمالی اٹلی شاہی غلبے کے دور میں جس طرح برقرار رہ گئیں، وہ محض نیم خود مختارانہ امارتوں سے مرکب نہیں تھیں شہنشاہی کے ضعف سے جس طرح والیان ملک کو موقع ہاتھ آگیا اسی طرح شہروں نے بھی نفع اٹھایا۔ اس ضعف سے جرمنی میں شہروں کی ایک تعداد کثیر کو یہ موقع مل گیا کہ انھوں نے اپنے قریب ترین کلیسائی و دنیاوی امرا بلکہ ایک زمانے میں خود شہنشاہ کی مقاومت کے باوجود زر و زور یا غصب کے وسیلے سے اپنے کو شہنشاہی شہروں کے درجے پر پہنچادیا جس سے معنوی طور پر ان کی نسبت یہ تسلیم کیا جانے لگا کہ وہ مختلف امارتوں کے مانند خود مختار و نیم فرمانروا ہیں یعنی شہنشاہ اور شہنشاہی مجلس ملی کے سوا اور کسی کی وفاداری ان پہ فرض نہیں رہی تھی، اور تیرھویں صدی کے آخر سے

[1] خطبۂ سیزدہم۔

مجلس ملی میں ان کی جگہ مسلّم ہوگئی تھی، اور باضابطہ طور پر ان کی یہ حیثیت خود بقائے شہنشاہی تک قائم رہی، یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ازمنۂ جدیدہ کی تاریخ میں انھیں زیادہ نمایاں اہمیت نہیں حاصل تھی ان پر خاموشی طاری تھی اور (اس لئے) عام مورخ ان پر نظر نہیں ڈالتے، مگر ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور میں حالت کچھ اور رہی تھی۔ یہ شہر اپنے قرب وجوار کے جاگیرداروں سے کشاکش رکھتے اور ان سے لڑتے تھے، پہلے تو فرداً فرداً ایسا کرتے رہے اور بعد میں لیگ اور عہدیت قائم کرکے برسر آزما ہوئے۔ جب شمال جرمنی کے بڑے بڑے شہروں کی ہنسیائی لیگ خود اپنے طور پر اور مساویانہ شرائط کے ساتھ اسکنڈنیویا کی شاہیوں سے جنگ کرنے لگی ہے تو پھر بہت ہی معمولی مورخ کو بھی اس پر نظر ڈالنا پڑتی ہے۔

شمالی اطالیہ میں شہنشاہ کی شاہی طاقت جرمنی سے بھی کمتر درجہ پر تھی شہنشاہ کو لمبارڈی کا تاج پہننے کا مسلمہ حق حاصل تھا، اور اس نے بارہا یہ کوشش کی کہ اطالیہ میں اپنا موثر اقتدار اعلیٰ قائم رکھے، مگر اس میں اسے کبھی وقتی کامیابی سے زیادہ کچھ حاصل نہ ہوا۔ اس لئے اطالیہ میں شہروں نے جرمنی سے بھی زیادہ شاندار تفرد پیدا کر لیا مگر اکثر صورتوں میں یہ حالت جرمنی کے بہ نسبت کم زمانے تک قائم رہی اور ہنگامی طور پر تو یہاں تک ہوا کہ ان شہروں نے عملاً کامل خودمختاری حاصل کرلی، درحقیقت شمالی اطالیہ کے ایک معقول حصّے میں شہروں نے دیہاتوں کو دبالیا اور ان مضافات کی زمین متصلہ شہری سلطنتوں کے اندر اس طرح تقسیم ہوگئی جس طرح قدیم زمانے میں یونان میں ہوتا تھا۔ بارھویں صدی کے وسط سے قبل ہی، لمبارڈی کے شہروں نے اتنی ترقی کرلی اور اس حد تک خودمختاری حاصل کرلی تھی وہ آپس میں نہایت ہی شدید قسم کی لڑائیاں لڑنے لگے تھے۔ بعد کے زمانے میں فلورنس اور سینا، وینس، اور جینوا کی تاریخ پڑھنے والوں کی توجہ ایتھنز، اسپارٹا اور تھیبز کی طرح اپنی جانب منعطف کرلیتے ہیں، اور دوسرے کثیر التعداد شہر جو مدت تک

عملاً خود مختار رہے ان کی طرف بھی ان مذکرۂ بالا شہروں کے تعلقات کی وجہ سے مجبوراً توجہ کرنا پڑتی ہے۔ درحقیقت اطالیہ کے ازمنۂ وسطیٰ کے خود مختار بلدی زندگی کے اس شاداب نشو و نما کا اثر سترھویں صدی میں بہت ہی کم باقی رہ گیا تھا مگر پھر بھی بعض بعض اجزا تو باقی ہی رہ گئے تھے، اور انھیں میں ایک وینس بھی تھا جو ازمنۂ وسطیٰ و ازمنۂ جدیدہ میں عدیدی استقامت کا ایک حیرت انگیز نمونہ تھا۔

پس اب یہ امر آسانی سے ذہن میں آسکتا ہے کہ شہر جس قدر زیادہ خود مختاری حاصل کرتے جاتے تھے اسی قدر وہ قدیم یونان کی خود مختار شہری سلطنتوں سے زیادہ مکمل طور پر مشابہ ہوتے جاتے تھے۔ پس اس تشابہ و تقابل کو پوری طرح ظاہر کرنے کے لئے میں آئندہ کے چار خطبات میں اپنی توجہ اس امر پر مرکوز رکھونگا کہ ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعتوں نے جرمنی و اطالیہ میں اپنے سیاسی ارتقا کے دوران میں جو سیاسی ترکیب و ہیئت اختیار کی وہ کیا تھی اور ان میں خاص کر اطالیہ کے بارے میں یہ ظاہر کرونگا کہ مغربی یورپ کے دوسرے ممالک کے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے بالمقابل اطالیہ میں خاص انھیں شہروں کے غلبے کی وجہ سے کیونکر ان کی سیاسی ہیئت ترکیبی، معاشری زندگی اور آخری انجام میں اہم تغیرات پیدا ہو گئے مگر سر دست میں اختلافات کی بہ نسبت زیادہ تر مشابہات یعنے ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے عام خصوصیات پر بحث کرنا چاہتا ہوں اور اسے عیاں کرنے کے لئے میں اب اس ملک کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جو مرکزی حکومت کے پرزور نفاذ اقتدار کے اعتبار سے جرمنی و اطالیہ سے بعد المشرقین کا حکم رکھتا تھا، یعنے انگلستان۔

(۲)۔ ازمنۂ وسطیٰ کے دوران میں شہنشاہی کے شہروں کی تاریخ میں جن افسانہ وار دلچسپیوں کی بہتات ہے انگلستان کے شہروں کی تاریخ میں ان کی بہت کمی ہے جرمنی میں قلعہ بند اصحاب تصور کے ساتھ جس طرح "ناقابل مصالحت جنگ" کا بازار گرم رہتا تھا اور اطالیہ میں اکثر ایک شہر دوسرے شہر پر جیسے ہیئت ناک حملے کیا کرتا تھا، یہ سب باتیں انگلستان میں اس زبردست مرکزی حکومت کی وجہ سے خارج از بحث ہو گئی تھیں جو نارمن فتح کے بعد سے

انگلستان میں فی الجملہ برابر قائم رہی، صرف اندرونی بدنظمی کے بہت ہی قلیل زمانوں میں اس ایسا میں فرق پڑا۔ اس زبردست مرکزی حکومت نے شہروں کی ترقی کو تنگ حدود کے اندر مقید رکھا۔ اگرچہ کبھی کبھی ان کی بددلی سے کسی قدر فوری ابتری پیدا ہوجاتی تھی مگر آزادانہ جنگ کا اختیار ایک ایسا اختیار تھا کہ اس کے دعوی سے وہ بالکلیہ روک دیئے گئے تھے اور موثر طور پر روک دیئے گئے تھے۔ درحقیقت، جب اسٹیون کے عہد حکومت کی بیس برس کی طوائف الملوکی کے ختم ہونے کے بعد "غیر اجازت یافتہ گڑھیاں" ڈھادی گئیں تو جاگیری بیرنوں میں آپس کی لڑائیاں بھی اچھی طرح دب گئیں (جیسا کہ ہم دیکھیں گے نہ) انگریزی قوم کے سیاسی ارتقا میں "نئی اختیار قصبات" کی ترقی بھی اہمیت رکھتی تھی مگر انگلستان کے شہروں اور قصبوں کی بلدی حکومت کیسی ہی تغیرات میں سے کیوں نہ گزرتی رہی ہو اس نے اقتدار اعلےٰ کے اہم ترین فرائض کا نہ کبھی دعوی کیا نہ انھیں انجام دیا۔ اس بلدی حکومت کے ارتقا کو کسی حال میں بھی خودمختار مملکتوں کے ارتقا سے نسبت نہیں دیجاسکتی۔ اس ارتقا کو ہمیشہ اسی نظر سے دیکھنا پڑتا ہے کہ یہ ایک وسیع مجموعے کے ارتقا کا جزو تھا۔

لیکن باوجود اس اصولی فرق کے، ہم ازمنۂ وسطیٰ کے انگریزی جرمانی اور اطالوی شہروں کی ہیئت ترکیبی میں ایک مشترک طرز کا بھی پتا چلا سکتے ہیں، اور یہ ایسا طرز تھا کہ جس قدر اس ہیئت ترکیبی کو کامل ترقی حاصل ہوتی جاتی تھی اسی قدر اس طرز کے اوصاف خصوصی زیادہ نمایاں ہوتے جاتے تھے مثلاً یہ کہ جب انگلستان کے شہروں اور قصبوں نے کامل طور پر قومی حکومت کے زیر اقتدار رہتے ہوئے، خود کو مقامی انتظامی نظم سے آزاد کر لیا اور حکومت خود اختیاری کے معقول اختیارات حاصل کر لیے (تو یہ طرز زیادہ نمایاں ہوگیا) نہ صرف یہ کہ (انگریزی و براعظمی) دونوں اصناف کے شہر اور قصبے حقیقۃً صنعتی جماعتوں پر مشتمل تھے جن کے حکمراں ارکان (یعنے وہ لوگ جن کے ہاتھ میں بلدی حکومت کی باگ ہوتی تھی) تجارت صنعت و حرفت میں مشغول رہتے تھے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کی صنعتی ہیئت ترکیبی حیرت انگیز حد تک یکساں تھی یعنے کل مجموعے کے ترکیبی عناصر، اور ان عناصر کے باہمی تعلقات

ان کی معاشی ہیئت ترکیبی کا اثر جس صورت سے حکومت پر پڑتا تھا، اور جس طریقے سے ان کی حکومت ان اختیارات کو عمل میں لاتی تھی، جو تجارتی وصنعتی معاملات میں انھیں تفویض کیے گئے تھے، ان سب میں یکسانیت موجود تھی۔ وینس کو چھوڑ کر اطالوی جمہوریتوں میں سب سے زیادہ مشہور وطاقتور جمہوریہ یعنے فلورنس میں صحیح شہری اور کامل شہری وہی شخص ہوتا تھا جس کا شغل تجارت وصنعت ہو اور اس تخصیص میں انگلستان کے بازار والے پرامن قصبے کسی نہج سے کم نہ تھے۔ جب شہر کو پوری ترقی حاصل ہوگئی تو شہری حکمران جماعت کی ترکیب اس اصول پر قرار دی گئی کہ شہریت کا حق اور آزادانہ تجارتی وحرفتی مشاغل کا حق صحیح معنی میں ایک دوسرے سے ناقابل انفکاک ہو گئے۔ ان دونوں صورتوں (یعنے انگلستان وبراعظم دونوں مقامات) میں جو شہری جماعت اس طرح پر ترتیب پاتی تھی اس نے کوشش یہ کی کہ بازار کے قواعد وضوابط اور باہمی بلدی مراسلات کے ذریعے سے اپنے رقیب شہروں کے بالمقابل ہر ایک ناممکن نفع اپنے لئے محفوظ کرلیں، اور یہ خیال قائم کیا کہ ہر ایک مقدم واہم پیشے کی خود اپنی تنظیم ہو اور اپنے ہی عہدہ دار ہوں جو اس پیشے کے ارکان پر حرفتی نگرانی کا منتجسانہ طریقہ قائم رکھیں اور اکثر صورتوں میں یہ خیال بھی مسلم ومقبول ہوگیا کہ شہری حکمراں جماعت میں ان حرفتی گروہوں میں سے ہر ایک گروہ کا خود اپنا نمایندہ ہونا چاہیئے ۔[1]

میں تخصیص کے ساتھ اسی آخری خصوصیت پر نظر ڈالونگا جس کی وجہ سے از منۂ وسطیٰ کی شہری جماعت ایک طرح پر صنعتی گروہوں کی شترکیت ہوگئی تھی؛ یہ گروہ "پیشہ" "اسرار صنعت وحرفت یا فنون" تھے، اور ان کے آثار باقیات میں سے ہم اس وقت لندن کے بزازوں اور نور بافوں وغیرہ کی انجمنیں دیکھتے ہیں۔ ہر گروہ کو خود اپنے اوپر حکومت کرنے کے کسی قدر آزادانہ اختیارات حاصل ہوتے تھے جن کا اعلان کردہ عام مقصد زیادہ تر یہی ہوتا تھا کہ ہر ایک تجارت وحرفت پر ایسی نگرانی رکھی جائے جس سے سامان کی خوبی اور اچھے کام کا عام مقبولہ معیار

[1] ایشلی، انگلستان کی معاشی تاریخ جلد دوم صفحہ ۷

برقرار رہے اور ہمیں یہ یقین کرنا چاہیئے کہ ابتداءً گروہ بندی کے اصلی مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی تھا۔ معاشی وسیاسی اغراض کے لئے شہری جماعت کی یہ ہئیت ترکیبی کسی قدر کشمکش اور تصادم میں پڑنے کے بعد حاصل ہوئی تھی، اور اگرچہ اس کشمکش وتصادم کی شدت (مختلف مقامات میں) بہت کچھ مختلف تھی اور انگلستان میں تو نسبتاً بہت ہی خفیف تھی، پھر بھی مغربی یورپ کے مختلف ملکوں میں جب ہم اس کا باہمی مقابلہ کرتے ہیں تو اس کے مدارج عمل کے اندر بہت کچھ یکسانیت پاتے ہیں۔

برّ اعظم کی طرح انگلستان میں بھی یہ ہوا کہ شہروں نے اپنے گرد وپیش کے حصص ملک کے معاشری وسیاسی نظم سے بتدریج ہی آزادی حاصل کی، اس لئے اولاً حق شہریت صرف شہر کے ان باشندوں تک محدود رہا جو حدود شہر کے اندر زمین کے مالک ہوتے تھے صرف اسی قسم کے "قصباتی آراضی دار" شہری جمعیت کے کامل الحقوق رکن ہوتے تھے۔

پھر برّ اعظم ہی کی طرح انگلستان میں بھی یہ ہوا کہ جب شہروں کی صنعتی خصوصیت صاف طور پر نمایاں ہوگئی تو تاجروں کے عنصر نے دستکاروں کے عنصر سے ممیز ہوکر سرگروہی حاصل کرلی اور کچھ زمانے تک شہر کی حکومت پر عملاً انھیں کا اجارہ قائم ہوگیا۔ کم از کم انگلستان کے بعض شہروں میں تو تیرھویں صدی میں یہ ہوا کہ دستکار باضابطہ طور پر شہر کے آزاد (یعنی ذی اختیار) طبقے سے خارج کر دیئے گئے اگر کسی دستکار کو آزاد بننے کی خواہش ہوتی تو اس کے لئے ضروری تھا کہ پہلے وہ دستکاری کو ترک کرے اور اپنے گھر سے اوزار نکال باہر کرے کبھی کبھی تو یہاں تک ہوا کہ دستکاروں کے اس استحقاق کی بھی مقاومت کی گئی کہ وہ اپنے اوپر حکومت کرنے کی غرض سے اپنی تنظیم قائم کرسکتے ہیں، لندن میں جان کے عہد میں شہریوں نے خزانے میں سالانہ ایک رقم اس شرط سے داخل کرنے کی رائے پیش کی کہ جولاہوں کی "گلڈ" منسوخ کردی جائے لیکن ایک وقت آیا کہ پانسہ بالکل ہی پلٹ گیا۔ نہ صرف اہل حرفہ کی گونہ خود مختارانہ تنظیم کے ساتھ رواداری برتی گئی بلکہ اسکی ترقی ووسعت مرکزی حکومت کی تنظیم کا ایک جزو ہوگئی۔ ایڈورڈ سوم کے عہد کے ختم ہوتے ہوئے بجائے اس کے کہ دستکار شہریت کے ناقابل ہوتے لندن کے اندر شہریت کے لئے شرط یہ قرار پائی کہ کسی انجمن کا رکن ہونا ضروری ہے۔ ہر ایک "دستکاری یا انجمن" کے باضابطہ

اجلاس ہونے لگے اور وہ جماعتیں اپنے افسر منتخب کرنے لگیں جو عام اغراض کے لئے محصول کی ایک مقدار عاید کرتے تھے اور عدالتی اختیار اور تجسس کے بعض حقوق کو عمل میں لاتے تھے۔

دستکاروں کی انجمنوں کے ارکان کے اس طرح بتدریج سوداگروں کے ساتھ مساوی امتیاز کی حد کو پہنچ جانے کو ہم ازمنۂ وسطےٰ کی شہری جماعت کی "تحریک بہ جانب عمومیت" کہہ سکتے ہیں، جو کسی حد تک یونانی رومانی شہری سلطنتوں کی "تحریک بہ جانب عمومیت" سے مشابہت رکھتی تھی گر ازمنۂ جدیدہ کے نقطۂ نظر سے دونوں صورتوں میں صریحاً نامکمل تھی لیکن دونوں تحریکوں کا فرق نہایت ہی حیرت افزا ہے، یونانی شہری سلطنت میں عمومیت کی جد و جہد کے تمام دوران میں عدیدی عوام دونوں زیادہ تر زراعت پیشہ رہے اور جہاں عمومیت کو فتح حاصل ہوتی تھی وہاں اگرچہ آزاد اہل حرفہ انجام کار کامل شہری ہو جاتے تھے پھر بھی دستکارانہ محنت مزدوری زیادہ تر غلاموں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ اس کے برخلاف (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں عدیدی (اگر میں اس اصطلاح کا استعمال کر سکتا ہوں) حقیقتاً تاجر تھے اور عمومیت فی الحقیقت دستکاروں کی عمومیت تھی۔ یہ بھی خیال رکھئے کہ قدیم شہری سلطنتوں میں یہ کشمکش شخصی حقوق خاص کی وسعت کے لئے تھی، اور بعد میں زمانہ جدیدہ کی ملکی سلطنتوں میں بھی جہاں تک عمومی تحریک کا تعلق ہے یہی حال تھا اس کے برخلاف ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں دستکاروں کی منضبط جماعتیں تھیں جو اپنے مجموعی حقوق خاص کے لئے جد و جہد کر رہی تھیں۔ ایک حد تک اسی کا نتیجہ تھا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے ارتقا کے آخری درجے میں ہمیں ایک قسم کی عدیدیت کا میلان تسلیم کرنا پڑتا ہے جو خود دستکاروں کے اندر اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب انھوں نے اپنی امتیازی حیثیت حاصل کر لی تھی، یہ حالت اگرچہ جرمنی و اطالیہ کی بہ نسبت انگلستان میں کم تھی پھر بھی تھی ضرور۔ حرفت کے یہ حقوق خاص مالکانہ دستکاروں تک محدود تھے اور اس لئے ان میں اور عام مزدوروں کے روز افزوں طبقے میں تفریق پیدا ہو گئی، اور مزدوروں کے مالکانہ دستکار بن جانے کے راستے میں رکاوٹیں حائل کی جانے لگیں، مثلاً یہ کہ داخلے کا نذرانہ بہت گراں مقرر کیا گیا۔

اور پیشے کے ارکان کو پر تکلف ناشتہ یا کھانا کھلانا پڑتا تھا۔ مزید براں خود مالکانہ دستکاروں کے درمیان میں حکومت کا عدیدی طرز ترقی کرتا گیا یا یہ کہ زیادہ سخت ہوگیا۔ دستکاروں کی یہ سیاسی کامیابی ہی ان کی عمومی خصوصیت کی تباہی کا باعث بن گئی۔ کیونکہ جب یہ قاعدہ مستحکم ہوگیا کہ شہری حق رائے دہی کے حصول کے لئے کسی منضبط انجمن دستکاروں کا رکن ہونا شرط لازمی ہے تو پھر جو لوگ دولت و معاشری حیثیت میں معمولی دستکاروں سے بلند تھے وہ "حرفتوں" یا انجمنوں کے رکن بن گئے اور پھر بالطبع ان انجمنوں کے اندر سربرآوردہ حیثیت حاصل کر لی۔ اس لئے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اپنے آخری دور میں انجمنوں کی حکومت اور نیز وہ شہری جماعتیں جو انجمنوں پر مشتمل تھیں اکثر صورتوں میں بہت زیادہ عدیدی ہوگئی تھیں۔

میں نے ایسا بیان پیش کرنے کی کوشش کی ہے جو ارتقا کے اس طریق عمل کا نمونہ ہو جب اسے پوری طرح پھیلنے کا موقع ملگیا تھا' یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ فروعات کے اعتبار سے تنوعات و مستثنیات بہت کثیر تھے' اور خاص کر یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ملک کی حکومت سے شہری حکومت کی بے تعلقی' امیر جاگیرداروں کے ساتھ شہروں کے تعلقات اور تاجروں اور دستکاروں کے آپس کے تغیر پذیر روابط جملہ اعتبارات سے برّاعظم کے سربرآوردہ شہروں میں بالعموم ایسی شدید و طولانی معرکہ آرائی جاری رہی جس کا انگلستان میں کہیں پتہ بھی نہیں چلتا' خاص کر اطالیہ میں شہروں اور امیروں کے باہمی تعلقات بدامنی کا مستقل منبع و مخزن بنے رہے۔ (جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے)

۳۔ شہروں نے جن اوقات میں کم و بیش زیادہ خود مختاری حاصل کی' اور نیز جس حد تک وہ خود مختاری کے درجے پر پہنچے یہ دونوں امور مغربی یورپ کے مختلف حصص میں ایک دوسرے سے بہت ہی مختلف تھے' اسپین کے شہروں کو بہت پہلے خود مختاری حاصل ہوئی' اور یہ تقدم شہروں کی اس شرکت عمل کا مآل طبیعی معلوم ہوتا ہے جو ان سے مسلمانوں کے خلاف جد و جہد میں (جن سے آہستہ آہستہ اسپین واپس لیا جارہا تھا) ظہور میں آئی۔ چنانچہ اسپین میں گیارھویں صدی میں شہروں کو منشور عطا ہوگئے تھے اور وہ خود اپنے عاملوں اور عادلوں اور سپہ سالاروں کا انتخاب کرتے

اور اپنی زمین کے لئے صرف ایک مقررہ معتدل لگان ادا کرتے تھے[1]۔ اطالیہ میں بارھویں صدی کے اوائل میں لمبارڈی کے اکثر اور ٹسکینی کے متعدد شہروں نے اسی قسم کے حقوق خاص حاصل کر لئے تھے (جیساکہ ہم بعد کو دیکھیں گے)۔

جب ہم فرانس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو ہم نیم خود مختار شہروں اور مختلف درجوں کی خود مختاری کے متعدد نمونے دیکھتے ہیں، جو دور جاگیری میں مختلف حصص ملک کے مختلف حالات کے باعث ظہور میں آئے اور ازمنۂ وسطیٰ کے سیاسی واقعات عجیبہ کے کثیر التنوع کیفیات کی توضیح و تمثیل کے خیال سے ان اختلافات پر نظر ڈالنے کے لئے ایک لمحہ ٹھہر جانا سودمند ہوگا۔ ملک کے وسطی حصے میں جہاں بادشاہ کو حقیقی قوت حاصل تھی وہاں اگرچہ دولت و آبادی کی فراوانی کے خیال سے شاہی حکمت عملی شہروں کے نشو و نما کو تربیت دینے کی طرف مائل تھی، مگر باشندوں کے صرف شہری حقوق کو وسعت دیجاتی تھی اور اقتدار اعلےٰ کا کوئی جزو انھیں عطا نہیں کیا جاتا تھا۔ اہل شہر اب غلامان وابستۂ اراضی نہیں بلکہ بادشاہ کے شہری ہو جاتے تھے اور اس طرح آزادی و طمانیت میں جو زیادتی ہوئی بہت ہی قابل قدر تھی، لوری کا منشور اس قسم کے شہروں کے لئے نمونہ تھا اور بارھویں صدی کے دوران میں اس کی استدعا و یافت بہت کثرت کے ساتھ ہوتی رہی، مگر اب بھی اس قسم کے شہروں کی فوج محافظ کی سپہ سالاری ان کے محصولوں کی وصولی اور انجمن انصاف کا نفاذ یہ سب شاہی عہدہ دار انجام دیتے رہے لیکن انصاف کے نفاذ اور محاصل و مزدوری کے اجرا میں قدیم خود رایانہ روش متروک ہوگئی بلکہ تمام ادائی و خدمات ایک معین مقدار میں مقرر کر دیگئی تھیں۔ فرانس کا مغربی حصہ جو بارھویں صدی میں انگریزی حکومت کے تحت میں تھا اس کی نسبت بھی یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی حالت بھی بہت کچھ ایسی ہی تھی، البتہ ہنری دوم اور رچرڈ کے عطا کردہ منشوروں میں سیاسی اختیارات کے متعلق

---

[1] اطالیہ کے بالمقابل یہ دیکھنا خالی از دلچسپی نہیں ہو کہ ہسپانیہ کے متعدد قدیمی منشوروں میں صاف طور پر یہ شرط لگا دی گئی تھی کہ کوئی امیر اراضی بلدیہ کے اندر جائداد غیر منقولہ نہ حاصل کرے گا نہ کوئی قلعہ تعمیر کرے گا۔

کسی قدر زیادہ فراخدلی سے کام لیا گیا تھا۔ اس کے برخلاف، شمال مشرق اور جنوب
مشرق میں بعض شہروں نے ایسی سیاسی خودمختاری حاصل کر لی تھی جو عملاً جاگیری امرائے
عظام کی خودمختاری کے ہمپایہ تھی؛ یہ شہر اگرچہ ڈیوک، کاؤنٹ یا اسقف کے زیر اقتدار
رہتے تھے مگر انھوں نے شہر میں انصاف کے عملدرآمد پر پورا قابو حاصل کر لیا تھا، صلح و
جنگ اور معاہدے خود اپنے طور پر کرتے، خود اپنے حکام کا انتخاب عمل میں لاتے
اور اپنے ہی قوانین کے مطابق اپنی حکومت چلاتے تھے، مگر ان نیم خودمختار شہروں کی
حکومت خود اختیاری کی معاشری ہیئت ترکیبی اور ان کا طرز شمال و جنوب میں
ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ جنوب خاصکر قدیم رومانی صوبے میں جہاں
بربریوں کی فتح نے قدیم غالیہ اور روما کی معاشری تنظیم کو محض خفیف طور پر
محو کیا تھا، وہاں شہروں کے اندر قدیم طبقۂ امرا کا عنصر موجود تھا اور اس لئے
وہاں صنعتی عنصر کے غلبے کی تکمیل کم ہوئی۔ یہاں کے سیاسی ادارات اطالیہ کے
ان سیاسی ادارات سے زیادہ مشابہ ہیں جن کا حال ہم اطالوی شہروں کے بیان پر
پہنچکر دیکھیں گے۔ یہاں ہم "قنصل" ان کی خاص و عام مجلس، پارلیمنٹ یا عام
جمعیت قوم اور ان میں غیر ملکی "پودستا" قائم مقام یہ سب کچھ مشاہدہ کرتے ہیں
اس کے برخلاف آمیاں، بودمے، سواسوں اور شمال کے دوسرے شہروں
میں ہمیں نہایت ہی نمایاں قسم کا ازمنۂ وسطیٰ کا طرز نظر آتا ہے یعنی ان تاجروں
اور دستکاروں کی وہ آزاد انجمنیں تھیں جو حرفت و تجارت سے دولتمند ہو گئے
تھے "کمیون کے لئے حلف اٹھاتے" اور اپنے قرب و جوار کے جاگیری امرا سے
معقول حد تک خودمختاری کے وسیع کرنے یا بزور حاصل کر لینے کے لئے باہم
مربوط ہو گئے تھے۔ خودمختاری کی اس معقول حد کے اندر اپنے شہروں پر
کامل ابتدائی اختیار عدالتی (جس میں سزائے موت تک شامل تھی) اور صلح و
جنگ کرنے کا حق سب داخل تھا۔ بعدازاں جب فرانس کی بادشاہی نے انضباط
کی طرف قدم بڑھائے تو نیم خودمختار شہروں کی خودمختاری ہر جگہ گھٹ گئی اور آخرالامر گذرے ہوئے
زمانے کی بات ہو گئی۔ پھر بھی (جیسا کہ ہم بعد میں دیکھیں گے) قومی حکومت کے
نشو و نما پر شہروں کے ارتقا کا نہایت اہم اثر پڑا۔

خطبۂ ہفتدہم

بلدیات ازمنۂ وسطیٰ۔ جرمانی

۱۔ ازمنۂ وسطیٰ کی شہری جماعتوں سے متعلقہ خطبات میں مجھے فکر یہ ہے کہ مختلف یورپی ممالک کے اندر ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کا جب ہم مقابلہ کریں تو انھیں جو نہایت اہم تشابہات پائے جائیں انھیں صاف طور پر عیاں کردیں اور اس کے ساتھ ہی مختلف ممالک کے مختلف حالات کی وجہ سے جو اختلافات پیدا ہوئے اور وہ بھی اہمیت میں کسی طرح کم نہیں ہیں، انھیں بھی واضح کرسکیں لیکن اُن تشابہات پر زور دینے کے متعلق مجھے کسی قدر زیادہ خیال ہے (کیونکہ عام مورخ انھیں نظر انداز کرجائے گا) مثلاً یہ کہ فریمین کے گرانمایہ مضمون قدیم یونان و ازمنۂ وسطیٰ کی اطالیہ میں قدیم یونان کی کامل خودمختار شہری مملکتوں اور ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ کی عملی حیثیت سے تقریباً خودمختار شہری جماعت کے درمیان بہت سے دلچسپ تشابہات و تخالفات دیئے گئے ہیں مگر ان صفحوں میں صرف چند ہی سطریں ایسی ہیں (اور ان پر بھی کچھ یوں ہی سی نظر پڑجاتی ہے) جس میں اس حقیقت کی جانب بھی اشارہ کیا گیا ہو جو شہرۂ آفاق فلورنس اور یورپ کے دوسرے کم نماندار شہروں میں مشترک تھی یعنی یہ کہ خاص شہری جماعت تجارتی یا حرفتی عناصر سے مرکب تھی جن کا انضباط مخصوص تجارتوں اور حرفتوں کی صورت میں ہوا تھا۔

بہرحال ان تشابہات و اختلافات کو صاف اور نیز مختصر طور پر آپ کی نظروں کے سامنے لانے کے لئے میں نے آپ کی توجہ انگلستان کی طرف منعطف کی تھی، جہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہر مرکزی حکومت کے موثر اقتدار کے تحت میں

ترقی کرتے جاتے تھے (مگر جیسا کہ میں نے کہا تھا) میری خواہش یہ تھی کہ جرمنی پر بھی ایک نظر ڈالی جائے کیونکہ ازمنۂ وسطی کے خالص طرز کے شہر خود مختاری کی جس انتہائی حد تک پہنچ گئے تھے اس کا خالص نمونہ ہمیں جرمنی ہی میں نظر آتا ہے اور شمالی اطالیہ میں بھی دکھائی دیتا ہے جہاں ہم ازمنۂ وسطی کے شہروں کو غایت درجے کی خود مختاری اور غلبے پر پہونچا ہوا دیکھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ہی اس غلبے نے ان کے طرز کی خالص کیفیت کو نقصان پہنچا دیا تھا کیونکہ جاگیری امرا کو جب شہروں میں قیام کرنے کے لئے مجبور کیا گیا یا انھیں ترغیب دیکر رکھا گیا تو وہ ایک مادی و غالب حرفتی نظم حکومت کے اندر کم و بیش ایک خارجی عنصر ہو گئے اور (جیسا کہ ہم دیکھیں گے) اس خارجی عنصر کے امتزاج سے شدید نتایج پیدا ہوئے۔

پس اس وجہ سے اس خطبے کا موضوع جرمنی کے اندر شہری جماعت کا سیاسی ارتقا ہے۔ جرمنی سے مراد آلپس کے شمال کے وہ اقطاع ہیں جو مقدس رومانی شہنشاہی کے زیر تسلط تھے اور یہاں یہ مناسب ہے کہ مغربی یورپ کے دو حصوں کے درمیانی فرق پر نظر رکھی جائے کیونکہ ازمنۂ وسطی کے معاشری و سیاسی ارتقا کا قدم بقدم پتہ چلانے میں یہ فرق اہمیت رکھتا ہے۔ یہ فرق ان دو حصوں کا فرق ہے جس میں سے ایک حصہ متمدن و مہذب ہو گیا تھا اور اس میں تمدن (یعنی وہ قدیم رومانی تمدن جس نے مسیحیت کا جامہ پہن لیا تھا) بربریوں کے حملوں اور فتوحات سے دب گیا تھا، مگر بالکل تباہ نہیں ہو گیا تھا، اور دوسرا حصہ وہ ہے جو غیر متمدن ہی رہا تھا اور جس میں ٹیوٹنی، رومانی، اور دیگر عناصر سے امتزاج یافتہ نئے تمدن کو ازمنۂ وسطی کے ابتدائی حصے میں وسعت دی گئی تھی۔ وسیع معنوں میں یہ کہ مغرب کی طرف رائن اور ڈینیوب قدیم رومانی شہنشاہی کے حدود تھے۔ اگرچہ جدید زمانوں کے حدود سے ہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ رومانی تمدن ان حدود کے کناروں تک کمزور شکل میں وسعت پذیر ہوا تھا، بہرحال جو کچھ بھی ہو ان حدود سے باہر ازمنۂ وسطے کے ابتدائی حالات کے تحت میں جرمنی کو بالکل متمدن بنانا تھا اور تمدن کو مشرق کی طرف لیجانے کی اس کارروائی میں کلیسا اور شہر دونوں نے اہم کام انجام دیئے اور بہت زمانے تک کلیسائی و حرفتی دونوں عناصر نے تمدن پیدا کرنے میں متحد ہو کر کام کیا۔ درحقیقت جب ہم بلدی ارتقا کی جانچ کرنا چاہیں،

تو ہمیں اس کا آغاز اسی طرح کرنا پڑتا ہے کہ جرمنی واطالیہ دونوں ملکوں میں شہروں کے ارتقا کے پہلے ہی قدم میں کلیسا نے جس اہم اثر سے کام لیا اس پر نظر ڈالیں، اس کی وجہ کچھ تو کلیسا و شہنشاہی کا وہ اتحاد ہے جو چارلس اعظم کے قوی الضبط تسلط کی بنیاد تھا، کلیسا اس کی حکمت عملی کا ایک بڑا آلہ تھا چنانچہ اس کا نہایت ہی نمایاں اظہار ملک سکسنی کی فتح اور جرمنی کے تبدیل مذہب سے ہوتا ہے جہاں اس نے آٹھ اسقفیاں اور خانقاہیں قائم کیں جن سے ہر طرف تمدن پھیلتا رہا، آٹو اعظم نے جب جرمنی واطالیہ میں شہنشاہی کا احیاء کیا تو اس نے بھی اس اتحاد کو قائم رکھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اطالیہ میں کلیسا قدیم تمدن کے باقیات کا محافظ تھا، اور جرمنی میں وہ نئے تمدن کا منبع تھا۔

بس کچھ تو فرنیک بادشاہوں کی حکمت عملی کی وجہ سے اور کچھ ان بادشاہوں اور دوسرے دولتمند زمینداروں کے دلوں کے مذہبی اثر کی وجہ سے شاہی عطیات، نذر و وصیت اور کبھی کبھی کسی پر آشوب زمانے میں چھوٹے چھوٹے جو پائے امن زمینداروں کے اپنی زمینیں کلیسا کے حوالہ کر دینے کے باعث بہت ہی بڑے بڑے قطعات اراضی اساقفہ ور وسائے خانقاہ کے قبضے میں آ گئے اور اس طرح یہ لوگ جاگیری نظم میں داخل اور دنیاوی باجگذار امرائے عظام کے ہم مرتبہ ہو گئے۔ ان کے جو فوجی مستاجر پٹہ دار (کاشتکار)، بادشاہ کی فوجی خدمت کے لئے طلب کرنے پر بجا آوری حکم کے لئے اسی درجہ پابند تھے جس درجہ دنیاوی امرا کے تابعین پابند تھے، لیکن کلیسا اگرچہ اس طرح نیم جاگیری حالت میں آ گیا تھا تاہم اس نے اپنی نمایاں خصوصیت کو برباد نہیں کیا تھا، اور اس کے مذہبی اثر نے اسے دوسروں کی حفاظت کی جو خاص قوت دیدی تھی اس کی وجہ سے وہ اس قابل ہو گیا تھا کہ شہروں کے نشوونما میں تازہ روح پھونکنے کا بند و بست کر سکے، رائن اور آلپس کے ماورا کلیسا کے عام تمدن آفریں کاموں کا یہ بھی ایک جزو تھا۔

یہاں میں یہ خیال ظاہر کر سکتا ہوں کہ ایک اہم خصوصیت میں جرمانی شہروں کا طرز ہمیں از منۂ وسطیٰ کے اطالوی شہروں کی بہ نسبت قدیم یونانی شہروں کی زیادہ یاد دلاتا ہے۔ ان شہروں نے بلدی تمدن کو خشکی کے راستے سے اسی طرح وسعت دی جس طرح یونانی شہروں نے اسے سمندر کے راستے سے پھیلایا۔ ان شہروں نے اس تمدن کو ہنگری پولستان اسکینڈنیویا اور روس تک میں پہونچایا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جس ملک کو ہم اب جرمنی کہتے ہیں

اس کے شرقی حصے پر ٹیوٹنی تمدن نے زیادہ تر اسی طرح فتح حاصل کی کہ اس میں جرمانی جماعتیں بلدی نظام حکومت کو لئے ہوئے زراعت پیشہ آبادی کے اندر (جو زیادہ تر وینڈیا سلافی نسل سے تھی) آباد کی گئیں۔

اطالیہ و اپیگن سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو جرمانی شہروں کا حیرت انگیز نشو و نما زمانے کے اعتبار سے مقدم نہیں ہے مگر دیرپائی میں نہایت ہی نمایاں رہا۔ ان جرمانی شہروں کی خارجی اہمیت چودھویں صدی تک بڑھتی رہی اور مزید دو صدیوں تک بغیر انحطاط کے قائم رہی۔ اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اگرچہ ان شہروں کی نشو و نما کی پشت پناہی میں کلیسا نے سربراہی اختیار کی مگر انجام کار تیرھویں اور چودھویں صدی میں والیان ملک اور دوسرے امرائے ملک نے فیاضانہ ہمت افزائی سے کام لیا اور یہ ہمت افزائی زیادہ تر محض اس اقتصادی بنا پر تھی کہ یہ شہر ملکی امرا کو جو لگان و مطالبات ادا کرتے تھے وہ ان کی آمدنی کا ایک بیش قرار ذریعہ بن گیا تھا۔ اب یہ عام طور پر مسلم ہو گیا کہ بڑے بڑے علاقوں کے اندر زرخیز شہروں کا قیام اول درجے کی ترقی تھی لیکن ان شہری جماعتوں کے اوسط سیاسی ارتقا کے پتہ چلانے میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ان کا آغاز و انجام دونوں مختلف مدارج کے ساتھ ہوا۔ جن شہروں کی بنا بعد میں پڑی انہیں اکثر کشمکش اور آزادی کے ان ابتدائی مراحل میں سے گزرنا نہیں پڑا جن سے قدیم تر شہروں کو سابقہ پڑ چکا تھا۔ دوسری طرف ان آخری شہروں میں سے بہت سے ایسے بھی تھے کہ انھوں نے لڑتے لڑتے شہنشاہی کے آزاد شہروں کی حیثیت نہیں حاصل کی بلکہ کسی قدر کشمکش کے بعد وہ اساقفہ یا دنیاوی حکمرانوں کی اطاعت پر رضامند ہو گئے۔ بارھویں صدی کے اواخر اور تیرھویں صدی کے اوائل میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ پرانے شہر اس قسم کی آزادی کے لئے جد و جہد کر رہے تھے جو اطالوی شہروں کی حاصل کردہ آزادی کے مساوی ہو، خاص کر اسقفی شہر اپنے اساقفہ کے ساتھ اس جد و جہد میں سرگرم پیکار تھے کہ انہیں اپنے اوپر محصول لگانے، سکہ بنانے، محصول رہگزر قائم کرنے اور معدلت گستری کی شیرازہ بندی کا حق کامل دیدیا جائے کیونکہ کلیسائی و حرفتی اغراض کے درمیان ہمنوائی اب گئی گزری ہوئی بات ہو چکی تھی۔ (تیرھویں صدی کے نصف اول میں) شہنشاہ فریڈرک دوم کی مخالفت کی وجہ سے شہروں کے ارتقا میں عارضی طور پر روک پیدا ہو گئی تھی۔ تاہم شہروں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور آخر میں بوسیلۂ زر ویانہ بہت سے شہر شہنشاہی شہر بن گئے

یعنی ان پر شہنشاہ اور مجلس ملّی کے سوا اور کسی کی اطاعت واجب نہیں رہی تھی، البتہ خود مختاری میں یہ شہر اطالوی شہروں سے کم مرتبہ تھے کیونکہ مقدس رومانی شہنشاہی اگرچہ اتنی طاقت نہیں رکھتی تھی کہ جرمنی کو متحد کر دے پھر بھی آلپس کے جنوب کے بجائے شمال میں اسے زیادہ حقیقی حیثیت حاصل تھی۔

۲۔ اس سلسلۂ عمل کے مدارج پر ہمیں اب زیادہ غائر نظر ڈالنے کا موقع ملنا چاہئے جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں قدیم اسقفی شہروں نے اس معاملے میں اولیت وسبقت اختیار کی۔ کلیسا نے اگرچہ اپنے علاقوں کے مستاجروں اور کاشتکاروں پر آزادانہ اختیار (عدالتی) بہت ہی پہلے حاصل کر لیا تھا تاہم اوّل اوّل اسے آزاد زمینداروں، بادشاہ یا دوسرے دنیاوی امرا کے مستاجرین پر جو شہر میں رہتے تھے کسی قسم کا سیاسی اقتدار نہیں حاصل تھا، درحقیقت اولاً شہر کو کسی قسم کی سیاسی شیرازہ بندی حاصل نہیں تھی، مگر جب شہر ترقی کرنے لگے، اور ان کے باشندے اپنے اغراض، مفاد وطریق زندگانی میں خصوصیت سے شہری بن گئے تو اہل شہر کو اپنی ضرورت کے لئے خاص حقوق وامتیازات اور قانون وانصاف کے خاص انتظام (عملدرآمد) کا احساس ہونے لگا اور جب اکابر کلیسا کی اپنے امتیازات کو بڑھانے کی خواہش بھی اسکے ساتھ شامل ہوگئی تو یہ دو باتیں ملکر اس جانب منجر ہوئیں کہ اساقفہ کی سرگردہی میں شہروں کے اندر سیاسی توحد پیدا ہو جائے، اور اس پہلی ہی کارروائی میں شہروں کی حرفتی خصوصیت صاف نظر آنے لگی۔ جرمنی میں دسویں اور گیارھویں صدیوں میں (خاصکر جبکہ ۹۵۵ء میں آٹو اعظم نے اپنے فتحمند بازوؤں سے ہنگریوں کی غارتگرانہ یورشوں کو آخری طور پر روک دیا تو تجارت وسوداگری میں نمایاں ترقی ہوگئی۔ بڑے بڑے بازار (جس میں غیر ممالک کے لوگ آیا کرتے تھے) تمام حصص جرمنی میں قائم ہوگئے اور دولت وثروت میں ترقی کرنے لگے اور جرمانی تاجروں نے اپنے اولوالعزمانہ کاروبار کو انگلستان، اسپین، اور شرق بعید تک پہنچا دیا، اور ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب وتجارت کے پرامن مشاغل قدرتی طور پر شیر وشکر ہوگئے تھے اور یہ کہ بڑے بڑے کلیساؤں میں مقررہ طور پر آمد ورفت کی کثرت اور وہاں کی خاص خاص زیارتوں کی وجہ سے کلیسائی شہر بازاروں کے نشو ونما کے لئے طبعی مقامات بن گئے تھے۔ اس لئے جب تجارت کی سرپرستی کے لئے ان شہروں کو بادشاہوں کی طرف سے یہ خاص امتیاز اور یہ خاص "شاہی امن" کا حق عطا کیا گیا کہ بازار اور ان بازاروں کو جانے والے شر اور فساد سے محفوظ رہینگے، تو اگر بالکلیہ نہیں تو زیادہ تر انہیں شہروں میں

بازار قائم ہو گئے جہاں اساقفہ کے مستقر واقع تھے۔

پس اب عظیم الشان شہروں کا نظم و نسق اساقفہ کی حکمرانی کے باعث مضبوط ہو گیا تھا، اور اولاً اس کا میلان کسی قدر یہ ہوا کہ اس نے شہر کے ان باشندوں کو جو ابتداءً آزاد تھے ان لوگوں کی معاشری سطح تک پست کر دیا جو اصلاً اساقفہ کے حشم و خدم میں داخل تھے نتیجہ یہ ہوا کہ اساقفہ اور شہروں کے مقاصد میں تصادم پیدا ہو گیا اور اس کا اظہار اس وقت ہوا جب گیارھویں صدی کے آخر حصے میں کلیسا اور شہنشاہی کے درمیان اول مرتبہ تنازعۂ عظیم برپا ہوا اور ہنری چہارم کے حریف اساقفہ کے مقابلے میں شہر یکے بعد دیگرے ہنری کی جانبداری اختیار کرنے لگے، مگر جب شہروں کی خوشحالی و دولت میں ترقی ہونے لگی تو انھوں نے ایک بڑی حد تک حکومت خود اختیاری حاصل کر لی۔ اس ترقی دولت کی کیفیت یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ کولون میں جہاں ہنوز گیارھویں صدی کے آخر میں اسقف اعظم کی حکمرانی قائم تھی "چھ سو نہایت ہی دولتمند تاجر موجود تھے"۔ قدیم شہروں میں شہریوں کے نام سے اس حکومت خود اختیاری کا ذریعۂ کار تدریجاً صورت پذیر ہوا تھا، اس کا عنصر اصلیہ جوں کی وہ جماعت تھی (جسے شکابینی یا شیوفن کہتے تھے اور) جسے عدالتی فرائض مدت مدید سے حاصل تھے بلکہ عہد کارولنجی سے چلے آرہے تھے مگر اس میں اسی جماعت نے (بالعموم دوسرے سربرآوردہ شہریوں سے مل کر) بتدریج انتظامی اور ادنیٰ درجے کے تشریعی فرائض تک حاصل کر لئے تھے یہاں تک کہ آخر میں ایک زاید "برگو ماسٹر" (میر بلد) کی صدارت میں حکمران شہری مجلس قائم ہو گئی اور شہران "میران بلد" کے زیر حکومت قانون کے ہم مرتبہ مسلمہ رسم و رواج یا صریحی معاہدے کے ذریعے سے خریداری یا جنگ و جدل کے ذریعے سے جس قدر وہ اختیارات حاصل کرنے لگے تھیں اولاً اساقفہ یا والیان ملک کے عہدہ دار عمل میں لاتے تھے اسی قدر ان "میران بلد" کے انتظامی فرائض کی اہمیت بڑھتی گئی۔

یہ حکومت ابتداءً اور ایک طویل مدت تک "فطری عدیدیت" ہی رہی یعنی جو لوگ اسے عمل میں لاتے تھے ان کا انتخاب کسی طرح پر بھی ہوتا ہو مگر وہ سب کے سب زیادہ دولتمند باشندے ہوتے تھے۔ میرا خیال یہ ہے کہ ارکان کونسل بالعموم ایک برس کے لئے ہوتے تھے اور نکلنے والے ارکان اپنے قائم مقاموں کا تعین کر کے جاتے تھے

اور اس طرح حکومت عملاً ایک ایسے گروہ کے ہاتھ میں رہتی تھی جسے "سیناتی خاندانوں" کا گروہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں بالخصوص زیادہ پرانے شہروں کے معاملے میں یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ جو گروہ اس طرح جد و جہد کر کے خود مختاری تک پہنچا وہ اولاً اس حاویانہ طریق پر حرفتی نوعیت نہیں رکھتا تھا جیسا کہ بعد میں ہو گیا اس میں اولاً مبارزوا اور آزاد غیر فوجی شہری بھی داخل تھے، اور ایسی صورتیں بھی پیش آئیں جن میں ان مبارزوں کو بلدی حکومت کے اندر خاص نمائندگی حاصل ہو گئی، مگر اس میں شک نہیں کہ ایک دن وہ آیا کہ جاگیری عنصر نسبتہً اس قدر کمزور ہو گیا کہ اسے یا تو شہر کو چھوڑ دینا پڑا یا تجارتی عنصر میں جذب ہو جانا پڑا۔ پھر بھی اس طرح پر کامل الحقوق شہریوں کی جو جماعت پیدا ہو گئی اس کے لئے کچھ زمانے تک کامل شہریت کی شرط ضروری کے طور پر ایک خاص مالیت کی زمین پر قابض ہونا لازمی تھا، اور لیوبک و ہامبرگ کے سے جو شہر بعد میں قائم ہوئے جنہیں جاگیری عنصر اول ہی سے نہیں تھا ان میں بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ تاجر زمینداران کی ایک اس قسم کی عدیدیت بن گئی تھی۔ بہر حال جو کچھ بھی ہو، ہر صورت میں شہروں کی حکومت بہت جلد اہل شہر میں سے ایک مادی تجارتی گروہ قلیل کے ہاتوں میں آگئی، اور (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) حکومت ایک سال بسال مقرر کی ہوئی عدیدی مجلس کے ذریعہ سے عمل میں آنے لگی۔ اس مجلس نے اکثر پیچیدہ تشکلیں اختیار کر لیں، ابتدائی زمانے میں تو اس پیچیدگی کی وجہ وہ تصادم ہوا جو حکومت کا اجارہ لے لینے والے خاندانوں اور تجارتی طبقے کے دوسرے ارکان کے درمیان برپا ہو گیا تھا، اور بعض صورتوں میں یہ پیچیدگی کسی قدر اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ بعض فرائض حکومت کو تاجروں کی ایک رضاکارانہ انجمن نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، بعد میں اہل حرفہ کے ساتھ کشاکش کی وجہ سے پیچیدگی پڑی۔ مگر یہ امر قابل لحاظ ہے کہ شہروں کی تمام تاریخ میں جرمانی شہروں کی حکومت زیادہ تر مجالس ہی رہی تھی یعنی انتظام کا خاص ذریعہ مجلس یا مجالس کا نظم تھا، قدیم یونانی شہروں کی طرح دستور سیاسی نے اس طرز و روش کی طرف قدم نہیں بڑھائے کہ نظم و نسق شہریوں کی جمعیت عامہ کے ذریعہ سے انجام پاتا اور نہ قدیم یونانی یا ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی شہریوں کی طرح یہ شہر "مطلق العنان بادشاہوں" کے تحت میں آئے۔

یہ نہیں ہوا کہ آزاد شہریوں کی عام جماعت کی نسبت یہ خیال کر لیا جائے کہ وہ

حکومت کی شرکت سے کلیتہً خارج کردی گئی، لیکن مختلف مقامات میں ان کی شرکت کے مدارج میں بہت کچھ اختلاف تھا۔ جب نئے قوانین وضع ہوتے، یا معاہدات کئے جاتے، یا فوجی مہموں کے متعلق فیصلے ہوتے یا نئے محصول لگائے جاتے یا قرضے لئے جاتے یا اور اسی قسم کی ضرورتیں پیش آتیں تو ان وقتوں میں اکثر اسی جماعت کی طلبی ہوتی تھی مگر اس کے اجلاس کونسل کی صوابدید پر منحصر ہوتے تھے اور جس قدر زمانہ گزرتا گیا یہ اجلاس کمتر ہوتے گئے۔ علی العموم نہیں مگر کبھی کبھی عام جماعت ارکان کونسل کا انتخاب بھی کرتی تھی۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ معتد بہ حد تک حکومت خود مختاری کے حاصل ہو جانے کے بعد اپنے اوپر آپ حکومت کرنے والے شہروں کے ارتقا کی پہلی منزل میں حکومت کا علی العموم میلان عدیدیت کی طرف زیادہ ہو جاتا تھا، یہ میلان کچھ اس قسم کا ہوتا تھا جس کا مشاہدہ ہم یونان کی شہری سلطنتوں میں زمیندارانہ عدم مساوات کے ضمن میں کر چکے ہیں۔ صرف ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں یہ ہوا کہ عدیدیت حقیقتاً تجارتی عدیدیت ہو گئی اور ابھی اسے پوری طرح ترقی حاصل کئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ اسے عام اہل حرفہ سے دوچار ہونا پڑا، جنکی تنظیم ازمنۂ وسطیٰ کی اس مخصوص قسم کی انجمنوں میں ہوئی تھی جن کا بیان پچھلے خطبے میں ہو چکا ہے۔ جرمنی میں ان کے مختلف نام تھے، مثلاً کولون میں انھیں "برادری" (Fraternity) دسٹ فیلیا کے شہروں میں "انجمن" (Gild) اور بعض جگہ اتحاد (Union Innungen) کہتے تھے اور کہیں کہیں دوسرے نام بھی تھے سہولت واختصار کے خیال سے میں ان سب کو "جماعت حرفہ" (Crafts) کہونگا۔ زمانۂ جدید کی انجمن مزدوراں سے ان کی مشابہت نہایت ہی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، مگر مشابہت جیسی نمایاں ہے اختلاف بھی ویسا ہی عیاں ہے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی "جماعات حرفہ" اجرت پر مزدوری کرنے والوں کی انجمنیں نہیں تھیں بلکہ وہ مالکانہ کام کرنے والو بھی انجمنیں تھیں، جو خود اپنے لئے کام کرتے تھے اور شاگردوں سے اور کہیں مزدوروں سے بھی کام لیتے تھے مگر یہ مزدور اس حیثیت سے اس کے رکن نہیں بنائے جاتے تھے۔

۳۔ یہ موقع اس کے لئے موزوں معلوم ہوتا ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کی اس مخصوص اقتصادی ہئیت ترکیبی یعنی ان شہروں کے حرفتی عنصر کے انجمن اہل حرفہ اہل فن وغیرہ کی نمایاں تنظیم پر بحث کیجائے۔ یہ سب مشخصہ جماعتیں تھیں جنمیں اپنی حرفت کے

انضباط اور اپنے ارکان کی نگرانی پر کسی قدر اختیارات حاصل تھے۔ اس موقع پر میں مجبور ہوں کہ ایک مصنف (یعنی پروفیسر اشلی) کے نتائج سے اختلاف کر دں گا جن کا میں بہت کچھ زیر بار احسان ہوں۔ وہ بظاہر اس نظریے کو مسترد کرتے ہیں کہ انجمنہائے اہل حرفہ یعنی بعض مشترک اغراض کے لئے کسی خاص شہر کے کسی خاص حرفت میں مشغول رہنے والے تمام دستکاروں کی انجمنیں اپنی اصل وابتدا میں رومانی ہیں عہ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ دستکاروں کے کسی جداگانہ طبقے کی نشوونما سے یہ لازم آتا ہے کہ پہلے یہ فرض کر لیا جائے کہ حرفت کا ارتقا کسی قدر آخری منزل پر پہنچ چکا تھا اور یہ منزل انگلستان میں بارھویں صدی میں حاصل ہوئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ رومانی شہنشاہی کے آخری دور میں اہل حرفہ کی ایک تنظیم ایسی تھی جو بعد کے زمانے کی گلڈ (انجمن) سے کسی قدر مشابہ تھی، نیز یہ بھی ممکن ہے کہ گال میں دو ایک جگہ بعض حرفتی جماعت (شخصیات) پانچویں صدی سے بارھویں صدی تک برابر قائم رہی ہوں مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جابجا کے منفرد اہل حرفہ سے ممیز حرفتی طبقہ کا نشوونما بارھویں صدی تک ناممکن تھا، اور جو خیالات کہ حرفی انجمنوں پر حاوی تھے وہ انھیں تک مخصوص نہیں تھے بلکہ اس زمانے کی تمام نظم معاشرت میں مشترک تھے تو پھر تنظیم کے ان عناصر کی اہمیت بالکل ثانوی درجے کی ہو جاتی ہے جن کی نسبت رومانی حرفی جماعات (شخصیات) سے ماخوذ ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔

ہم سب اس امر سے اتفاق کرینگے کہ مسٹر اشلی کے ذہن میں انگریزی شہروں کا خیال مقدم تھا اور ان شہروں میں رومانی زمانے سے اس وقت تک اہل حرفہ کے تنظیمات مسلسل کا تسلسل وجود ہو نہیں سکتا تھا، اس میں قیل وقال کی گنجائش ہے مگر میرے خیال میں اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اس بنا پر رومانی حرفی شخصیات سے اخذ وحصول کی اہمیت دوسرے درجہ کی ہے بے سوچے سمجھے ہوئے ایک نتیجہ نکالنا ہے میرا خیال ہے کہ سیاسی تنظیمات کے ارتقا میں نقل وتقلید کو جو وسیع جگہ ملنا چاہیے مسٹر اشلی اسے نظر انداز کر جاتے ہیں، بیشک انگلستان ہی کی طرح برّاعظم میں بھی

عہ۔ اشلی: انگلستان کی معاشی تاریخ، کتاب اول، باب دوم فقرہ ۸۔

جن شہروں کا مبدا و آغاز ادھر حال کے زمانے میں ہوا ہے ان میں یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ حرفی (شخصیات) دور موخر کی رومانی شہنشاہی سے براہ راست ماخوذ ہو سکیں مگر پھر بھی یہ ہو سکتا تھا کہ جن قدیم تر شہروں میں حرفت کی یہ نظیم برابر مسلسل رہی ہو انھیں کی نقل و تقلید سے یہ حرفی جماعات بالواسطہ ماخوذ ہوں اور میرا خیال یہ ہے کہ اطالوی شہروں اور انگریزی یا جرمانی شہروں کی حرفتی ہئیت ترکیبی کی وسیع مشابہت اس نتیجے کو اغلب بنا دیتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اکثر صورتوں میں یہ ہئیت ترکیبی وقائع نگار کی توجہ کو بہت بعد کے زمانے تک اپنی طرف منعطف نہیں کرتی لیکن وینس میں ہم نویں صدی ہی میں یہ دیکھتے ہیں کہ فن تعمیر بحہ کاری وغیرہ کے ایسی زیادہ موثر حرفتوں کے جنھیں واقعی فنون کہہ سکتے ہیں آزادانہ کام کرنے والے اور دستکاری کے پست درجے کے کام کرنے والے (جو بالکلیہ آزاد بھی نہ تھے کیونکہ انھیں بعض سرکاری خدمتیں بلامعاوضہ انجام دینا پڑتی تھیں) دونوں کی تنظیم موجود تھی، کم از کم یہاں تو یہ ضرور تھا کہ یہ تنظیم ٹیوٹنی ماخذ سے نہیں لی گئی تھی اور اس کا رومانی ماخذ صاف واضح ہے۔ بعدازاں جب ہمیں دوسرے اطالوی شہروں کا علم ہوتا ہے اور ہم ان کی ہیئت ترکیبی کا مقابلہ کرتے ہیں تو ان میں ایسی یکسانیت پاتے ہیں جس سے ان کے ایک ہی ماخذ سے ہونے کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے، یہ یقینی ہے کہ اس کا ماخذ اہل لمبارڈی نہیں ہو سکتے جن کی نسبت یہ مسلم ہے کہ تمام ٹیوٹنی حملہ آوروں میں وہ سب سے زیادہ بربری تھے۔ لیکن اگر ہمیں اطالیہ میں رومانی ماخذ کو قبول کرنا پڑا تو پھر اطالوی اور ٹیوٹنی شہروں کی ہئیت ترکیبی میں جو وسیع مشابہت پائی جاتی ہے اس کی وجہ سے نہایت ہی اغلب ہو جاتا ہے کہ آخر الذکر کا ماخذ بھی ہو۔

یہاں چلتے چلتے یہ خیال بھی ظاہر کر دینا چاہیے کہ اس پر بحث کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ اطالوی شہروں پر عام نظر ڈالتے وقت یہ ضروری ہے کہ قدیم رومانی تمدن کے بلدیات کے ساتھ ان کے تعلق کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ ہمیں اپنے ذہن میں یہ خیال کر لینا چاہیے کہ قدیم تر تمدن کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے وہ زیادہ تر شہروں ہی میں باقی رہے تھے، اور اطالوی شہروں نے جب قوت و ثروت میں ترقی کی تو جاگیریت کے ساتھ جس عناد کا اظہار کیا اور بارھویں صدی میں رومانی قانون کے تجدید شدہ مطالعے کو جس جوش و خروش کے ساتھ قبول کیا، اس کی توجیہ بھی ہم کسی

حد تک اسی اتحاد و ماخذ سے کر سکتے ہیں۔

۴۔ بہر حال کوئی بھی صورت ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ انجمنیں اس سے بہت قبل ہی قائم تھیں جب انھیں اپنی اپنی تجارتوں میں کام کرنے والے اشخاص پر شخصیہ (مجموعی) اختیار باضابطہ طور پر عطا کیا گیا اور اس کی قانونی حیثیت تسلیم کی گئی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں انجمنیں بہت وسعت کے ساتھ قائم ہو چکی تھیں البتہ ان کا حلقۂ اثر نئے عطیات کے ذریعے سے وسیع ہوتا رہتا تھا۔ مگر ابھی اس وقت تک وہ بلدی حکام کے زیر نگرانی تھیں خود اپنے عہدہ داروں کے انتخاب کا پورا اختیار بھی ہر جگہ حاصل نہیں تھا، البتہ جہاں تک کہ قانوناً ان کا جواز تسلیم کر لیا گیا تھا انھیں اپنے جلسے کرنے، اپنی اپنی دستکاریوں کے لئے در آمد کے لئے قواعد مقرر کرنے، اور بسزائے تاوان ان کی پابندی کرانے کے اختیارات حاصل تھے۔

اس عمومیت اہل حرفہ کی نسبت ہمیں یہ سمجھنا چاہیئے کہ اس کا کچھ حصہ ان شہریوں پر مشتمل تھا جو نسلاً آزاد مگر بے زمین تھے، اور کچھ حصہ سرفوں یا کاشتکاران وابستہ اراضی پر مشتمل تھا جنھوں نے بتدریج اپنے کو غلامی کی حالت سے آزاد کر لیا تھا کیونکہ ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور میں مزدوروں (یعنی شہر کے مزدوروں) نے معاشرتی معیار میں جو منازل طے کئے اس میں انھیں دو مراحل سے گزرنا پڑا اول تو انھیں سرفیت یا زرعی وابستہ آراضی غلامی کے باقیات کو دفع کرنا پڑا اور اس سلسلۂ عمل کی شہادت ہمیں بارھویں صدی کے اوائل میں ملتی ہے اور اس کی انتہائی حد اس وقت پہونچی جب یہ اصول قائم ہو گیا کہ کوئی سرف یعنی غلام وابستہ آراضی جو ایک برس اور ایک دن شہر میں رہجائے وہ از خود آزاد ہو جائیگا۔ بعد ازاں جب شہری آزادی حاصل ہو گئی تو پھر مجموعی آزادی اور سیاسی اقتدار میں شرکت کی کشاکش کا وقت آیا۔ اول الذکر کا حصول پہلے ہوا، اہل حرفہ نے اکثر اپنی تنظیم و انضباط کی کامل آزادی اور اپنے حرفی مقاصد کے لئے جن آزادانہ انتظامات کی ضرورت تھی انھیں حاصل کر لیا تھا، مگر سیاسی اختیار میں شرکت زیادہ زمانے تک ملتوی ہوتی رہی۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں جس رکاوٹ کو رفع کرنا تھا وہ اگرچہ حسب و نسب کسطرح کوئی باضابطہ رکاوٹ نہیں تھی بلکہ پیشوں اور حیثیتوں کی حد بندیاں تھیں پھر بھی یہ کشمکش اپنی طوالت و استقامت کے اعتبار سے ہمیں روما کے پٹریشین اور پلیبین کی کشمکش کو یاد دلاتی ہے

میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ یہ ایک تجارتی عدیدیت تھی جو عمومیت اہل حرفہ سے برسرپیکار رہتی تھی۔ اس کشمکش کا آغاز تیرھویں صدی بلکہ بعض وقت بارھویں ہی صدی میں ہو گیا تھا مگر اسے مکمل کامیابی عام طور پر چودھویں صدی تک نہیں حاصل ہوئی میرا خیال ہے کہ یہ مرحلہ تمام ہی قدیم شہروں میں طے کرنا پڑا تھا، صرف بعد کے قائم شدہ چند شہروں میں ایسا ہوا کہ اہل حرفہ اول ہی سے پورے شہری ہو گئے تھے۔

اہل حرفہ کو سیاسی حقوق میں جو حصہ دیا گیا تھا وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے بہت ہی مختلف و گوناگون تھا، مثلاً یہ کہ اسٹراسبرگ میں ہم ۱۳۲۴ء اور ۱۴۰۲ء کے مابین سولہ مختلف دستور سیاسی کا شمار کر سکتے ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ جب اہل حرفہ فتح پاتے تو انھیں کسی نہ کسی صورت سے مجلس کے اختیار میں حصہ مل جاتا تھا، مگر یہ صورتیں مختلف ہوتی تھیں بعض وقت اہل حرفہ کی نسبت محض یہ اعلان ہو جاتا تھا کہ مجلس میں شریک ہونے کے مجاز ہیں۔ بعض وقت یہ ہوتا تھا کہ اہل حرفہ کے نمائندے ایک علحدہ طبقے کی صورت میں کبھی قدیم مجلس میں ہی بیٹھتے تھے، اور کبھی قدیم مجلس سے باہر نگرانی و اتحاد عمل کے بعض اختیارات کے ساتھ وہ ایک جدید آلۂ حکومت بنا تے تھے۔ اکثر یہ بھی ہوتا تھا کہ ایک یا زائد "برگو ماسٹر" (میر بلد) کے انتخاب پر ان کو اختیار حاصل ہوتا تھا اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) آخری درجہ یہ تھا کہ بعض شہروں میں انکو اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہو جاتی تھی شہر کا سیاسی دستور (مزدوروں کی) انجمنی اصول پر از سر نو مرتب ہو جاتا تھا، اور سوداگروں کی انجمنیں جہاں موجود ہوتی تھیں وہ جدید حرفتی انجمنوں کی سطح پر گر دی جاتی تھیں حکومتی اعتبار سے یہ ایک طرح پر اتحاد مزدوراں کی عہدیت ہو جاتی تھی، اور وہ اس طرح کہ ہر شہری انجمن تجارت کا ایک رکن ہو جاتا تھا اور پھر وہ انجمن شہری جماعت کی ایک سیاسی قسمت یا عنصر بن جاتی تھی۔ میں اس وقت جرمنی کا ذکر کر رہا ہوں مگر یہ یاد ہوگا کہ لندن میں بھی اڈورڈ سوم کے وقت سے ہر ایک شہری کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ کسی منظم تجارت کا جسے راز پنہاں (Mystery) کہتے تھے رکن ہو جائے۔

فی الجملہ یہ کہ قدیم شہریوں نے اپنے خاص سیاسی حقوق جو کچھ بھی محفوظ رکھے ہوں (اور متعدد اہم شہروں میں عدیدیت ہی کا غلبہ باقی رہا) پھر بھی ہر جگہ عام قاعدے کے

طور پر یہ امر مسلم ہوگیا تھا کہ شہریت ملک آراضی سے آزاد ہے اور یہ کہ شہریوں کے طبقے میں تاجر کی طرح اہل حرفہ بھی داخل تھے (لیکن اہل حرفہ سے مراد صرف مالکانہ کام کرنے والے لوگ تھے جو باقاعدہ شاگردی کی مدت ختم کرنے کے بعد اپنے طور پر کام کرتے تھے) یہ قابل لحاظ ہے کہ اس تحریک میں عدیدیت کی پشت پناہی انھیں شہروں میں ہوتی تھی جہاں غیر ملکی تجارت کو بہت وسعت حاصل تھی۔ اس کی طبعی وجہ یہ تھی کہ شہر کے مقدم کاروبار میں شہر کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کو غلبہ حاصل تھا، اور ان شہروں نے "ہسپانی لیگ" قائم کر کے جو طاقت وامتیازنہ حاصل کر لیا تھا اس سے اس پشت پناہی کو تقویت پہنچ گئی تھی۔ اہل حرفہ نے جب جنوب و وسط جرمنی میں تقریباً ہر جگہ تشبیبی رائٹن وسٹ فالیا اور شمال و مشرق کے بہت سے شہروں میں کامل سیاسی مساوات یا کم از کم یہ کہ حکومت میں شرکت حاصل کر لی تھی، اس وقت بھی وہ "ہسپانی لیگ" کے سربرآوردہ شہروں کی مجالس سے خارج ہی رہے۔ البتہ (یہاں بھی) بہ حیثیت شہری کے ان کی رکنیت تسلیم کی جاتی تھی اور اہل حرفہ کے صدر عہدہ دار ایک طرح کے ایوان شوریٰ کا کام دیتے تھے جسے شہر کی حکمراں مجلس وقتاً فوقتاً مشورے کے لئے طلب کرتی تھی، اور چودھویں صدی کے اختتام کے بعد ان شہروں میں مجالس کی شرکت کے لئے اہل حرفہ کی جدوجہد اکثر و بیشتر ناکام ہو گئی تھی۔

اس طرح دو مدارج ہمارے سامنے ہیں جو وسیع معنی میں یونان کے مدارج سے کے مماثل ہیں۔ اول یہ کہ جب شہروں نے مرفہ الحالی میں ترقی کی تو انھوں نے فطری عدیدیت کو چھوڑ کر شدید انتہائی عدیدیت کی طرف قدم بڑھائے جس کی وجہ عدم مساوات دولت تھی۔ اس کے بعد زیادہ عمومی دستور کی تحریک پیدا ہوئی۔ صرف ارسنہ وسطیٰ کے شہروں میں یہ ہوا کہ یہ عدیدیت سوداگروں کی عدیدیت رہی اور عامۃ الناس منضبط اہل حرفہ کی ایک جماعت بنے رہے۔ مزید براں جابجا ہم یہ بھی دیکھیں گے کہ اس تخصیص میں جرمانی شہروں کا ارتقا یونانی شہروں کے ارتقا کے مثل ہے کہ ان میں بھی کوئی ایسی شئے نمایاں نظر آتی ہے جو قدیم زمانہ کے خودسر حکمرانوں کے مشابہ کہی جاسکتی ہے تا آنکہ جب اہل حرفہ میں سیاسی تحریک کا آغاز ہوا تو وہ سیاسی حقوق کے لئے آزاد جنگجویوں کی حیثیت سے نمایاں نہیں ہوئے بلکہ زیادہ تر کلیسائی یا بنیادی امر کے

قدیم شہریوں کے ساتھ کشمکش میں ان لوگوں نے ان امرا کے معاون کی حیثیت اختیار کرلی۔
چنانچہ تیرھویں صدی میں کولون میں ایک اسقف اعظم نے اہل حرفہ کو سرکاری عہدے
اس خیال سے دیدئے کہ یہ لوگ اس کے لئے کارآمد آلے کا کام دیں گے۔ لیکن پھر بھی یہ
جرمانی ارتقا میں ایک طرح کا جزدی، ہنگامی اور عارضی واقعہ ہے جسے ضرورت سے زیادہ
اہمیت نہ دینا چاہئے، اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں جرمانی شہروں کی یہ ایک قابل لحاظ
خصوصیت ہے کہ جب انھوں نے خود کو بیشتر جاگیری امرا سے آزاد کرلیا
اور شہنشاہی شہر بن گئے تو پھر وہ برضائے خود کسی وقت بھی کسی ایک شخص کی حکومت
میں نہ آئے جیسا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی شہروں سے اکثر ظہور میں آتا رہا۔ نہ وہ کسی
مطلق العنان کے پنجۂ غصب میں پھنسے جیسا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی اور قدیم زمانے
کے یونانی شہروں میں واقع ہوا۔ میرا گمان یہ ہے کہ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ ان کی
خود مختاری کم مکمل تھی، اور اس لئے ان کی ہستی میں خارجی جنگ کی حیثیت گھٹی ہوئی
تھی اور کچھ یہ وجہ تھی کہ ان کی حرفتی خصوصیت زیادہ خالص تھی۔ اطالوی شہروں کی
طرح ان پر قلعہ بند قصروں میں رہنے والے شورش پسند امرا کی بلا بھی نہیں مسلط تھی،
شورش پسند امرا اپنے قزاقانہ قصروں میں شہر سے باہر رہتے تھے، اور جو بہادر
شہروں کے اندر تھے انھیں پر امن تاجر بنا لینے میں کامیابی ہو گئی تھی۔

۵۔ ان شہروں میں سے ایک بہت بڑی تعداد نے (جو تعداد میں اکاون
تک پہنچ گئے تھے) اٹھارھویں صدی کے اختتام تک جرمنی کے "آزاد شہنشاہی بلاد" کی حیثیت سے
ان وسیع تر سلطنتوں کے اندر جو اپنے کمزور ارتباط سے "مقدس رومانی شہنشاہی" کا
نام زندہ کئے ہوئے تھے بہت بڑی حد تک اپنی خود مختاری کو برقرار رکھا مگر اب ان
شہروں کی سیاسی زندگی کی نبض زور کے ساتھ نہیں چلتی تھی۔ یہ ضرور تھا کہ ان شہروں
میں اس قسم کے کسی میلان کا اظہار نہیں ہوتا تھا کہ وہ مطلق العنان حکمرانی کے تحت
میں آجائیں گے، تاہم یہ بھی قابل لحاظ ہے کہ پندرھویں صدی سے عمومی تحریک
کا خاتمہ ہوگیا تھا، صرف "اصلاح" کے دور میں تھوڑی دیر کے لئے اس کی تجدید ہوگئی
مگر اس کے بعد ہی سخت ردعمل پیدا ہوگیا، جہاں تک سیاسی تغیر کا پتہ چلتا ہے یہی
معلوم ہوتا ہے کہ اس کا میلان برابر عدیدیت کی جانب رہا ہے جنگ سی سالہ کی

تباہی کے بعد (جسنے جرمانی شہروں کی خوشحالی کو بری طرح پست کردیا) حکمران مجلس کے عام باشندوں کے نمائندہ وجوابدہ ہونے کا خیال تقریباً مردہ ہوچکا تھا۔ شہریوں کی عام جمعیت کا طلب کیا جانا بالکل ہی بند ہوگیا اور ارکان مجلس کے تقرر پر معمولی شہریوں کا اثر قریب قریب زائل ہوگیا۔ میں ابھی یہ دکھا چکا ہوں کہ "ہمسیائی لیگ" کے شہریوں نے عدیدیت کے لئے پختہ تیار کردیا تھا کیونکہ اس معاقدے نے پندرھویں صدی کے اوائل میں یہ روش اختیار کرلی تھی کہ معاقدے میں جو شہر شامل ہیں اگر ان میں سے کسی شہر میں انقلابی تحریکات رونما ہوں تو ان تحریکات کو اس ہیبتناک سزا سے روکا جائے کہ ان شہروں کو "معاقدے" کے بازاروں سے خارج کردیا جائے۔ اس کے بعد زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ ردعمل ان دوسرے شہروں پر بھی مسلط ہوگیا جن میں اہل حرفہ نے اس سے پہلے حکومت کے اندر قدم جما لیئے تھے۔ انتخاب کے بجائے تقرر باہمی کا طریقہ اختیار کیا گیا، یا انتخاب محض ایک رسم رہ گیا۔ مجلس کی رکنیت عملاً دائمی ہوگئی۔ یا چند محدود خاندانوں کے ارکان کے اندر ہی اندر کبھی اِدھر کبھی اُدھر ہوتی رہی۔ اسکا سبب کچھ تو شاہی خیالات کا وہ مرض متعدی تھا جو قرب وجوار کی ملکی سلطنتوں میں پھیلا ہوا تھا، وہ خیال یہ تھا کہ عامۃ الناس خود اپنے اوپر حکومت کرنے والے شہری ہونے کے بجائے فطرتاً "رعایا" ہیں۔ اس خیال نے دیہات سے چلکر شہروں پر حملہ کردیا تھا فرق صرف اتنا تھا کہ شہروں میں یہ عامۃ الناس بادشاہ کی رعایا ہونے کے بجائے کسی مجلس کی رعایا ہو جاتے تھے لیکن اس عدیدی تغیر کا سبب کسی قدر یہ بھی تھا کہ جو انجمنیں عمومیت کی لڑائیاں سر کر رہی تھیں ان کے طبایع میں بتدریج فرق عظیم پیدا ہوگیا تھا۔ انگلستان کے بلدی ارتقا کی خصوصیت کی حیثیت سے جس امر پر ہم نے نظر ڈالی ہے یہ تغیر اسی کے مثل تھا۔ ان انجمنوں نے جب اول اول اپنا انضباط قائم کیا تو یہ انضباط اس احساس وادراک کے ساتھ ہوا کہ وہ اپنی مجتمعہ (مشخصہ) حیثیت میں ایک عام فرض کو پورا کریں گی اور یہ قاعدہ کہ کسی خاص تجارت کے ہر ایک آزاد کام کرنے والے کو کسی گلڈ (انجمن تجار) سے تعلق رکھنا چاہیئے، اس کا قیام کسی قدر اسی وجہ سے ہوا کہ یہ فرض عامہ مناسب وموزوں طریقے سے انجام پائے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس قاعدے میں ایک خود غرضانہ مقصد یہ بھی تھا کہ تکلیف دہ مقابلہ کو روکا جائے،

یہ گلڈ (انجمن تجار) اگرچہ عموماً ان مالکانہ کام کرنے والوں کے لئے محدود تھی جنھوں نے ایک خاص مدت شاگردی میں گزاری ہو، مگر مالکوں کے مقابلے میں نوکروں کا تناسب کم تھا، عام طور پر صرف تھوڑے سے سرمائے کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے کسی قابل وموزوں تربیت یافتہ کام کرنے والے کے راستے میں کوئی شدید رکاوٹ حائل نہیں تھی، مگر بازاروں کی کامیابی و وسعت کا میلان بتدریج یہ ہوا کہ اس نے گلڈ کو عملاً مزدوروں کی آزاد انجمن ہونے کے بجائے سرمایہ داروں کے لئے نفع رساں اور کم وبیش محدود اجارات کی صورت میں بدل دیا۔ ارکان کے بیٹے اور داماد آسانی سے داخل ہو جاتے تھے۔ باہر والوں کے لئے مختلف طریقوں سے داخلہ مشکل بنادیا گیا تھا، انھیں روپیہ ادا کرنا پڑتا، کوئی گراں پایہ استادانہ کام بنانا پڑتا، اور اپنے ابتدائی داخلے کے وقت شاندار دعوتیں دینا پڑتی تھیں، اور یہ ظاہر کرنا پڑتا تھا کہ ان کے پاس سرمایہ یا مکان موجود ہے، وہ ناجائز اولاد یا کسانوں کے بیٹے نہیں ہیں اور بھی اسی قسم کی بہت سی باتیں تھیں۔ اس طرح گلڈ سے باہر مزدوروں کی تعداد مالکوں کی تعداد کے تناسب سے بہت سرعت کے ساتھ بڑھنے لگی۔ اور انھوں نے اپنی خاص برادریاں بنانا شروع کردیں۔ طبقۂ چہارم نے اپنے کو منضبط کرنا شروع کر دیا۔ مگر ابھی اسے اتنی قوت نہیں حاصل ہوئی تھی کہ وہ عمومی تحریک کو اور آگے بڑھاتا۔

پس اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مجلس تجار جب اس طرح پر مزدوروں کی مخالفت میں سرمائے کی نمایندگی کرنے لگی، تو ان کا اندرونی دستور عملاً زیادہ عدیدی ہوگیا اور ان کی حکومت روز بروز زیادہ دولتمند اقلیت کے ہاتھوں میں آتی گئی اور اسطرح شہروں کی تمام سیاسی ہئیت ترکیبی پر ذی امتیاز حرفتی طبقوں کی ایک طرح کی متحد جماعت حکمراں بنگئی۔ اور یہ جماعت جدید خیالات وضروریات کی اسی قدر مخالف تھی جس قدر گرد ونواح کا ذی امتیاز طبقۂ زمینداران خیالات وضروریات کا مخالف تھا، اور اس کے ساتھ ہی زمینداروں ہی کی طرح ان کی نسبت بھی یہ یقین ہو گیا تھا کہ جب قوم (یعنی جزو اکثر) میں عمومی تحریک کی تجدید ہو گی تو زمینداروں کے ساتھ ساتھ یہ بھی غائب ہو جائیں گے۔

خطبۂ ہشتدہم

بلاد ازمنۂ وسطی۔ بلاد اطالوی: لمبارڈی

میں نے اپنے آخری خطبے میں مختصراً شہروں کے اس نشو و نما کا ذکر کیا ہے جسے میں اس ملک میں ازمنۂ وسطے کی شہری جماعت کا خالص نمونہ سمجھتا ہوں جس ملک میں یہ خالص نمونہ خودمختاری کے اس انتہائی درجے پر پہنچ گیا تھا جو اسے مغربی یورپ میں حاصل ہوئی وہ ملک جرمنی ہے یا زیادہ قطعیت کے ساتھ یہ کہنا چاہیے کہ یہ شہنشاہی کے وہ اقطاع ملک تھے جو کہستان آلپس سے شمال میں واقع تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، شمال آلپس کے دوسرے ممالک میں مرکزی حکومت کی ترقی نے شہروں کی حکومت خود اختیاری اور انکی جزوی خودمختاری کو پست کر دیا تھا، دوسری طرف اطالیہ میں جس کی جانب ہم اب متوجہ ہوتے ہیں وہاں شہروں کی بیّن صنعتی خصوصیت نسبتاً کم واضح تھی اور (خوبی یہ ہے کہ) یہی وہ امر ہے جو ان کی نشو و نما کے متعلق مزید دلچسپی کا باعث ہے۔ وہ امر یہ ہے کہ شمالی اطالیہ کے وسیع حصص میں انھیں جاگیریت پر غلبہ حاصل ہو گیا تھا، ہم دیکھ چکے ہیں کہ جن شہروں میں جاگیریت کو کامل نشو و نما حاصل ہو گیا تھا وہاں ہر شہر کی آزادی خود اسی ضلع کے جاگیری یا کلیسائی سردار سے حاصل ہوئی تھی۔ اس اصول کا ذریعہ زور و جنگ یا خریداری، یا تدریجی قبضۂ ناجائز یا آزادانہ عطیہ جو کچھ بھی رہا ہو۔ آزادانہ عطیہ اس وقت میسر آتا تھا جب جاگیری سردار کو پوری طرح یہ یقین ہو جاتا تھا کہ اس کی اراضی کے اندر ترقی پذیر تجارت اور آبادی سے معاشی نفع ہو گا۔ اکثر صورتوں میں جاگیری یا کلیسائی سردار شہر پر اپنی سیادت قائم رکھتا تھا، اور جرمنی کی طرح جہاں آزاد شہنشاہی شہر، شہنشاہ کے

سوا اور کسی کی سیاسی فوقیت نہیں تسلیم کرتے تھے (اور تیرھویں صدی کے وسط کے بعد سے شہنشاہ کا یہ اقتدار محض ایک سایہ رہ گیا تھا) ان شہروں تک کے عین قرب وجوار میں زبردست وخطرناک جاگیری امرا بدستور موجود تھے مگر اطالیہ میں جہاں شہروں کو غلبہ حاصل ہوگیا تھا، وہاں ان شہروں نے نہ صرف قرب وجوار کے جاگیری امرا کو اپنے زیر اقتدار کرلیا تھا بلکہ انھوں نے ایک قدم اور آگے بڑھا دیا تھا اور ان امرا کو شہر کے اندر لاکر شہری امرا کی حیثیت میں بدل دیا تھا تاہم بہ حیثیت مجموعی اور عام اعتبار سے ان حالات میں بھی اقتصادی ومعاشری نظام کے لحاظ سے اطالوی شہروں کی غالب حیثیت صنعتی حیثیت ہی سمجھنا چاہئے یہاں بھی کامل شہری وہی شخص تھا جو صنعت وحرفت کے کام میں مشغول ہو۔ اور جب عمومیت کی تحریک شروع ہوئی اس وقت جو بلاد ارتقائے کامل سے لطف اندوز تھے ان شہروں میں جرمانی شہروں کی طرح وہاں کے جن عامۃ الناس نے حصول اختیار کے لئے کشاکش شروع کی وہ بھی منظم اہل تجارت یا اہل حرفہ ہی پر مشتمل تھے یعنی یہ لوگ اہل حرفہ (asti) اور دستکار (mestieri) تھے۔ علاوہ ازیں (جیسا کہ فری مین نے کہا ہے) یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ جاگیرداروں کو مجبور کرکے شہری زندگی میں شامل کرنے کی کارروائی کبھی بھی اس ملک کے تمام عرض وطول میں عمل میں نہیں آئی شمال ومغربی حصے میں طاقتور جاگیری والیان ملک پیڈمنٹ، مونٹ فیراٹ اور سالو تنزد میں بدستور حکمرانی کرتے رہے۔ ان کے علاوہ اور جگہوں میں بھی ان سے کم رتبے کے جاگیری سردار متعدد قلعوں میں اپنی وحشت انگیز خودمختاری کو قائم کئے ہوئے تھے مختصراً یہ کہ چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا گروہ جس نے برائے نام اپنا حق حکمرانی شہنشاہ سے حاصل کر رکھا تھا، اور جو نہ کسی شہر کے شہری تھے نہ اس کے خودسر حکمراں وہ زیادہ تر ناقابل گزر اکناف واطراف میں بھگا دئے گئے تھے مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ انھیں بالکلیہ بیخ وبن سے اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہو[علہ]۔

ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کو قدیم وجدید نظمائے سلطنت کے مشابہات کے جامع ہونے کی مختص خصوصیت اسی وجہ سے حاصل ہوئی کہ وہ اس معاشرے سے بالکل متضاد تھے

علہ مضامین تاریخی سلسلۂ دوم۔ یونان قدیم واطالیہ ازمنۂ متوسطہ۔

جن سے وہ گھرے ہوئے تھے، اور جن سے ان کی کم وبیش ٹکر ہوتی رہتی تھی۔ وہ یونانی اطالوی تمدن کے قدیم شہری سلطنتوں سے اس اعتبار سے مشابہت رکھتے ہیں کہ وہ شہری جماعتوں پر مشتمل تھے، اور تمدن جدید کی ملکی سلطنتوں کے وہ اس وجہ سے شریک تھے کہ ان میں صنعت و حرفت کو غلبہ حاصل تھا۔ عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ ازمنۂ وسطی کی بادشاہی کا وہ بیشتر حصہ جو آہستہ آہستہ قوم جدید کے مربوط نظم و ترتیب کی طرف قدم بڑھانے میں کوشاں تھا اس میں قومی زمیندارانہ طبقہ اب بھی حاوی و غالب تھا مگر چونکہ ان کا طرز زندگی شہری نہیں بلکہ زیادہ تر دیہاتی تھا اس لئے جب وہ شہروں کی رکنیت میں شامل کر لیئے جاتے اور اس میں انہیں بلند درجہ حاصل ہو جاتا اس وقت بھی شہروں کی حاوی خصوصیت انکے اثر سے صورت پذیر نہیں ہوتی تھی، مغربی یورپ میں جہاں کہیں بھی ہم ازمنۂ وسطی کے شہروں کی جانچ کرتے ہیں ہر جگہ شہر و دیہات کا یہ تضاد اور شہر کی حاوی فرضی خصوصیت حقیقتاً ایک ہی پائی جاتی ہے مثلاً اسکاٹ کی کتاب فیر میڈ آف پرتھ (Fair maid of perth) میں بمقام پرتھ ہم اس خصوصیت کو ایسے ہی نمایاں طور پر دیکھتے ہیں جیسے کسی جرمانی یا اطالوی قصبے میں دیکھتے۔

۲۔ قبل اس کے کہ ہم اطالوی شہروں کی نشوونما کی مختلف صورتوں پر غور کریں یہ بہتر ہوگا کہ چند لمحے اس وسیع تر تنظیم کی تاریخ پر نظر ڈالنے میں صرف کریں جس تنظیم میں یہ شہر بمنزلہ اجزائے ترکیبی کے تھے، کیونکہ اس تاریخ کی خصوصیت صرف یہی نہیں ہے کہ اس سے ان شہروں کو آزادانہ نشوونما کے خاص مواقع حاصل ہو جاتے تھے بلکہ یہی خصوصیت باعث تھی ان متباین حالات کی جن کے تحت میں ہمیں مختلف شہر اور شہروں کے اجتماعات نظر آتے ہیں۔

میں ایک سابق خطبے میں زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بیان کر چکا ہوں کہ یہ واقعہ ابتدائی ازمنۂ وسطی کی تاریخ کا ایک کلیۂ خاص ہے کہ جب قدیم شہنشاہی شکست ہو گئی تو کلیسا اپنی جگہ بر قائم رہا۔ بربریوں نے اپنی مفتوحہ متمدن دنیا میں جس کلیسائی جماعت کو پایا اس میں ایک طرح کا ارتباط اور حقیقی طاقت موجود تھی جس سے بالطبع اس جماعت کے حکمرانوں کو اس جدید دنیاوی نظم و ترتیب میں (جو ابتری و پریشانی سے بتدریج رونما ہوئی تھی) اعلیٰ منزلت حاصل ہو گئی مشرق میں رومانی شہنشاہی کا جو حصہ اب تک

باقی رہ گیا تھا، اس سے اور اطالیہ کے تعلق میں چونکہ ایک خاص بعد ہو گیا تھا، اس وجہ سے اس خصوصیت کا اظہار اطالیہ میں ایک خاص طریقہ سے ہوا۔ آلپس کی دوسری جانب رومانی شہنشاہی سے جو کچھ ایک مرتبہ لے لیا گیا، اس کا کوئی جزو بھی پھر کبھی واپس نہ ہوا مگر اطالیہ میں صورت حال کچھ اور ہی تھی جسٹینین نے چھٹی صدی میں اطالیہ کو شہنشاہی اقتدار میں واپس لے لیا تھا اور اگرچہ کل سرزمین اطالیہ صرف (۵۵۳ء سے ۵۶۸ء تک) پندرہ برس تک شہنشاہی اقتدار کے ماتحت رہی اور پھر شمال میں بادشاہی اور مزید جنوب میں لمبارڈی کی ڈیوکیوں کے قائم ہو جانے سے اس کا بڑا حصہ دوبارہ نکل گیا تاہم ملک کے اہم حصص حقیقتاً یا برائے نام قسطنطنیہ کے شہنشاہ کے تابع رہے۔

اور یہاں میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اطالیہ کا وہ مرکزی حصہ جس سے اہم تاریخ جدیدہ میں ریاستہائے کلیسا کے نام سے مانوس ہیں، اس کی اہم خصوصیت کو مد نظر رکھنا چاہئے۔ ہم زیادہ تر اس امر کے عادی ہیں کہ اس سلطنت کی تکوین کو پاپاؤں کی دنیاوی آز و حرص سے منسوب کریں اور اس میں شک نہیں کہ اس معاملے میں دنیاوی آز و حرص کا کچھ نہ کچھ دخل ضرور رہا لیکن تاریخی حیثیت سے اس کی نسبت یہ سمجھنا زیادہ سودمند ہے (اور واقعتاً تھا بھی ایسا ہی) کہ یہ ایک ایسی سلطنت تھی جس کا بیشتر حصہ کسی مدت مدید کے لئے کبھی بھی شہنشاہی سے جدا نہیں ہوا تھا، یہاں تک کہ پوپ اور چارلس اعظم کے مابین وفاق اکبر ہو جانے سے اس سلطنت نے پادریوں کی خواہش سے خود کو نئی شہنشاہی میں شامل کر لیا اپنی ابتدائی حالت میں یہ سلطنت دو حصوں پر مشتمل تھی ایک تو شمال مشرقی حصہ تھا جس پر قدیم شہنشاہی کا نائب السلطنت (Exarch) راوینا میں بیٹھکر حکومت کرتا تھا، دوسرا حصہ رومانی ڈچی تھا جو کہ لمبارڈون کے خلاف جد و جہد میں چھٹی صدی کے ختم ہونے کے قبل ہی پوپ کی سرکردگی میں عملاً آزاد ہو گیا تھا اور یہ مقصد زیادہ تر اس نہایت ہی قابل راہب کی مدبری و مستعدی سے ظہور میں آیا جو ۵۹۰ء میں گریگوری اول کے نام سے پوپ ہوا اگرچہ چھٹی صدی کے ختم ہونے کے بعد روما کا ایک ڈیوک بدستور ہوا کرتا تھا لیکن روما کے گرد اگرد جو علاقہ بربری حملہ آوروں کی دستبرد سے آزاد رہ گیا اس کے مذہبی و دنیاوی دونوں اغراض کے لئے فی الواقع پوپ ہی باثر سرگروہ تھا، بلکہ جب آریوس کی پیروی کرنے والے اہل لمبارڈی قدیم مذہب میں داخل ہو گئے تو لمبارڈی کی

بادشاہی تک میں پوپ کے اثر کو اہمیت حاصل ہو گئی لیکن روما کی ڈچی اگرچہ نیم خودمختار ہو گئی تھی تاہم اس نے قدیم نظم سے اپنا تعلق فوراً ہی منقطع نہیں کر لیا بلکہ آٹھویں صدی کے نصف اول میں جب وثن پرستی (صورتی پوجا) کے مسئلہ پر مغربی و مشرقی کلیساؤں میں مذہبی مخاصمت برپا ہوئی اس وقت بھی اگر شہنشاہ قسطنطنیہ میں اس کے تحفظ کی قابلیت موجود ہوتی تو شاید یہ حصہ اس مخاصمت کے باوجود بھی شہنشاہی سے منقطع نہ ہوتا۔ بہر نوع جب تک لمبارڈ دان نے ۷۵۱ء میں راوینا اور اس حصۂ ملک کو فتح نہ کر لیا جس پر راوینا سے حکمرانی ہوتی تھی اس وقت تک پوپ نے (۷۵۴ء میں) پپن کو شریف رومن پیٹریسیین (Patricius romanorum) کا خطاب دیکر فرنگی بادشاہوں سے اتحاد نہیں کیا، پپن نے اس خطاب کے عوض میں راوینا کے صوبے کو جو چار برس تک لمبارڈ دن کے قبضے میں رہ چکا تھا دوبارہ فتح کر کے پوپ کی نذر کر دیا چارلس اعظم نے جب لمبارڈی کی بادشاہی کو ۷۷۴ء میں فتح کیا تو اس نذر کی اس نے بھی تصدیق کی لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ان نذروں کے بعد ہی پاپاؤں نے فوراً ہی شہنشاہی سے باضابطہ قطع تعلق نہیں کر لیا چنانچہ ۷۸۱ء تک پوپ نے رومانی شہنشاہوں کے سنہائے جلوس کا تاریخ کے طور پر استعمال کرنا ترک نہیں کیا تھا، اس کے بعد ایک مختصر وقفہ تک روما نے کسی کو شہنشاہ نہیں تسلیم کیا مگر یہ صورت کلیسا کو ایک غیر طبعی حالت معلوم ہوئی۔ اسے تنہا رہنے کی کوئی خواہش نہیں تھی، اور اسی لئے اس نے ۸۰۰ء میں فرنگی شاہ اعظم کے واقعی یا مصنوعی اکراہ کے باوجود اسے مغربی عالم عیسوی کے لئے دنیاوی سرگروہ کا باضابطہ لقب دیدیا اور اس کے تحت میں خود کلیسا، قدیم شہنشاہی ممالک پر ایک طرح کی نیم دنیاوی حکمرانی کرنے لگا اور راوینا کے قدیم صوبے اور روما کی ڈچی کو ایک تنگ قطعہ ارض سے ملا دیا اور اس طرح شمالی اطالیہ کو جنوبی اطالیہ سے الگ کر دیا۔

ٹیوٹن حملہ آوروں نے جب اطالیہ پر حملہ کیا اور انکے خلاف متمدن اطالیہ کی جد و جہد کی سرگروہی اسقف روما نے اختیار کی اسی کا یہ طبعی نتیجہ اور اسی کا یہ اعتراف ہے کہ اس قطعۂ ارض پر پاپائی حکمرانی قائم ہو گئی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری تحقیقات کے مقاصد کے لئے اطالیہ دو حصوں میں منقسم ہو گئی۔ درحقیقت یہ تنصیف چھٹی صدی میں لمبارڈ دن کے حملہ کے وقت واقع عمل میں آ گئی تھی کیونکہ اگرچہ لمبارڈوں کے حملہ کا سیلاب ان وسطی

مگر ڈوں کی کامیاب مدافعت کی رو سے گزرتا ہوا، انتہائی جنوب تک پہنچ گیا تھا تاہم اس رو کا اثر یہ ہوا کہ جنوب کی ڈچیاں یعنی اسپالتو اور بنیونٹو کے لمبارڈ شمال کی بادشاہی کے لمبارڈوں سے جدا ہو گئیں بعد ازاں جب پاپائیت نے نئی شہنشاہی سے اتحاد و اتفاق کر لیا، اور قدیم رومانی ڈچی کے ساتھ ہی ساتھ راوینا کے دوبارہ فتح شدہ صوبہ کو بھی حاصل کر لیا تو اس طرح اس نے خود کو قدیم شہنشاہی کے ان دوسرے اجزا سے الگ کر لیا جو لمبارڈ مملکت میں شامل ہونے سے آزاد رہ گئے تھے اور یہ نکتہ ہمارے لئے اہم ہے یہی وجہ ہوئی کہ جنوب مغرب میں گیتہ، نیپلز اور امالفی کے بلدیات جنھوں نے حملہ آوروں کی کشاکش میں اپنی کامیابی سے ایک طرح کی نیم خود مختاری حاصل کر لی تھی، انھوں نے اس خود مختاری کو قدیم مشرقی شہنشاہی کے برائے نام اجزا کی حیثیت سے ترقی دی اور لمبارڈی کے بلدیات کی طرح سے جدید مغربی شہنشاہی کا جزو بنکر ترقی نہیں کی۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ شمالی اطالیہ کے بلدیات کے بہ نسبت انھوں نے بہت جلد اپنی خود مختاری میں ترقی کر لی، اور قدیم شہنشاہی کے انتظامی نظم کے مطابق نشو و نما حاصل کرتے رہے، مغربی عالم عیسوی میں بربریوں کے فتوحات سے عام طور پر جو سیاسی حالات پیدا ہو گئے تھے، ان کا کوئی اثر ان بلدیات پر نہیں پڑا۔

ان بلدیات کی مثال سے بلا شک و شبہہ جو تحریک حاصل ہوئی اس کی وجہ سے ان بلدیات کی ابتدائی آزادی کو اہمیت حاصل ہو گئی ہے مگر ان کی تاریخ کا علم ہمیں بہت کم ہے۔ لیکن قدیم رومانی کے اجزا میں ایک بہت زیادہ اہم شہر وینس بھی تھا جس نے قدیم مشرقی شہنشاہی سے اپنا برائے نام تعلق رکھا اور کسی وقت بھی فرنگی حکومت کے تحت میں نہیں آیا۔ اور وینس کی بے نظیر تاریخ اور شمالی اطالیہ کی عام سیاسی تحریک سے کئی صدیوں تک اس کے کلیۃً جدا رہنے کو زیادہ تر اسی واقعہ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔ [۱]

---

[۱] ۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں میں وینس ہی وہ شہر ہے جس نے جاگیریت کے حیطۂ اثر سے باہر کامل و غیر منقطع خود مختاری کے ساتھ ترقی حاصل کی اور بربری فاتحوں کا کسی طرح کا امتزاج اس میں نہیں ہوا شمال مشرق اطالیہ کے شہروں کے بناہ گیر جو حملوں کی وجہ سے وقتاً فوقتاً بھاگتے رہتے تھے وہ آباد

۳- یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ اگر وینس لمبارڈوں کی حکمرانی کے تحت میں آ بھی جاتا تب بھی اس کی آزادانہ نشوونما اور اس کی تجارتی حوصلہ مندی و طاقت اندرونی شہروں کی بہ نسبت غالباً جلد تر شروع ہو جاتی کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ وینس کے تجارتی رقیب جنوا اور پیزا کی حالت میں بھی یہی ہوا لمبارڈ قوم چونکہ سمندر سے ناآشنا تھی، اس لئے اسے ضرورت تھی کہ اس کی بحری تجارت کوئی دوسرا انجام دے جنوا جو شمال مغربی اطالیہ کے کونے میں پہاڑوں اور سمندروں کے درمیان واقع تھا اسے واقعی ایک مدت دراز تک لمبارڈ فتح نہ کر سکے اور فتح ہونے کے بعد بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے ایک طرح کی نیم خودمختاری حاصل رہی۔ خارجی تعلقات کے معاملے میں پیزا کی خودمختاری کا آغاز کس وقت سے ہوا اس کی نسبت ہم کچھ کہہ نہیں سکتے مگر ہم یہ سنتے ہیں کہ دسویں صدی کے وسط سے وہ مسلمانوں سے بحری لڑائیاں لڑنے لگا تھا، اور گیارھویں صدی کے اوائل میں جنوا کے ہمراہ ہو کر جزیرۂ سارڈینیا کے فتح کرنے کا حوصلہ مندانہ تہیہ کر لیا تھا اور اس اولوالعزمی کی وسعت کو دیکھتے ہوئے اس کی کامیابی کے ساتھ عمل میں آنے سے ہم معقول طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس سے قبل اس کی نیم خودمختاری کا ایک کافی وسیع دور گزر چکا تھا۔

بقیۂ حاشیہ صفحۂ گزشتہ: ہونے کے لئے بتدریج انھیں جھیلوں میں پہنچتے رہے اول اول تو وہاں محض عارضی قیام کرتے اور جب حملہ کا زور کم ہو جاتا تو واپس چلے جاتے تھے۔ لیکن ۴۵۲ء و ۵۶۸ء کے درمیان میں آبادی قائم ہونے لگی، سنہ موخرالذکر کے لمبارڈ حملہ کے بعد یہ لوگ ٹھہرنے کی نیت سے وہاں آئے اور وینس آباد ہو گیا اس تاریخ سے اٹھارھویں صدی کے آخر تک یہ شہر غیر مفتوح رہا، وینس کی تاریخ نہایت حیرت انگیز ہے یہ طویل مدت قریب قریب مساوی حصوں میں تقسیم ہو گئی ہے۔ ۵۶۸ء سے مجلس عظمیٰ کے بند ہونے کے زمانے یعنی ۱۲۹۷ء-۱۳۱۱ء تک یہ مملکت عدیدیت کیجانب ترقی کرتی گئی اور بعد کو یہی حالت مستقل قائم رہی اس دور اول کا آغاز اشتراج سے شروع ہوتا ہے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اول اول جھیل کے مختلف جزیروں پر جدا جدا ٹریبون حکومت کرتے رہے ۵۸۴ء میں ٹریبون عظام ایک طرح کی مرکزی مجلس کے ارکین کے طور پر منتخب ہوئے اور ۶۹۷ء میں مزید قوت کے لئے ایک ڈیوک یا دوجے Doge کا انتخاب ہوا اور ٹریبون اس کے ماتحت ہو گئے۔ صلح جنگ و معاہدات وغیرہ کا تصفیہ جمعیت عام میں ہونے لگا۔

جب ہم اندرون ملک کے شہروں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں ٹسکنی کے شہروں اور لمبارڈی اور وادیٔ پو کے شہروں میں ایک مزید امتیاز قائم کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے کیونکہ ٹسکنی اگرچہ انتظامی حیثیت سے لمبارڈی بادشاہی سے بے تعلق تھا مگر اسی کا جزو تھا اور وادی پو کے ضمن میں شمال مشرق کا وہ قطعۂ ارض بھی شامل تھا جنھیں سرحدات تریونیزا کہتے تھے اور جو بعد میں زیادہ تر وینس میں جذب ہو گیا ٹسکنی کے اندرونی حصص کے ممتاز شہر فلورنس لو کا ہی انیا اور ان میں بھی خاص کر فلورنس کا نشو و نما لمبارڈی کے ہر ایک دوسرے شہر سے زیادہ طویل المدت اور زیادہ دلچسپ رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس کی محققانہ بحث دوسرے خطبے میں کروں کیونکہ یہیں خاص طور پر حرفتی عنصر کو قطعی سیاسی غلبہ حاصل ہو گیا۔ لمبارڈی کے شہروں میں اس تجارتی عنصر کا سیاسی ارتقا اس وجہ سے منقطع ہو گیا کہ تیرھویں صدی اور چودھویں صدی کے حصۂ اول میں تقریباً ہر جگہ خود سرانہ حکومت کا دور دورہ ہو گیا تھا مگر تاریخ کے ابتدائی دور میں یہی شہر پیش پیش تھے لمبارڈی شاہی کے نقطۂ نظر سے اس کی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ ٹسکنی کا محل وقوع بادشاہی کے اطراف خارجی پر تھا آٹھویں صدی کے اختتام کے قریب جب چارلس اعظم نے اس بادشاہی پر قبضہ کرنا چاہا اس وقت اس کی حکمت عملی یہ تھی کہ ماتحت حکمرانوں کو ضرورت سے زیادہ مضبوط نہ ہونے دے اس کی سلطنت کا بیشتر حصہ اضلاع میں تقسیم کر دیا گیا جن کی وسعت بہت زیادہ نہیں تھی اور ان کو کاؤنٹوں کے ماتحت بنا دیا گیا، مگر اطراف ملک یعنی سرحدی اضلاع میں پر زور مدافعت کے لئے کسی قدر زیادہ مضبوط اور زیادہ حکومت کی ضرورت تھی پس یہ اضلاع "مارکوئیسون" یا مارک گرافوں یعنی سرحداروں کے تحت میں رکھے گئے بعد ازاں جب دسویں صدی کے بسط میں آٹو اعظم کے وقت سے جرمانی بادشاہوں کو لمبارڈی کے تاج اور شہنشاہی خطاب کے حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی اور انھوں نے کلیسا سے اتفاق کو از سر نو تازہ کیا، اس وقت ٹسکنی کو ان کی عام حکمت عملی میں ایک مستثنیٰ حیثیت حاصل ہو گئی وہ عام حکمت عملی یہ تھی کہ سرحداروں اور زیادہ طاقتور کاؤنٹوں کو کمزور کر دیا جائے جس کی صورت کچھ تو یہ ہو کہ کلیسا کو اوقاف عطا کئے جائیں اور کلیسا کی زمینوں کو کاؤنٹوں اور مارکوئیسون کے حیطۂ اقتدار سے مستثنیٰ کر دیا جائے اور کچھ یوں کہ چھوٹے درجے کے امرا کو بڑے درجے کے امرا کے مقابلے میں تقویت دیجائے،

مثلاً یہ کہ چھوٹے درجے کے امرا کی حیثیت کو موروثی کر دیا جائے اور اس طرح جاگیریت کی طرف قدم بڑھایا جائے (جیسا کہ فلورنس کے آخری مورخ [1] نے لکھا ہے) ٹسکنی میں معاملات دوسری ہی طرح چل رہے تھے، ٹسکنی کے ڈیوک قوت و طاقت میں ترقی کر گئے اور انھوں نے اساقفہ اور چھوٹے درجے کے امرا کو دبائے رکھا، اس کی وجہ خواہ یہ ہو کہ وہاں جاگیریت کو وسعت پذیری کی طاقت نسبتاً کم حاصل تھی یا یہ وجہ ہو کہ وہ اپنے ہمین کی دوسری جانب حکومت کرنے میں دشواری زیادہ تھی، یا یہ کہ پاپاؤں کی ترقی پذیر طاقت کے مقابلے میں کسی روک کی ضرورت تھی۔ بہرحال وجہ جو کچھ بھی ہو، ان ڈیوکوں نے لمبارڈی کے برعکس اپنی طاقت، بڑھتے ہوئے شہروں کے حصول خود مختاری کی تحریک کو بھی روک دیا اور اس وجہ سے یہاں یہ تحریک بعد میں شروع ہوئی۔

۴۔ پس ہم اس وقت اپنی توجہ کو ہ اپنے ہمین کے شمالی جانب کے ان شہروں پر مرکوز کر دیں جو خود مختاری کی تحریک میں پیش پیش تھے۔ یہاں ہم پہلا مشاہدہ یہ کریں گے کہ دسویں صدی کے آخری حصے میں جب تجدید شدہ رومانی شہنشاہی کے تحت میں ان شہروں کا ارتقا شروع ہوا تو اس سے پہلے خاندان کارلیمی کے آخری پرزور بادشاہ لیوئس دوم اور آٹو کے عہد ہائے حکومت کے درمیان سنہ ۸۷۵ء سے سنہ ۹۵۰ء تک کا جو پرصعب و مصیبتناک زمانہ گزرا، اس زمانہ میں یہ شہر خود اپنی مدافعت کرنے اور اپنی آزادانہ اجتماعی کارروائی عمل میں لانے کے عادی ہو چکے تھے مغربی یورپ کے لئے بالعموم اور اطالیہ کے لئے بالخصوص یہ تاریک ترین زمانہ تھا اور اس زمانہ میں اپنے تکالیف کے گونہ معاوضے کے طور پر ان شہروں کو یہ اجازت ملگئی تھی کہ اہل ہنگری مسلمانوں کی یورشوں سے بچنے کے لیئے اپنی قدیم شہر پناہوں کو دوبارہ بنالیں (اس طرح) یہ شہر قلعے بن گئے اور ان کے باشندوں میں فوجی تربیت و عادات پیدا ہو گئے شہر چار یا چھ محلوں میں منقسم ہوتے اور عام طور پر اپنے قریب ترین دروازے کے نام سے موسوم ہوتے تھے کیونکہ ہر محلے کے باشندوں سے بالتخصیص یہ مطالبہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے اس قریب ترین دروازے اور اس کی ملحقہ دیوار کو قابل مدافعت بنائیں [2] ہر محلہ کا اپنا علم ہوا کرتا تھا اور اس میں

---

[1] - ولاری تاریخ فلورنس کی ابتدائی دو صدیاں، جلد ۱ صفحہ ۴۷۔

[2] سسموندی "تاریخ جمہوریات اطالوی از منہ وسطی" جلد اول صفحہ ۴-۳۷۔

(اگر متمول اہل شہر یا امرا کے) ایک یا دو رسالے (گران سلاح) سواروں کے ہوتے تھے، تو اس سے دو چند تعداد تیر اندازوں اور مسلح پیدلوں کی ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں ۱۸ سے ... تک کی عمر کے تمام شہریوں پر واجب تھا کہ جب خطرے کا گھنٹہ بجے تو وہ تلواریں لے لیکر اپنے محلہ کے میدان کارزار میں آجائیں شہنشاہ کونراڈ سالیانی (Salic) کے (۱۰۲۵-۱۰۳۹ میں) جو جنگ ہوئی اس میں ملان کے اسقف اعظم ہربیبرٹ نے علمبردار گاڑی کا طریقہ جاری کر کے فوجی نظم کو مکمل کر دیا اور اس سے پیدل سپاہ کی اہمیت بڑھ گئی۔

اب ہر شخص کو نظر آسکتا ہے کہ اگر نئی شہنشاہی ان شہروں کے معاملات میں تکلیف دہ طور پر مداخلت کرتی تو اسے دشواری کا سامنا ہو جاتا مگر کچھ زمانے تک نئی شہنشاہی کی یہ حکمت عملی نہیں تھی۔ اٹو کی ذات سے جس طرح پر مقدس رومانی شہنشاہی کی تجدید ہوئی وہ فی الواقع ایک طرح کا محالفہ تھا کہ جس کے ایک جانب کلیسا تھا جو اطالوی نظم معاشرت کے زیادہ متمدن عنصر کی نمایندگی کر رہا تھا اور دوسری جانب ایک جرمانی بادشاہ تھا جسے کلیسا نے بمثل منزلت کا ایک خطاب عطا کر دیا تھا جس کے ساتھ اطالیہ کی قدیم بادشاہی کی فرمانروائی بھی شامل تھی۔ لامحالہ جرمانی بادشاہوں کی حکمت عملی یہ رہی کہ وہ لمبارڈی کی جاگیریت کے مقابلے میں اپنی تائید کے لئے کلیسا کی طرف جھکیں اس لئے اٹو نے خود اپنے اختیار کو وسیع کرنے کے لئے اساقفہ کے اختیار میں وسعت دی۔ ہر شہر میں اسقف کاؤنٹ کا رقیب بن گیا اور کاؤنٹ کے حدود اختیار کے بجائے زیادہ تر اسی اسقف کا اختیار قائم ہو گیا۔ کلیساؤں نے بخوشی خاطر شہنشاہ کو اسقفوں کی نامزدگی کی اجازت دیدی کیونکہ وہ جاگیرداروں کے مقابلے میں شہنشاہ کو اپنا دوست و حلیف سمجھتے تھے کلیسا کے ساتھ ہی ساتھ شہروں کی قوت میں بھی ترقی ہوتی گئی اور ان میں بھی ان شہروں کو جو اساقفۂ عظمٰے یا دیگر اساقفہ سے تعلق رکھتے تھے تقدم حاصل ہو گیا۔

غرضکہ جرمنی کی طرح یہاں بھی دور اول میں ارباب شہر کا حرفتی عنصر کلیسا کے زیر سایہ ترقی کرتا گیا۔ دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی کے اول حصے میں اس حرفتی عنصر نے خود کو ان جاگیرداروں کی گرفت سے آزاد کر لیا جو ملک پر حاوی ہو گئے تھے، اور ان

عله۔ فیراری "داستان انقلاب ہائے اطالیہ" جلد اول ۲۱۷۔

شہروں میں جو قدیم سے اساقفہ یا اساقفہ اعظم سے تعلق رکھتے آئے تھے، اور جن میں ملان کو سب سے مقدم حیثیت حاصل تھی اس عنصر نے یہ آزادی اپنے ان اساقفہ کی جلو میں صف آرا ہوکر حاصل کی تھی جو شہنشاہ کے بعید و بے اثر تفوق عام کے تحت میں کلی طور پر قصبوں کے فرمانروا بن گئے تھے۔ بعد ازاں جیساکہ ہم جرمنی میں دیکھ چکے ہیں، ان حلفا یعنے کلیسائی سردار اور ترقی پذیر حرفتی عنصر کے اغراض ومقاصد بھی متغائر ہوگئے اور حرفتی عنصر نے حصول خود مختاری کے لئے جد وجہد شروع کردی، اول اول تو انھوں نے خاموشانہ استصاب سے کام لیا اور پھر علانیہ جنگ پر آمادہ ہوگئے۔ ۱۱۲۲ء تک اس کاروائی کو اس عظیم الشان کشمکش سے حسب دلخواہ مدد ملتی رہی جو اساقفہ کے انتخاب ولقب کے متعلق پاپائیت وشہنشاہی کے درمیان قائم ہوگئی تھی۔

شہروں نے جب اسقفی اقتدار سے آزادی حاصل کرلی تو بارھویں صدی کے نصف اول میں ان کے نظام حکومت کا مروجہ انداز یہ تھا کہ حکومت کا کام مختلف تعداد کے قنصلوں کے ذریعہ سے انجام پاتا تھا یہی قنصل عامل ہوتے تھے، جنگ کے وقت وہ سپہ سالار ہوتے اور زمانۂ امن میں عدالت کا کام انجام دیتے تھے۔ شہر اب بھی عدیدی اقتدار کے تحت میں تھے مگر جو حکمراں خاندان ان شہروں پر حکومت کرتے تھے ان کا حلقہ زیادہ وسیع ہوگیا تھا، اس کے عقب میں ہم اہل حرفہ واہل صنعت کی وہ جماعتیں (Corporazioni delle artie dei mastier) دیکھتے ہیں جو ہنوز مساوات کی دعویدار تو نہیں ہوئی تھیں مگر تنظیمی قوت میں ترقی کرتی جاتی تھیں۔ ان جماعتوں کو فوجی تنظیم میں بلند جگہ حاصل ہوگئی تھی اور وہ وقت پر رسالے کمپنی بٹالین اور رجمنٹ میں مبدل ہوجاتی اور علمبردار گاڑی کے گرد جمع ہوجاتی تھیں [1]۔ چونکہ قنصلوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی تھی اور ان میں علی التواتر نئے لوگ داخل ہوتے رہتے تھے اس لئے یہ لوگ بہت زیادہ پرزور عاملانہ جماعت نہیں تھی، موثر حکومت کے لئے انھیں فرورت ہوتی تھی کہ ایک معتمد خفیہ مجلس Credentia ان کی مدد کرے جس کا انتخاب شہر کے مختلف محلوں سے ہوتا تھا اور قنصل اسے طلب کرتے تھے، یہ مجلس رائج الوقت نظم ونسق کے جزئیات پر رائے دیتی تھی۔ اس کے علاوہ زیادہ اہم معاملات کے لئے ایک "مجلس عظمیٰ" ہوتی تھی جس کی ترکیب مختلف جگہوں میں مختلف ہوتی تھی اور جس پر عدیدیت کا رنگ نہیں

[1] فیراری "حسب بالا" جلد اول صفحہ ۲، ۴۔

زیادہ ہوتا تھا اور کہیں کم جمعیت عامہ میں اہل حرفہ کے سربرآوردہ ارکان بھی بالضرور شامل ہوتے رہے ہوں گے اور اس کی مداخلت جنگ، محاصرے وغیرہ کے ایسے نازک معاملات کیلئے محدود تھی۔ ان مجالس کے ارکان کا انتخاب عام اہل شہر کی طرف سے یا کم از کم یہ کہ بلا واسطہ طور پر نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کا تقرر یا تو خود قنصل کرتے تھے یا خاص طور پر مقرر شدہ انتخاب کنندگان انھیں منتخب کرتے تھے اور اطالیہ میں اسی کا عام رواج تھا عام اہل شہر کی طرف سے بلا واسطہ انتخاب شاذ و نادر ہوتا تھا جب قنصلوں کے انتظامی فرائض بڑھنے لگے تو پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ وہ عدالتی فرائض سے علحدہ ہو گئے چنانچہ ۱۱۳۰ء میں جنوا میں تین انتظامی قنصل اور آٹھ عدالتی قنصل تھے، اور انتظامی قنصلوں کی تعداد تین چار سے لیکر بیس سے زائد تک تھی، یہ تعداد یا تو شہر کے محلوں کے مساوی ہوتی تھی یا اسی کا کوئی مضروب ہوتی تھی۔

۵۔ بعد ازاں بارھویں صدی کے نصف اول میں شہروں کی ترقی یافتہ خودمختاری کا اظہار ان کی آپس کی لڑائیوں سے ہوتا ہے کیونکہ اول اول اسی زمانے میں پوری قوت و جوش کے ساتھ شہروں میں ایک دوسرے کے ساتھ ان پرغضب مسلسل لڑائیوں کو ترقی ہوئی جنھوں نے اطالوی تاریخ کو از منۂ وسطیٰ کے ہر ایک مغربی یورپی ملک کی تاریخ سے ممیز کر دیا ہے اور جن سے قدیم یونان کا خیال ہمارے دلوں میں تازہ ہو جاتا ہے۔

ان جنگوں کے اسباب مختلف نظر آتے ہیں۔ کچھ سبب تو یہ تھا کہ رومانی شہروں میں جن کی فوقیت کلیسائی انتظام میں قایم رکھی گئی تھی اور ان شہروں میں جو لمبارڈی کی شاہی کے فوجی مرکز تھے، مدتہائے دراز سے رقابت قائم تھی۔ مثلاً ملان اور پادیا میں رقابت تھی۔ کچھ سبب یہ تھا کہ شہنشاہ اور پوپ کے مناقشے میں کسی نہ کسی طرف شریک ہونے کی وجہ سے شہروں کی رقابت باہمی بہت تیز ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی محض کلیسائی مناقشات کی وجہ سے جنگ کی وجہ پیدا ہو جاتی تھی مگر فی الجملہ جنگ کے اسباب زیادہ تر معاشی معلوم ہوتے ہیں۔ جب شہروں کی ثروت و آبادی بڑھنے لگی تو پھر ان کی حرفت و تجارت کی ترقی پر دوسرے شہروں کی طرف سے جو روک ہوتی تھی اس سے خلش پیدا ہونے لگی۔ اول اول بڑے شہروں نے چھوٹے شہروں پر حملہ کیا چنانچہ پادیا نے تورتونا پر، کریمونا نے کریما پر اور ملان نے لودی پر حملے کر دئے تبھی ادھر ادھر جا نب منجر ہوا کہ شہروں کے باہمی معاقدے قائم ہو گئے۔ مثلاً

لودی نے خود کو پادیا کی حفاظت میں دیدیا۔ علی العموم یہ ہوتا تھا کہ زیادہ بڑے شہروں کی ملیشیا (فوج محافظ) باہر نکل کر دشمن کے کھیتوں کو تباہ کر دیتی (اور جو کچھ ہو سکتا) اٹھا لیجاتی۔ ملان اور لودی کے درمیان ۱۱۰۷ء سے ۱۱۱۱ء تک کی جنگ اسی طور سے شروع، مگر اس کا خاتمہ لودی ویچیو (قدیم لودی) کی بربادی پر ہوا جس کے باشندے چھ دیہات میں تقسیم کر دئے گئے۔ ۱۱۱۸ء سے ۱۱۲۷ء تک کومو کے خلاف ملان کی جنگ کا آغاز اس فساد سے ہوا جو پاپا نے مخالف وینو کے مقرر کردہ اسقف اور کومو کے جائز اسقف گوئیدو کے درمیان برپا ہوا کومو کے ایک شاعر نے اس جنگ کو جنگ ٹرائے سے مشابہ قرار دیا ہے۔ لمبارڈی کے شہر زیادہ تر شہنشاہ کی جانب تھے مگر ان میں سے چند شہروں نے ملان کی بھی مدد کی تھی۔ اطالوی جھیلوں کے دیہات جو کومو کے ماتحت تھے ان میں سے کچھ دیہات نے بغاوت کر دی۔ انجام کار میں کومو نے اطاعت قبول کر لی؛ اس کے باشندوں نے یہ منظور کر لیا کہ وہ اپنے حصاروں کو منہدم کر دینگے ملان کو محصول ادا کر دیں گے اور اس کی جنگوں میں بطور حلیف کے کام کریں گے۔

بارھویں صدی کے وسط میں شمال اطالیہ کے شہروں کی آزادی کی تحریک میں اس شدید کشمکش کی وجہ سے جو ان شہروں اور شہنشاہی اقتدار کے درمیان برپا ہوگئی تھی نازک وقت آگیا۔ اقتدار شاہی اس وقت راسخ العزم فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) کے ہاتھ میں تھا جس کی کوشش یہ تھی کہ شہروں کو ان کے نیم خود مختار حقوق سے محروم کر دے (کیونکہ اس کے نقطۂ نظر سے یہ حقوق غصب میں داخل تھے) اور ان شہروں کی حکومتوں کو محض ایسی مقامی حکومتوں کی حیثیت میں بدل دے جیسی مربوط منتظم مملکتوں میں ہوتی ہیں۔ ابتداءً شہروں کی رقابت نے شہنشاہ کے مفید مطلب کام دیا، اس کی فوجیں ناقابل مدافعت معلوم ہوتی تھیں اور باغی شہروں میں سب سے مقدم شہر ملان پر قبضہ ہوگیا اور اسے زمین کے برابر کر دیا گیا۔ مگر اس کے بعد ہی آزادی کی الفت قدیم بلدی مخاصمت کے جذبات پر غالب آگئی۔ لمبارڈی کے شہروں کی ایک لیگ قائم کی گئی، جس میں ملان کے قدیم دشمن اور اس کے قدیم دوست دونوں شامل تھے اور انھوں نے فریڈرک کے علی الرغم اس اسقف اعظم کے شہر کو از سر نو تعمیر کیا، جرمانی فوجوں کا کامیابی سے مقابلہ کیا، در ۱۱۷۶ء میں جنگ لی نیانو میں ان فوجوں کو قطعی شکست دیدی۔ اس کے بعد ۱۱۸۳ء میں کانسٹنس کے معاہدہ کے وقت انھیں یہ حق حاصل ہوگیا کہ وہ اپنے ہی قوانین کی اطاعت کریں گے،

انھیں کے حکام ان پر حکومت کریں گے (البتہ بعض صورتوں میں شہنشاہ کی باضابطہ منظوری لیں گے صلح و جنگ اور مخالفہ خود کریں گے اور اپنے مالیات کا بھی خود ہی انتظام کریں گے) اس سے صرف وہ چند ادائیاں مستثنیٰ تھیں جو وہ وقتاً فوقتاً شہنشاہی خزانہ میں ادا کرتے رہیں، یہ اختیارات ایک ایسی قرارداد کی رو سے حاصل ہوئے تھے جن میں عملاً اس وقت تک خلل نہیں پڑا جبتک کہ لمبارڈی کے شہروں کی آزادی قائم رہی۔ حقوق کا یہ قانونی تحفظ جو عملاً زمانہ دراز سے مسلم سمجھا جاتا رہا تھا ابتداءً اس مرحلے کو اس معاقدے کے شہروں نے سر کیا جو شہنشاہ سے برسر جنگ تھا لیکن شہنشاہ اپنے دوستوں کے لئے اس شے سے انکار نہیں کر سکتا تھا جو دشمنوں کے لئے روا رکھی گئی ہو، پس معاہدہ کانسٹنس کی رو سے بعض شہروں کو جو آزادی حاصل ہوئی وہ اطالیہ کے شہروں کے لئے عام ہو گئی۔

۶۔ اب میں اطالوی شہروں کی ایک دوسری سیاسی اہمیت رکھنے والی خصوصیت کی طرف متوجہ ہوتا ہوں اور یہ خصوصیت شہر اور دیہات کی مخاصمت ہے شہروں کی باہمی رقابت کے مانند اس مخاصمت کے اسباب بھی زیادہ تر اقتصادی تھے جاگیری امراء آمد و رفت اور تجارت میں خلل انداز ہوتے تھے، وہ محاصل رہگذر کے ذریعے سے راستوں میں رکاوٹ ڈالتے اور سوداگروں کو لوٹتے تھے۔ اپنے راستے سے انھیں دقتوں کو بذریعۂ جنگ رفع کرنے کی ضرورت نے شہروں کی قوت کو پرامن حرفت کے کام سے ناقابل برداشت حد تک ہٹلیا بارھویں صدی کی بلدی لڑائیوں کے دوران میں مضافات میں جاگیری امراء سے بھی جنگ جاری تھی مگر اس کا زیادہ اہم حصہ صلح کانسٹنس کے بعد واقع ہوا۔ ملان نے اپنی خاک تحتر سے سر اونچا کر ارد گرد کے تمام امرائے مضافات کو ان کے اختیارات سے محروم کر دیا تھا۱ جنوا، فینا ۔۔۔۔ لے کی امارت مارکوئس کو بارھویں اور تیرھویں صدی کے تمام زمانوں میں آہستہ آہستہ دباتا رہا اور لودا اور استی اور اس قسم کے اور بہت سے دوسرے مقامات پر تیرھویں صدی کے تمام دوران میں شدت کے ساتھ جنگ و پیکار جاری رہی جاگیری امراء اپنی مدافعت اس طرح کرتے تھے کہ ایک شہر کو دوسرے شہر سے ٹکرا دیتے تھے مگر اس سے وہ اپنی لابدی تباہی کو صرف ملتوی کرتے رہے۔

---

۱ فیرارا حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۰۵۔

اگر ہم یہ سوال کریں کہ صرف اطالیہ ہی میں کیوں ایسا ہوا کہ جاگیرداروں کے ساتھ کشاکش میں شہروں کو فتح حاصل ہوگئی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس شہنشاہی ملک اطالیہ میں شہروں نے زیادہ ترقی حاصل کرلی تھی اور وہاں ان کی تعداد بھی بہت کثیر تھی اور نیز یہ کہ شہنشاہوں کی حکمت عملی کی وجہ سے (جس کی توضیح پہلے ہو چکی ہے) اور جگہوں کے بہ نسبت اس ملک میں جاگیردار کمزور تھے اس کے علاوہ شہروں کے حق میں ایک مزید قوت انکی آزادی کی اس خواہش سے پیدا ہوگئی تھی جو تمام ملک میں پھیل گئی تھی

بعد ازاں جبکہ شہروں نے زیادہ تر فتح حاصل کرلی تو پھر وہ آخری منزل آئی جو اطالوی بلدی زندگی کے لئے سب سے زیادہ اہم اور بحیثیت مجموعی نہایت مہلک نتائج سے مملو تھی یعنی جاگیردار امرا کو مجبور کرکے شہروں کے اندر رکھا گیا۔ اس سے شہروں کا مقصود دلی تو یہ تھا کہ امرا کو جاگیری اختیارات سے نکال کر شہر کے حیطۂ اختیار میں شامل کرکے اس فتح کے ثمرات کو قانونی حدود کے اندر کرلیا جائے اور امرا کا مقصود یہ تھا کہ جس جنگ میں انھیں ہمیشہ سرنگوں ہونا پڑتا ہے اس کا خاتمہ ہو جائے پس امرا نے شرائط کو قبول کرلیا، انھیں مجبور کیا گیا کہ وہ شہر کے اندر قصر بنائیں اور سال کے چند مقررہ مہینے وہاں رہا کریں اور جنگ کے اوقات میں یہ میعاد اکثر دو چند کردیجاتی تھی اگر کوئی امیر اس شہر میں سکونت پسند نہ کرتا جس سے اس سے جنگ ہوئی تھی تو وہ کسی دوسرے شہر میں قیام کرلیتا جس سے اس کا مخالفہ رہا ہو۔ امرا فوراً اس حالت سے بہترین مفاد حاصل کرنے کے در پے ہوگئے۔ وہ شہریوں سے بے تعلق پیش آنے لگے اور اپنی دور بینی، وضعداری یا طمع سے محض تفریح طبع کے طور پر مجالس عظمٰی میں داخل ہوگئے[1] چونکہ نئے خاندان جنھوں نے حرفت و تجارت سے تمول حاصل کرلیا تھا وہ بھی "فضلی" خاندانوں میں شامل ہوگئے تھے۔ پس اس طرح شہروں کے اندر حکمراں عدیدیت میں وسعت ہوگئی اور یہ گویا ایک طبعی معاوضہ تھا۔

میدانہائے پو کے شہروں میں جہاں شہروں نے اپنے جاگیردار ہمسایوں پر قطعی فتح حاصل کرلی تھی بعینہٖ یہی صورت پیش آئی لیکن دوسرے مقامات مثلاً سرحد تریویز ابلند پایہ شہر ویرونا و سینترا، یا دولا وغیرہ میں جاگیردار عنصر مضبوط تھا جس کی وجہ یہ تھی کہ ملک زیادہ

[1] فیراری، حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۲۶۔

پہاڑی تھا اور اگرچہ یہاں بھی مفصلات کے امرا بہت زیادہ شہروں میں داخل ہو گئے تھے۔ لیکن یہاں وہ بظاہر اپنے بلند مرتبے کو قائم رکھتے ہوئے ایسا کرتے تھے اور اسی بلند مرتبگی کا نتیجہ تھا کہ لمبارڈی کے شہروں کی بہ نسبت یہاں مطلق العنانی جلد قائم ہو گئی (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اپنی فتح کو اس طرح کام میں لانے سے شہروں کا مقصد یہ تھا کہ امرا کو موثر طور پر بلدی حکومت کے زیر اثر کر لیا جائے مگر شہروں نے امرا کو اس قدر طاقتور یا زیادہ وسیع معنی میں اس قدر جاگیردارانہ حالت میں چھوڑ دیا تھا کہ اس نتیجے کا امکان بہت بعید تھا۔ شہروں نے امرا سے ان کے عدالتی اختیارات، ان کے برج، ان کے حصار، ان کی باقاعدہ فوج یہ سب چیزیں سلب کر لی تھیں مگر ان کی اراضی، ان کی دولت، ان کے خطابات، ان کے محلات اور اکثر و بیشتر صورتوں میں ان کے کاشتکار (جو اگرچہ اب ان کے غلامان وابستہ اراضی نہیں رہے تھے مگر ان کے توابع میں شامل تھے) انکی فوجی مشق و مہارت ان کا معاشرتی امتیاز اور ان کے خاندانی روابط یہ سب بدستور ان کے پاس چھوڑ دئے تھے۔ پس جن تاجروں کو امرا اپنا ہم شہر سمجھنے پر مجبور کئے گئے تھے انہیں وہ پست نظر سے دیکھتے تھے۔ شہروں کے اندر انھوں نے جو محلات بنائے وہ بھی قلعے تھے۔ انھوں نے اپنے حشم و خدم کو مسلح کر دیا تھا اور آبادی کے ایک حصہ سے انہیں جنگجو خدام ملجاتے تھے خلاصہ یہ کہ وہ اپنی قدیم روش پر چلے جاتے تھے اور شہر کی معاشرت کے اندر ایک پریشاں کن عنصر بن گئے تھے۔

ہمیں اپنے ذہن میں یہ خیال کر لینا چاہئے کہ اندرون شہر کے امرائے قدیم اور تجارت پیشہ عنصر کے درمیان ہمیشہ ایک گونہ مخالفت و مخاصمت قائم رہی البتہ جرمانی شہروں میں یہ ہوا کہ تجارت پیشہ عنصر نے جلد تر اس قدیم جاگیری عنصر کو ہضم کر لیا کیونکہ یہاں اسے اس جدید جاگیری عنصر سے تقویت نہیں ملتی تھی جو مفصلات سے بزور لا کر شہر میں داخل کیا گیا تھا، مگر اطالوی شہروں میں (اس داخلۂ جدید کی وجہ سے) اسے نئی تقویت حاصل ہو گئی تھی اور وہ پریشانی کا ایک مستقل سرچشمہ بن گیا تھا۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ شہروں نے ان امن شکنوں کی جائداد میں ضبط کیوں نہ کر لیں، اس کا جواب یہ ہے کہ شہروں کی خود مختاری اگرچہ بظاہر تقریباً مکمل معلوم ہوتی تھی مگر اس مقصد کے لئے وہ جیسی ہونا چاہئے ویسی مکمل نہیں تھی شہنشاہی نے ذاتی جنگ کو

ؔ فیلاری حسب بالا صفحہ ۱۳۰

روا رکھا تھا کیونکہ انسان ایک جنگجو حیوان ہے، اور ہو سکتا تھا کہ زمین کی چیرہ دستانہ قزاقی کو بھی وہ برداشت کر لیتی مگر وہ اس کے نتائج کو قانونی حیثیت دینے سے انکار کر دیتی۔ جو شہر جاگیرداراموں کو برباد کر دینے کی کوشش کرتا وہ علی الاعلان شہنشاہی و پاپائی نظام اور عام اصول جاگیریت کا حریف سمجھا جانے لگتا۔ شہر اپنی جگہ پر یہ سب سمجھتے تھے کہ ان کی ہستی کا انحصار مقدم الذکر (شہنشاہی و پاپائی نظام) پر معلق ہے، اور (اس لئے) موخرالذکر (اصول جاگیریت) کا بھی مقابلہ کرنے کی وہ جرات نہیں کر سکتے تھے۔

۷۔ شہروں کے اندر جاگیری عنصر کی اس آمیزش کا نتیجہ انجام کار شہروں کی آزادانہ تجارتی حیثیت سے مرفہ الحالی کے ساتھ ترقی کرنے کے لئے مہلک ثابت ہوا لیکن پہلا اثر اس کا ایک بہت عجیب و غریب ادارے یعنے سالانہ مقرر شدہ غیر ملکی حکمراں (پودستا Podesta) کی صورت میں ظاہر ہوا جب شہروں کی خود مختاری کے ساتھ فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) کی کشمکش ہوئی تو اس نے یہ کوشش کی کہ ہر ایک اہم مرکز میں ایک پودستا یا حکمراں کا تقرر کر کے شہنشاہی اقتدار کو قائم رکھے۔ شہروں نے ہر جگہ ان غیر ملکی آدرووں کے قبول کرنے سے انکار کیا، اور ان کے خلاف جد و جہد کی کہیں ان کے ساتھ بد سلوکی ہوئی کہیں انھیں خارج کر دیا گیا بلکہ بعض جگہ تو انھیں قتل بھی کر دیا گیا، بایں ہمہ جب صلح کانسٹنس نے ان کی فتح پر مہر تصدیق ثبت کر دی تو اس کے بعد انھوں نے یکے بعد دیگرے اس تنظیم کو قبول کر لیا جس کا ذکر ہو چکا ہے یعنے پودستا کے نام سے ایک اجنبی مبارزہ (نائٹ) کا کسی دوسرے شہر سے انتخاب ہوتا تھا اور اسے بلند ترین عاملانہ اختیارات تفویض کر دیئے جاتے تھے۔

اس مختص اطالوی ادارے کا اولین سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہری بد نظمی کے رفع کرنے کی شدید ضرورت تھی جسے شہر کے اندر جاگیردار امرا کے جبریہ واسطے نے اس قدر بڑھا دیا اور تیز کر دیا تھا (اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ ضرورت اطالیہ ہی کے لئے مخصوص تھی) لیکن یہ پودستا کم از کم لمبارڈی کے شہروں میں تو محض عدالتی عہدہ دار ہی ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کے عدالتی فرائض پر بخصوصیت سے زور دیا جاتا تھا مگر عدالتی فرائض کے ساتھ بعض وہ سیاسی فرائض بھی جو پہلے قنصل سے متعلق تھے پودستا کی جانب منتقل ہو گئے تھے اور بہ درجۂ اول بعض صورتوں میں یہ معلوم ہوگا کہ اس ادارے کے قبول کرنے میں یہ خیال بھی موید ہوا کہ ایک سرگروہ کے ہونے کا نفع بیرونی تعلقات کی بہ نسبت اندرونی

تعلقات میں بھی کم نہیں تھا۔ اس کا اولیں فرض یہ تھا کہ قانونی نظم و امن کے سب سے طاقتور مفسدوں کے خلاف سختی و بے لوثی کے ساتھ نظم قانون کو قائم رکھ کر شہر کے اندر طوائف الملوکی کو فرو کرے۔ ایک اجنبی کا باقاعدہ انتخاب اسی بنا پر ہوا ہو گا مگر اسے فوجی مہمات کی رہبری بھی کرنا پڑتی تھی۔ شہر کی مسلح قوت قانونی اغراض کے لئے اس کے تابع فرمان تھی۔

پودستا کے عہدے کی وجہ سے اطالوی شہروں کی نمونۂ حکومت بہت زیادہ پیچیدہ ہو گئی تھی کیونکہ فصل علٰحدہ نہیں کئے گئے تھے۔ البتہ نام اکثر بدل جاتا تھا۔ ان کی ایک مجلس بنادی جاتی تھی اور شہر کا عام نظم و نسق ان کے ہاتھ میں ہوتا اور اس کے ساتھ ہی نئے حکمراں کو مشورہ دینے کے لئے ایک دوسری مجلس یعنی پودستا کی مجلس خاص بھی مرتب کی گئی تھی یہ مجلس ملان میں ۱۱۹۹ء میں قائم کی گئی اور اس کے ارکان کو معتمد، مشیر یا عاقل کا لقب دیا گیا ارکان کمیون کے معتمد، "مشیر" یا "عاقل" کہلاتے تھے اس کے سوا مجلس عظمٰی بھی بالضرور موجود تھی اور کبھی کبھی "پارلامنتو" Parlamento بھی منعقد ہوا کرتی تھی۔ پودستا شہر اور اس کے قوانین کی وفاداری کا حلف اٹھاتا تھا۔ اسے منصفوں، خادموں اور سپاہیوں وغیرہ کے ایک معینہ عملے کے ساتھ آنا پڑتا تھا اور اس کے لئے ایک مقررہ شاہرہ اور اسباب خانہ داری کا انتظام کیا جاتا تھا۔ خلاف ورزی فرائض کے لئے جو جرمانے متعین ہوتے تھے وہ اس کی تنخواہ میں سے وضع ہوتے تھے۔ اسے اپنے عہدے کے سال کے ختم ہونے کے بعد ایک معینہ وقت تک شہر نا پڑتا تھا کہ شکایتوں کی تحقیق ہو سکے اور معاوضات عطا کئے جا سکیں، اسکے لئے لازم تھا کہ شہر میں کسی قسم کے تعلقات نہ رکھے اور نہ کسی قسم کی ضیافت وغیرہ قبول کرے۔

شہر اپنے وہاں اجنبی حکمراں لانے پر جس طرح آہستہ آہستہ راضی ہوئے اس کی کیفیت کا پتہ کسی وقایع سے چل سکتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۹۰ء میں جنوا کو یہ محسوس ہوا کہ اسکے قنصل ناکافی ہیں شاہزشیں، اختلافات اور تفرقے کسی طرح ختم ہونے کو نہیں آتے [۱] اسلئے ایک پودستا کا تقرر کیا گیا جس نے ایک بہت ہی پرشور اہل فریق کا محل مسمار کر دیا اور اس طرح امن و انتظام کو بحال کیا۔ دو برس بعد اہل شہر دوبارہ قنصلوں کی طرف پلٹے، مگر شہری مناقشات نے پھر سر اٹھایا اور لوگ مجبور ہوئے کہ بار دگر پودستا کا عہدہ قائم کریں آئندہ سال

---

[۱] فیراری، حسب بالا، جلد دوم صفحہ ۱۷۲۔

وہ پھر تذبذب میں پڑ گئے مگر آخرالامر وہ اس پر راضی ہو گئے کہ سال بسال منتخب شدہ پودستا کا مستقل عہدہ قائم کر دیں۔

اسی طرح لاآن میں پہلا سالانہ پودستا ۱۱۸۶ء میں مقرر ہوا مگر اس کے بعد پھر قنصلوں کی طرف پلٹ گیا اور ان کے اختیارات کو وسعت دیدی اور تین برس متواتر اسی کی تکرار ہوتی رہی بعد ازاں ۱۱۹۱ء میں یہ تجربہ کیا گیا کہ دونوں فریقوں کو رضامند کرنے کے لئے دو پودستا مقرر ہوں مگر اس سے مطلب حاصل نہیں ہوا اور سال کے نصف آخر میں قنصل دوبارہ مقرر کر دئے گئے پھر ۱۱۹۳ء سے ۱۱۹۹ء تک قنصل ہوتے رہے اسکے بعد ایک پودستا کا تقرر ہوا اور یہ ردوبدل ۱۲۱۲ء کے بعد تک جاری رہا۔

بعض صورتوں میں یہ تنظیم ابتری و پریشانی کے بغیر قائم نہیں ہوئی اور اس عہدے کے ساتھ سخت خطرات لاحق ہو گئے۔ چنانچہ ہم یہ سنتے ہیں کہ ۱۱۹۴ء میں ایک پودستا کو بولونیا سے بھاگنا پڑا اور غیظ آلود امرا نے جب تعاقب کر کے اسے گرفتار کیا تو انھوں نے اپنے جرمانوں کے انتقام میں اس کے دانت اکھیڑ ڈالے ۱۲۰۰ء میں لوگا کا ایک پودستا جان سے مارا گیا اور ۱۲۱۳ء میں موڈینا کے پودستا کی زبان نکال لی گئی۔

پودستا اپنے کام اچھی یا بری طرح انجام دیتے رہے مگر فرقہ بندی کا بحر مواج انکی حد طاقت سے زیادہ جوش پر تھا اور تیرھویں صدی میں کوہ اپنیس سے شمال کے شہروں میں شاہی حکومت کی طرف مغلوب کن حد کو پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے
"خود سری" کے نام سے موسوم کیا ہے تاکہ اطالوی و یونانی تاریخ کا تشابہ ظاہر ہو سکے اور حقیقت یہ ہے کہ اکثر صورتوں میں اطالیہ کے مطلق العنان حکمرانوں نے جس صورت سے اختیار و قوت حاصل کی تھی اس کے اعتبار سے وہ خود سری کہلانے کے سزاوار تھے لیکن اگرچہ اس خود سری کا قیام ابتدائی اکثر جور و زیادتی ہی سے ہوتا تھا مگر وہ اکثر اس مقصد کو انتخاب کے وسیلے سے حاصل کرتا تھا۔

(جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں) دور افتادہ شرقی حصص کے بہ نسبت خاص لمبارڈی میں جاگیری عنصر کے اوپر بلدی عنصر کا غلبہ زیادہ تھا اور فی الحقیقت انھیں مشرقی اضلاع میں بادشاہی کا شیوع پہلے ہوا اور وہیں بادشاہی نے پہلے منظم صورت اختیار کی بادشاہی کی زیادہ منظم صورت کا آغاز ۱۲۰۹ء میں ہوا جبکہ ایسے کے مارکوئس ازو ششم فیرارا کے

کا حکمراں تسخیر کیا گیا۔ سسمونڈی[1] کہتا ہے کہ "یہ پہلا واقعہ تھا کہ اطالوی قوم کے افراد نے اپنے حقوق سے دست بردار ہو کر ایک فرد واحد کی اطاعت قبول کر لی"۔ اس سے تقریباً بیس برس بعد (۱۲۲۶ء میں) مشہور خود سر ایچلینو دارو ماتو نے ویرونا میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ یہ شہر دامن آلپس کے قریب واقع تھا اور اس لئے لمبارڈی کے میدانی شہروں کی بہ نسبت یہاں طریق جاگیریت کو زیادہ غلبہ حاصل تھا۔ رومانو کے اس خاص معاملے میں جزو اعظم فرقہ بندیوں کا اشتداد تھا اس سے کسی فوجی مہارت رکھنے والے جری سرگروہ کی ضرورت لاحق ہوئی لیکن اگرچہ مطلق العنانی کا قدم سب سے پہلے انھیں مشرقی شہروں میں آیا تاہم لقول ہیلم زیادہ سے زیادہ چودھویں صدی کے اختتام تک تمام ان شہروں نے جو شہنشاہوں کی اطاعت کے خفیف ترین نشان کو بھی ٹھکرا دیتے تھے، خود مختار حکومت کی یاد تک بھلا دی اور اب وہ اپنے نئے آقاؤں کی اولاد میں بے رد و کد ورثے کی طرح سے منتقل ہونے لگے[2]۔ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کی اطالوی طرز کے ارتقائے کامل تک سیاسی نشو ونما کا درجہ بدرجہ پتا چلانے کے لئے ہمیں فلورنس کی طرف متوجہ ہونا پڑیگا۔

---

[1] سسمنڈی حسب بالا جلد دوم صفحہ ۳۱۲ ۔

[2] ہیلم "ازمنۂ وسطیٰ" جلد اول باب سوم حصۂ دوم صفحہ ۴۰۸ ۔

ملان میں (۱۴۴۷ء میں) جمہوریت کی ہنگامی تجدید پر اس بیان کے استثنا کی حیثیت سے سرسری نظر ڈالی جانے مگر سرسری ہی نظر ڈالنا کافی ہوگا ۔

خطبۂ نوزدہم

بلحاظ ازمنۂ وسطیٰ، اطالیہ کی شہری جماعتوں کا مقابلہ قدیم یونان سے

۱۔ میں نے کسی سابق خطبے میں یہ اشارہ کیا ہے کہ معمولی مورخ کی نظر میں یورپ کے دیگر حصص کی بہ نسبت اطالیہ کا مقابلہ قدیم یونان سے بہت زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے عام معمولی مورخ سے میری مراد ایسے مورخ سے ہے جسے خصوصیت کے ساتھ اس بحث سے سروکار نہ ہو جس کو مملکتوں کا علم التشکیل کہہ سکتے ہیں۔ اس قیاس کی وجہ یہ ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ میں صرف شمالی اطالیہ ہی وہ سرزمین تھی جہاں تک ایک مسلسل قطعۂ ارض کا کل حصہ تو نہیں مگر اسکا بیشتر حصہ متعدد شہری مملکتوں کی اراضی میں بالکل اس طرح منقسم تھا جس طرح کہ قدیم یونان کا زیادہ متمدن حصہ منقسم تھا (اس کے برخلاف، جرمنی کے اندر جن جگہوں میں شہروں کو بہت زیادہ خوش حالی حاصل تھی، وہاں بھی یہ شہری مملکتیں شاہانہ حکومت کے محض مستثنیات میں سے تھیں^۱)، نیز اس پر بھی لحاظ کیا جانا مناسب ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کی اطالیہ اپنے عملاً خود مختار شہری جماعتوں کے دور خوشحالی میں، ذہنی و مادی تمدن و تہذیب میں تمام یورپ پر فائق تھی۔ یہ فوقیت ایسی نمایاں نہیں تھی جیسی قدیم یونان کو اپنے انتہائی سرسبزی کے زمانے میں حاصل تھی۔ تاہم بہت بڑے اختلافات کے باوجود یہ یقینی ہے کہ اطالوی جمہوریتوں کے اندر

۱۔ فری مین۔۔ ۱۷۱

یونان قدیم کی تاریخ کے ساتھ نمایاں مشابہت پائی جاتی ہے۔ اور میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر ان دونوں کو ساتھ ساتھ دکھاؤں۔

اولاً یہ کہ جس طرح یونانی شہروں نے قدیم بربریت سے نکل کر نشوونما پائی، اسی طرح اطالیہ کے شہروں نے اس ذیم بربری بدنظمی سے جس میں خود معاشرہ ہی غرق ہو گیا تھا، نکلکر قوت و خوش حالی میں ترقی کی۔ (الف) فن جنگ کے اس دور میں ان کے فصیلی شہروں کو فوجی فوقیت حاصل تھی اور (ب) ان کی اقتصادی خوشحالی کا باعث یہ تھا کہ انھیں فصیلدار شہروں کے اندر ایک ایسے معاشرے میں جو یورپی تمدن و حرفت کا پیشرو بنتا جا رہا تھا، متمدن حرفت و تجارت کا موقع مل گیا تھا۔

دوسرے یہ کہ ازمنۂ وسطی کے اطالیہ کی شہری جماعتوں کے اندر یونانی شہری مملکتوں کی سی مجتمعہ سیاسی زندگی اور انھیں کی سی گونہ عمیق حب الوطنی پائی جاتی تھی، اور دونوں صورتوں میں اس کا سبب بھی بہت کچھ ایک ہی تھا کہ ملکی سلطنتوں کی بہ نسبت یہاں افراد کے سود و بہبود کو اس کی جماعت کے سود و بہبود کے ساتھ زیادہ گہرا تعلق تھا۔ مزید براں دونوں صورتوں میں یہ حب الوطنی ان کی تاریخ کے اس ابتدائی حصے میں زیادہ تابناک نظر آتی ہے جب ان کے شہری سپاہی ان زبردست حملہ آور بادشاہوں کی مدافعت کے لئے ایک دوسرے کے دوش بدوش ہو جاتے تھے جو ان شہروں کو زیر کرنا چاہتے تھے۔ اپنے قدیم تنازعات کے باوجود لمبارڈی کے کل شہر نہیں مگر شہروں کی ایک کافی تعداد جس طرح فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) (۱۱۶۷ء ـ ۱۱۸۳ء) کی مقاومت کے لیے متحد ہو گئی، اس کا مقابلہ اس صورت سے کیا جا سکتا ہے جس طرح یونانی مملکتیں اپنی موروثی رقابتوں اور اپنی سرحدی جنگوں کے باوجود کل نہیں مگر کافی تعداد میں ایرانی حملے کے روکنے کے لئے متحد ہو گئی تھیں۔

پھر جس قدر زمانہ گزرتا گیا، دونوں صورتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ شہر نہ صرف ایک دوسرے سے بلکہ خود اپنے اندر بھی بہ اشتداد و طویل فرقہ بندیوں کی ناگواریوں کی وجہ سے مایوسانہ طور پر منقسم ہو گئے تھے۔ جس طرح اسپارٹا اور اس کے حلفا، ایتھنز اور اس کے حلیفوں سے لڑتے رہتے تھے، اسی طرح گوئلف (جانبداران پوپ کے) شہروں کا معاقدہ گبیلین (جانبداران شہنشاہ کے) شہروں کے معاقدہ سے برسرپیکار رہا کرتا تھا۔

مزید براں، قدیم تر زمانہ میں یونان قدیم اور اطالیہ ازمنۂ وسطی دونوں میں بلدی جنگوں میں ایک شہر دوسرے شہر سے آپس ہی میں ایک متحدہ جماعت کے طور پر لڑتا تھا، مگر چوتھی صدی قبل مسیح کی یونانی جنگوں میں جس شہر پر حملہ ہوتا تھا اس کے خارج البلد اشخاص بھی حملہ آور قوت کا ایک قابل لحاظ عنصر ہوتے تھے اسی طرح اطالیہ کی باہمی بلدی لڑائیوں میں جن کا شمار تیرھویں صدی کے نصف آخر اور اس کے بعد کے زمانے سے ہوتا ہے، یہ صورت نہیں رہی تھی کہ "پارما پیا چنزا سے لڑتا تھا" بلکہ پارما مع مخرجین پیاچنزا سے لڑتا تھا عـه۱

پھر دونوں صورتوں میں، تمدن اور اس کے ساتھ ساتھ پرامن صنعت و حرفت اور عیش و عشرت نے بتدریج اہم شہروں کے باشندوں کو جنگ کرنے سے معذور بنا دیا تھا اور یہ روز بروز اجیر سپاہیوں کے ذریعہ سے جنگ کرنے کا طریقہ اختیار کرتے جاتے تھے، بس کچھ تو پائدار اتحاد قائم کرنے کی عدم قابلیت اور کچھ جنگ میں بذات خود کام کرنے کی ناقابلیت کی وجہ سے انجام کار یہ لوگ اس جدال و قتال کے قابل نہ رہے جو ان کے قرب و جوار کی وسیع تر ملکی سلطنتوں کے ساتھ پیدا ہو گئی تھی، یہ ملکی سلطنتیں یونان کے معاملے میں تو اسکندر کی شہنشاہی کے اجزا تھے، اور اطالیہ کے مقابلہ میں مغربی یورپ کی وسیع تر سلطنتیں تھیں، اور اس طرح ان شہروں کی اراضی غیر ملکی نبرد آزماؤں کے میدان کارزار بن گئی عـه۲ اطالیہ کے لئے یہ صورت حالات ۱۴۹۴ء میں چارلس ہشتم کے حملے سے شروع ہوئی۔ بقول مکالے جس ساعت سے کہ چارلس ہشتم کوہ الپس سے اترا، اسی ساعت سے اطالوی سیاسیات کی کل کیفیت بدل گئی۔ اس جزیرہ نما کی حکومتوں کا کوئی خود مختارانہ نظم باقی نہیں رہا۔ جو وسیع تر اجسام اب ان کے قریب آ گئے تھے انھوں نے اپنی کشش سے انھیں قدیم مرکز سے کھینچ لیا تھا۔ اور اب وہ فرانس و اسپین کے محض توابع رہ گئے تھے۔ ان کے تمام اندرونی و بیرونی مناقشات کا تصفیہ غیر ملکی اثر سے ہوتا تھا عـه۳

عـه۱ - فیراری، حسب بالا جلد دوم صفحہ ۲۵۷۔

عـه۲ - فریمین -

عـه۳ مضمون برکیاویلی -

ان شہروں کے اندرونی ارتقا کی طرف جب ہم توجہ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انھیں جس حد تک بھی حکومت خود اختیاری حاصل تھی ابتدا میں وہ نظم و نسق چند اشخاص کے ہاتھوں میں تھا اور بعض نہایت ہی اہم فیصلے قوم کی جمعیت عام کے سامنے محض منظوری یا نامنظوری کے لیئے پیش ہوا کرتے تھے۔ عام شہری جو قدیم یونان میں مجلس "اگورا" میں اور ازمنۂ وسطی کے اطالیہ میں مجلس "پارلامنتو" میں جمع ہوتے تھے وہ چند سر برآوردہ خاندانوں کی حکمرانی پر راضی رہتے تھے۔ اس کے بعد امرا اور قوم میں اختلافات برپا ہوئے اور پھر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ عمومیت کی جانب میلان پیدا ہو چلا۔ ٹسکنی کے شہروں میں یہ صورت سب سے زیادہ دلچسپ ہے، کیونکہ ازمنۂ وسطی کے طرز کے شہروں کے نشو و نما کے متعلق ان شہروں کی اندرونی تاریخ سے شمال اطالیہ کے اکثر و بیشتر شہروں کی بہ نسبت زیادہ مکمل معلومات حاصل ہوتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان شہروں میں جمہورانہ خود مختاری زیادہ مدت تک قائم رہی، لیکن لمبارڈی کے شہروں میں بھی ایسا ہی ہوا۔ اگرچہ اس کی ترقی اس سے کم رہی۔ حدود شہریت میں وسعت دینے کے اس میلان کو خود مختارانہ جماعت کی حیثیت سے یونان کی شہری مملکتوں کی تاریخ کے موخر دور کے مثل قرار دے سکتے ہیں۔ مزید براں، جب زیادہ عمومی حکومت کی تحریک کو ترقی ہونے لگی تو تقرر عہدہ جات کے لیئے قرعے کا استعمال ازمنۂ وسطی کے اطالیہ میں بھی اسی طرح رائج ہو گیا جس طرح قدیم یونان میں رائج تھا اور آخر میں ان دونوں صورتوں میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بدنظمی اور فرقہ بندی کے تانون میں حکمرانی کے ایک ہی شخص کے ہاتھ میں چلے جانے کا موقع پیدا ہو جاتا تھا، جمہوری زندگی کا کچھ زمانہ گزرنے کے بعد یہ میلان زیادہ قوی ہو جاتا تھا جس کی وجہ کچھ تو یہ تھی کہ لوگ جمہوری فرقہ بندیوں سے تھک جاتے تھے اور کچھ وجہ وہ تھی جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ تمدن کے ترقی کے طور پر بذات خاص فوجی خدمت انجام دینے کی طرف سے بتدریج تنفر پیدا ہو جاتا تھا، اور اسکا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اجیر سپاہیوں سے کام لیا جانے لگتا تھا۔

اس موازنے کو اگر مخصوص مملکتوں تک وسعت دی جائے تو ہم ایتھنز اور فلورنس کو ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کر سکتے ہیں، یونانی شہری مملکتوں کے سرگروہ ایتھنز نے

قدیم یونان کے (علوم و فنون) کی عام ترقی میں جو درخشاں حیثیت حاصل کر لی تھی وہ اُس تابناک منزلت کے بالکل مشابہ تھی جو ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ کے علوم و فنون کی ترقی میں فلورنس کو حاصل ہوئی ایتھنز کی طرح عمومیت کی تحریک میں بھی فلورنس نے مقدم حصہ لیا، یہ عمومیت ازمنۂ وسطیٰ کے منتظم اہل حرفہ کی وہ تنظیم تھی جسے ہم تیرھویں صدی کے نصف آخر اور چودھویں صدی میں اطالوی جمہوریتوں میں دیکھتے ہیں۔ ایسے ہی نتیجہ خیز طور پر ہم وینس کے ادارات کا مقابلہ اسپارٹا کے ادارات سے کر سکتے ہیں جس طرح وینس ازمنۂ وسطیٰ و جدید کی اطالیہ کی نہایت نمایاں و مستحکم عدیدیت تھی اسی طرح حال قدیم یونان میں اسپارٹا کا تھا (بشرطیکہ ہم لفظ اسپارٹی کا انطباق صرف معدودے چند حکمراں افراد پر کریں علہ) وینس کے ڈوج کے اختیارات کا مقابلہ جو تشدد آمیز اور حاسدانہ انداز سے روز بروز زیادہ محدود ہوتے جارہے تھے، اسپارٹی بادشاہوں کے روبہ تنزل اقتدارات سے کیا جا سکتا ہے۔ دوسری جانب اسپارٹا میں ایفوروں کے اختیار کی ترقی اور اس کے ساتھ ہی ان کے خفیہ طریق کار اور دہشت انگیز سزائے موت کا مقابلہ وینس کی "مجلس عشرہ" کا اور آخر الامر تین محتسبوں کے تقرر و قیام سے کیا جا سکتا ہے۔

۲- بہر حال یہ تشابہات حیرت انگیز ہیں مختصر الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں خارجی تعلقات کے لحاظ سے خود مختاری کی یہ کیفیت تھی کہ خود شہر کے اندرونی اتحاد اور دوسرے شہروں کے ساتھ اس کے قلیل القیام یا اثر اتفاق کے وسیلے سے کامیاب طور پر اس خود مختاری کی حفاظت ہوتی رہتی تھی، اور جب نا اتفاقی اور فرقہ بندی پھیل جاتی تھی (جس سے مختلف شہر باہم متفق ہو ہو کر علیحدہ ہو جاتے تھے) تو پھر خود مختاری پر زوال آجاتا تھا، اور ان دونوں صورتوں میں (اس خود مختاری کے زوال کے بعد) اندرونی سیاسی نشو و نما کے لحاظ سے ابتدائی عدیدیت عمومیت کی طرف چل نکلتی، اور پھر بادشاہی یا خود سرانہ حکومت کی عام سرگشتگی میں مبتلا ہو جاتی تھی، مگر اس مشابہت کے ایک ایک نقطے میں بہت سے اہم غیر مماثلت کے قیود بھی لگے ہوئے ہیں۔ خود مختاری کے مدارج مختلف ہیں، فرقہ بندیوں کی نوعیت ایک جگہ کچھ، اور دوسری جگہ کچھ اور ہے اطالیہ

علہ ملاحظہ ہو خطبۂ پنجم۔

میں عدیدیت نسبتاً زیادہ پیچیدہ تھی اور عام شہریوں کے ساتھ اس کا تعلق دوسری ہی طرح کا تھا، بادشاہی جس نے جمہوریانہ آئینی آزادی کو دبا دیا وہ اطالیہ میں نسبتاً بہت بڑی حد تک باضابطہ انتخاب سے منضبط ہوتی تھی، اور عام خیال میں اسے جائز و درست سمجھا جاتا تھا، اور اگر ہم باشندوں کی تعداد کا نہیں بلکہ آزاد اشخاص کی تعداد کا لحاظ کریں تو اس صورت میں اطالوی عمومیت نسبتاً زیادہ جانبدارانہ تھی کیونکہ اس میں کبھی بھی بااثر طور پر شہر کے تمام اصلی باشندے شامل نہیں کئے گئے بلکہ منتظم تجارتوں اور حرفتوں کی ایک خاص تعداد اس میں داخل تھی، اس کا نشوونما بھی نسبتاً زیادہ ناکمل رہا کیونکہ اطالوی عامۃ الناس نے کبھی بھی یونانیوں کے مانند واقعاً حکمرانی کی کوشش نہیں کی۔ بقول فریمین، بعد کے زمانے میں تو پارلامنتوں کی طلبی بالعموم اس لئے ہوا کرتی تھی کہ "وہ خود اپنے اختیارات کے خلاف رائے دیا کریں" آخری امر یہ ہے کہ ازمنۂ وسطی کی عمومی تحریک ایک خاص نقطے پر پہنچکر رک گئی تھی، منتظم اہل حرفہ اپنے سرمائے کے وسیلے سے عدیدی بن گئے تھے، اور جہاں کہیں دستور مطلق العنانی کے تحت میں نہیں آگیا تھا وہاں آخری درجے میں کمل دستور سلطنت کا میلان قطعی طور پر عدیدیت کی طرف ہو جاتا تھا۔

ہم ان میں سے اب ہر ایک امر پر مختصراً بحث کرتے ہیں، پہلے دو امور ملے جلے ہوئے ہیں، کیونکہ جن حالات کی وجہ سے اطالوی بلدیات کی خودمختاری یونانی شہروں کی بہ نسبت پست ہو گئی تھی انہیں وجوہ سے (جس زمانہ میں فرقہ بندیوں میں سب سے زیادہ شدت و مضرت پائی جاتی تھی) ان کی مروجہ فرقہ بندیاں بھی حقیقی طور پر مختلف النوع ہو گئی تھیں۔ درحقیقت اطالوی شہروں کی خودمختاری کی عدم تکمیل کا کوئی نمایاں اظہار اس امر واقعہ سے بڑھ کر ذہن میں نہیں آتا کہ گوئلف اور گبلین کے ان مناقشات میں جو تیرھویں اور چودھویں صدیوں میں خود شہروں کے اندر اور مختلف شہروں کے درمیان برپا تھے، جن مقاصد کا نام لیکر یہ دونوں فرقے آپس میں لڑتے تھے، ان مقاصد کو ان جماعتوں کی انفرادی سیاسی زندگی سے اس قدر بعید ہو، لیکن یونانی تاریخ میں اسی کے مشابہ دور میں جبکہ کچھ شہری اپنے مخالف شہریوں کو برابر قتل کرتے اور شہر سے نکالتے رہتے تھے اور یہ خارج البلد اشخاص اپنے وطن آبائی کے خلاف جنگ کرتے یہاں تک کہ اس کے موروثی دشمنوں کے ساتھ ہو کر اس سے لڑتے، اس وقت جن اغراض

دمقاصد یہ بازی لگی ہوئی تھی وہ مسلمہ طور پر سیاسی دستور کے اساسی اصول تھے یعنی یہ کہ عددیت کو غلبہ ہونا چاہئے یا عمومیت کو لیکن اطالیہ کی فریقانہ جنگوں میں جن ناموں کے تحت میں یہ فریق لڑتے تھے، وہ دو جرمانی ڈیوکون کے خاندان کے نام تھے جو شہنشاہی تاج کے رقیبانہ دعویدار تھے، اوران کے دعاوی کی وجہ سے جرمنی میں بارھویں صدی کے ربع ثانی ہی میں خانہ جنگی شروع ہوچکی تھی۔ ان میں سے ایک تو ولفیا گوئلف کا خاندان تھا جس کی ایک شاخ خود انگریزوں کا شاہی خاندان ہے۔ اور دوسرا ہوہنشٹاؤفن کا خاندان تھا جس کے وائب لنگن نامی قلعے کے نام سے گبلین کا نام بنا یا گیا تھا یہ صحیح ہے کہ اس تنازعے کی یہ خالص جرمانی خصوصیت حقیقی ہونے کے بجائے زیادہ تر مجازی تھی۔ اطالیوں کو جس امر سے دلچسپی تھی وہ یہ بات تھی کہ شہنشاہ تقریباً ہمیشہ خاندان ہوہنشٹاؤفن سے ہوا کرتا تھا، (۱۱۳۸ء سے ۱۲۵۴ء تک تو ایسا ہی ہوتا آیا۔ اور اس کے بعد ایک مختصر وقفے کے سوا اطالیوں کے لئے شہنشاہی فی الواقع بالکل ناقابل لحاظ ہوگئی تھی) دوسری طرف، پوپ تقریباً ہمیشہ گوئلف کے دعووں کی تائید کرتا رہتا تھا۔ پس یہ فرقہ بندیاں شہنشاہی دپاپائی بھی جاتی تھیں، لیکن پھر اس سے بجائے خود یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلاد اطالیہ کس کامل حد تک اپنی حیثیت کو ایک وسیع تر سیاسی مجموعے کا جزو سمجھتے تھے جو جرمانی بادشاہی اور رومانی کلیسا کے اس خاص اتحاد کی وجہ سے قائم ہوگیا تھا جس سے مقدس رومانی شہنشاہی ظہور پذیر ہوئی۔ یہ کہنا بھی پوری طرح صحیح نہ ہوگا کہ چونکہ شہروں کی آزادی کو پوپ کی طرف سے نہیں بلکہ شہنشاہوں کی طرف سے خطرہ پیش رہا کرتا تھا، اس لئے فریق گوئلف فی الحقیقت خود مختاری کے لئے لڑ رہا تھا بیشک کشمکش کے آخری حصے میں ایک حد تک یہ صحیح تھا مگر صرف ایک حد ہی تک صحیح تھا چنانچہ ہم ایک طرف یہ دیکھتے ہیں کہ پاپائی ریاستوں کے اندر جب مسند نشینان پاپائیت نے یہ کوشش کی کہ وہ اپنے اقتدار اعلےٰ کو حقیقی اقتدار بنادیں تو وہ جلدی آزادی کے دوست نہیں رہے بلکہ دشمن ہوگئے۔ دوسری طرف ان حدود سے خارج پیزا وغیرہ بعض ایسے شہر تھے جو اپنی جمہورانہ خود مختاری کے روایات پر بھی فخر کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی شہنشاہی معاملے کے متعلق اپنی روایتی وفاداری پر بھی نازاں تھے۔

اس کے ساتھ ہی ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی فریقوں اور قدیم یونانی فریقوں کی

جنگ وجدل میں درحقیقت اس سے زیادہ مشابہت موجود ہے جتنی بادی النظر میں معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اگرچہ تمام طویل المدت فرقوں کی شعار اعلائی میں ایک مخلوط و تغیر پذیر مفہوم ہوا کرتا تھا، اور مذکورۂ بالا نام بھی اس سے مستثنے نہیں تھے، تاہم ایک معقول حد تک یہ صحیح ہے کہ شہروں کے اندر گبلین جاگیری عنصر کے اور گوئلف حرفتی عنصر کے نمایندے تھے۔ کلیتہً ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ امرا کے متعدد خاندان گوئلف کے جانبدار تھے مگر ایک معقول حد تک ایسا تھا۔

۲- اس سے مجھے اپنے تیسرے نقطۂ تقابل کی طرف رہبری ہوتی ہے، یعنی قدیم یونانی عدیدیت اور ازمنۂ وسطیٰ کی اطالوی شہری عدیدیت کے درمیان جو فرق ہے وہ اس سے ظاہر ہو جاتا ہے، اطالوی شہروں میں دو ممیز متخاصم و متصادم اجزا موجود تھے، جن میں ہر ایک کی نسبت "عدیدیت" و "عمومیت" کے مانوس تضاد کا استعمال ہو سکتا ہے اور درحقیقت اس وقت میں واقعتاً اس کا استعمال ہوتا بھی تھا۔ اولاً تو جاگیری امرا (یعنی فوجی خصائل سے متصف زمیندار جو اپنی شہری زندگی میں بھی ان خصائل کو اپنے ساتھ لائے تھے) اور ان لوگوں میں مخاصمت تھی جو تجارت میں مشغول تھے اور خوش باش شہریوں میں بہت بڑی کثرت انھیں کی تھی۔ ثانیاً یہ کہ ایک طرف اہل تجارت و اہل پیشہ کا وہ عنصر تھا جس نے اس قسم کی گروہ بندیاں کر لی تھیں جنھیں فلورنس میں "فنون اعلے" کہتے تھے اور دوسری جانب وہ حرفتی گروہ تھے جو معاشری معیار میں ان سے پست تر درجے میں تھے، ان دونوں کے درمیان بھی تفریق و کشمکش تھی۔

لیکن یونانی شہروں کی تاریخ میں یہ دُہرا تضاد صاف طور پر نمایاں نہیں ہوا تھا، اس میں شک نہیں کہ آزاد یونان کے دور آخر میں عدیدیت جہاں تک باقی رہی تھی، اس نے کسی حد تک اپنی خصوصیت کو بدل لیا تھا، اس دور آخر میں عدیدیت انھیں قدیم خاندانوں تک محدود نہیں رہی تھی، جنھیں نہ صرف دولت کا ورثہ ملتا تھا بلکہ وہ آبائی حقوق اور آبائی قابلیت کے بھی وارث ہوا کرتے تھے، اب عدیدیت کا میلان دولت کی عدیدیت یعنی خالص اغنیا نیت کی طرف ہو گیا تھا تاہم کہیں بھی یہ دیکھنے میں نہیں آتا کہ جو رشک و حسد اور مناقشات قدیم خاندانوں اور نو دولتوں کے درمیان موجود تھے اس کا اظہار کسی پر زور و نمایاں طریقے پر سیاسی واردات

وقوانین میں ہوتا رہو، مثلاً جب ساتویں صدی قبل مسیح میں میگارا میں عمومیت کی جانب رجحان پیدا ہوا تو اگرچہ میگارا ایک تجارتی و استعماری سلطنت رہ چکا تھا، پھر بھی (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) اس نے عدیدیت کے خلاف جس وجہ سے مقاومت کی وہ یہی وجہ تھی کہ دولت مند زمیندار کاشتکاروں پر ظلم وستم کرتے تھے عله۔

مگر اطالوی شہروں میں یہ دُہرا تضاد بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے، بہ حیثیت مجموعی جاگیری اور حرفتی عناصر میں کشمکش پہلے شروع ہوئی اور اس کے بعد مرفہ الحال آبادی Popalare grasse اور منظم اہل حرفہ وعمال میں کشاکش ہوئی۔ تاہم ایک حد تک دونوں ایک دوسرے میں شامل ہیں اس دوسری کشاکش نے شمال اسپین کے غیر شہروں میں (جن سے نہیں آخری خطبے میں بالتخصیص تعلق رہا تھا) نسبتاً کم ترقی کی تھی کیونکہ یہ شہر عام طور پر خود سرانہ حکومت کے زیر اثر آگئے تھے مگر شکنی کے ہر اور شہر فلورنس کی تاریخ میں اس کا اظہار پوری طرح سے ہوا، اور میں اب اسی کی طرف متوجہ ہوا چاہتا ہوں

آخر میں مجھے ازمنۂ وسطی کے اطالیہ کی مطلق العنانی اور قدیم یونان کی خودسری کے متعلق ایک بات کہنی ہے۔ ان دونوں کے اختیار یا اس اختیار کے طریق حصول بلکہ ان حالات تک میں جن سے اس کی تائید ہوتی تھی، اتنا زیادہ نمایاں فرق نہیں پایا جاتا جتنا ان دونوں کی شکلوں میں فرق پایا جاتا ہے تقریباً تمام صورتوں میں یونان کے خودسروں کا آغاز وانجام غیر آئینی طرز پر ہوا جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یونانی شہروں نے برضا ورغبت کسی امیر کی حین حیات حکمرانی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ چہ جائے کہ وہ موروثی حکمرانی کے مطیع ہو جاتے، تاریخی طور پر جن حالات کا علم ہے، ان میں تو کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہوتا۔ اسکے برخلاف تیرھویں صدی کے آخر میں جب لمبارڈی کے شہر مطلق العنان حکمرانوں کے تحت میں آئے تو (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ان کا کم از کم رسمی انتخاب ضرور عمل میں آیا تھا، اطالوی شہروں میں بادشاہی کی اس بڑھی ہوئی آئینی نوعیت اور اس کے قبول کرنے اور اس پر رضامند ہونے کا مزید میلان کسی حد تک اردگرد کے اقطاع ملک کے حالات کے اثر سے ہوا، کیوں کہ اطالوی ان اقطاع ملک پر شہنشاہی کی باضابطہ فوقیت کو تسلیم

عله۔ خطبۂ ششم وضمیمہ نوٹ سوم۔

کرتے تھے، اور وہ ان پر اس حقارت کے ساتھ نظر نہیں ڈال سکتے تھے جس حقارت کے ساتھ یونانی، ایران کی بربری بادشاہی پر نظر ڈالتے تھے۔ وہ اپنے ہر طرف ایسے شہر دیکھتے تھے جن کی تہذیب انھیں کے مثل تھی اور جو شہزادوں اور دوسرے امیروں کے تحت میں تھے، اور اگر انھیں بھی قسمت سے ایسی ہی حکمرانی سے سابقہ پڑ جاتا تو یہ انھیں اس قدر غیر طبعی و ناگوار نہیں معلوم ہوتی تھی جس قدر یونانیوں کے سیاسی احساس پر اس کا اثر پڑتا تھا۔ درحقیقت اطالوی شہروں میں سب سے زیادہ آزاد شہروں (یہاں تک کہ فلورنس تک کو) غیر ملکی خطرات کے نازک اوقات میں اسی میں مصلحت نظر آتی تھی کہ اپنے شہر کی امارت کسی بادشاہ یا شہزادے کو دیدیں۔ اگرچہ ایسا کرتے ہوئے وہ یہ فکر رکھتے تھے کہ اندرونی معاملات میں معتدبہ حد تک حکومت خود اختیاری قائم و برقرار رکھیں۔

ہم کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ تیرھویں صدی کے بعد سے بارود کے رواج کے وقت تک سواروں کی مسلح فوج کی روز افزوں فوقیت اور جنگ میں اجیر سپاہیوں سے اس حد تک کام لینے کی ترقی جس کی کوئی نظیر یونان میں نہیں ملتی یہ دونوں امور اطالوی خودسری کے حق میں سودمند ثابت ہو رہے تھے۔ پس اطالوی جمہوری زندگی جس مطلق العنانی کی حالت میں جا پڑی تھی وہ یونان کے موخر زمانے کے خودسروں کی حالت سے زیادہ مشابہت رکھتی ہے، اس کا مخصوص فرق یہ ہے کہ اس کی ابتدا اور اس کی نوعیت اگر تمام حالات میں نہیں تو اکثر حالات میں زیادہ قانونی طرز پر ہوتی تھی، یہ خودسری اکثر اس اختیار سے ترقی کر کے پیدا ہو جاتی تھی جو غیر ملکی یا خانگی دشمنوں کے خلاف مزید طاقت کے حصول کی خواہش سے بظاہر شہر کی حقیقی رضامندی سے عطا کیا جاتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اطالوی شہروں کے نسبتاً زیادہ عمومی آغاز ہی کا یہ باعث تھا کہ ان کے نشو و نما میں اس قدر کم امور ایسے ملتے ہیں جو یونان کے قدیم تر زمانے کے خودسروں سے مشابہت رکھتے ہوں شہر کا حرفتی عنصر جو اپنی تجارتی شرکتوں میں منظم و مرتب ہو گیا تھا، وہ اس تحریک کی ابتدا ہی سے سیاسی حیثیت سے آزمودہ کار معلوم ہوتا ہے۔ یہ ان عمومی سرگروہوں کے لئے جو اپنے کو خودسر بنا لینے کے درپے رہتے تھے، وہ موقع نہیں پیدا ہونے دیتا تھا جو ابتدائی عمومی تحریکات سے یونانی ملکتوں میں پیدا ہو جاتا تھا۔

خطبۂ بستم

بلاد ازمنۂ وسطیٰ فلورنس

۱۔ اب ہمیں فلورنس کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے، جسے ہم اطالوی شہروں میں عمومیت کی تحریک کا ایک نمونہ قرار دے سکتے ہیں، عمومیت سے مراد منظم تجارتوں اور حرفتوں کی وہ عمومیت ہے جو ازمنۂ وسطیٰ میں رائج تھی (جیساکہ میں کہہ چکا ہوں) فلورنس اور عام طور پر ٹسکنیی کے شہروں کی موثر خود مختاری کا آغاز شمال کوہ ایپےنین کے شہروں کے بعد ہوا ہے جس کی وجہ ٹسکنیی کی امارت مارکوئسی کی قوی تر حکومت تھی، مگر یہ خود مختاری زیادہ دیرپا رہی جب لمبارڈی کے قریب قریب تمام شہر مطلق العنانہ حکومت کے تحت میں آگئے تھے، اس کے مدتوں بعد تک فلورنس اپنے جمہورانہ دستور کو ترقی دیتا اور اپنے خصائص کا کامل تر اظہار کرتا رہا، اس ارتقا کے دوران میں بلدی دستور بے انتہا پیچیدہ ہوگیا تھا، تغیرات کے خاص اسباب حسب ذیل نظر آتے ہیں۔

(۱) حکومت کی نت نئے تنظیمات کے ذریعے سے امراء کی بے ضابطگیوں کو دبانے کی مسلسل تجدید، اور (۲) حکومت میں تجارتوں یا صنعتوں کی نمایندگی میں ازدیاد و توسیع جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں اول الذکر خصوصیت اطالیہ کے شہروں کے ساتھ مخصوص ہے، اس کے برخلاف موخرالذکر کا حقیقی رشتہ ازمنۂ وسطیٰ کے شہروں کے عام طور سے ملا ہوا ہے۔

فلورنس کی خود مختاری کا آغاز اگر کسی خاص وقت سے ہوتا ہے تو اس وقت کو کوئی گاؤنٹسل مٹلڈا کے انتقال کے بعد یعنی سنہ ۱۱۱۵ء سے سمجھنا چاہئے (مٹلڈا نے ۱۰۷۶ء سے

ٹسکنی کی امارت پر تنہا حکمرانی کی تھی (۱۱۱۵) اسکے تحت حکومت میں شہر کو اصولی طور پر حکومت خود اختیاری حاصل نہیں تھی مگر عملی طور پر سر برآوردہ خاندانوں کے ارکان عدالتی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ مثلڈا جب موجود ہوتی تو وہ خود اجلاس عدالت کی صدارت کرتی تھی مگر اس کی عدم موجودگی میں فیصلے اکثر شہر کے ججوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دئے جاتے تھے، اور سیاسی و انتظامی مشاغل کی وجہ سے مثلڈا کی عدم موجودگی کچھ کم نہ تھی۔ مزید براں، پوپ اور شہنشاہ کے درمیان جو کشمکش جاری تھی اس میں اگرچہ شہر فلورنس اپنے اعلیٰ جاگیردار یعنی کاونٹس کے ساتھ ہو کر پوپ کا جانبدار بن گیا تھا، مگر گرد و نواح کے جاگیردار امرا جو یہ سمجھتے تھے کہ انکے جاگیردار اعلےٰ نے انھیں ستا رکھا ہے، وہ زیادہ تر شہنشاہ کی جانب میں تھے بدیں وجہ امرائے دیہات کے ساتھ شہروں کی جس کشمکش کو ہم لمبارڈی کے شہروں کے حال میں دیکھ چکے ہیں، اس کا آغاز فلورنس میں کسی قسم کی بلدی خود مختاری کے آغاز کے قبل ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے خود مختاری کی یہ تقلیب بغیر کسی قسم کے سخت صدمہ کے واقع ہو گئی۔ سر برآوردہ خاندانوں کے ارکان جو پہلے عاملانہ حکومت کو مثلڈا کے نام سے چلاتے رہتے تھے وہی اب اس حکومت کو شہر کے نام سے چلانے لگے۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا کہ یہ حکومت بارہ ارکان پر مشتمل ہو گئی جنھیں قنصل کہتے تھے اور شہر کے چھ محلوں میں سے ہر محلہ سے سالانہ دو دو قنصل منتخب ہوتے تھے۔ یہ لوگ سر برآوردہ شہریوں کے طبقے میں سے ہوتے تھے جن میں زیادہ تر جاگیردار امرا شامل تھے، مگر سوا اس سے زائد افراد کی ایک اور مجلس تھی جو ان کی مدد کرتی تھی، اس مجلس میں اہل صنعت و حرفت بھی داخل تھے، اور بلا شبہہ انھیں کو اس میں غلبہ حاصل تھا۔ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس مجلس میں ان منتظم تجارتوں کے نمایندے بھی شامل تھے جو بعد میں "فنون اعلےٰ" کے نام سے مشہور ہوئے یا یہ کہ ان میں سے بعض تجارتوں کے ارکان داخل تھے، کیونکہ بارھویں صدی کے ربع آخر میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صناعوں کے سر گروہ اس قابل سمجھے گئے تھے کہ شہر نے جن معاہدات پر دستخط کئے تھے ان میں ان لوگوں کو بھی حسب ضابطہ کچھ تفویض ہوا تھا اور ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس سیاسی اعتراف کے قبل ان کی منتظم ہستی کی مرفہ الحالی کا ایک طویل زمانہ گزر چکا ہو گا۔ درحقیقت یہ معلوم ہوتا ہے، کہ فلورنس کی خارجی حکمت عملی پر اول ہی سے تجارتی اغراض کا اثر قائم ہو گیا تھا۔ بڑے

مواقع کے لئے "پارلامنتو" بھی تھی، مگر اس کا اجلاس محض ضابطہ کے طور پر ہوتا تھا، اور چونکہ اس کا انعقاد اکثر کسی معمولی وسعت کے چوک یا کسی گرجا میں ہوتا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عام شہریوں کو حکومتی فیصلوں میں کوئی موثر شرکت حاصل نہیں تھی۔

۲- اس حد تک امرا اور حرفتی عناصر میں کسی قسم کا عناد نہیں پایا جاتا، مگر ۱۱۲۹ء کے بعد سے ہم یہ پڑھتے ہیں کہ قرب و جوار کے قصر منہدم کر دیئے گئے، اور ان قصروں کے امرا کو شہر کے اندر رہنے پر مجبور کیا گیا۔ اور اس طرح شہر میں جاگیری عنصر کا اضافہ ہوتا گیا۔

اس کے بعد بارھویں صدی کے آخری نصف حصہ میں فریڈرک باربروسہ (سرخ ریش) سے کشاکش واقع ہوئی جس نے فلورنس اور دوسرے شہروں میں پودستا کا تقرر کیا تھا، مگر یہ شہنشاہی نظم جو کبھی بھی زیادہ زوردار نہیں ہوا تھا اس صدی کے آخر میں درہم برہم ہوگیا، بااین ہمہ، کسی غیر ملکی امیر کے پودستا یا حکومت کے سرگروہ کے طور پر سالانہ مقرر کئے جانے کی مخصوص تنظیم لمبارڈی کی طرح یہاں بھی رائج ہوگئی" اور اس کے بعد ہی بہت جلد (۱۲۱۳ء میں) اس تنظیم نے قنصلوں کو پست کر دیا، اور ان کی حیثیت پودستا کی مجلس خاص کی سی ہوگئی۔ یہاں اس تغیر کی وجہ ایک حد تک یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں فلورنس نے (امرا کے) قصروں اور ارد گرد کے شہروں کے ساتھ جو جنگ جاری کر رکھی تھی اس کے لئے ایک واحد حکمراں کی اعلیٰ قابلیت کا احساس پیدا ہوگیا تھا۔ اگرچہ غیر ملکی شخص کے انتخاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جو ضرورت لمبارڈی میں محسوس ہوئی تھی وہی یہاں بھی موجود تھی یعنی امرا کی بے ضابطگیوں کے دبانے کے لئے کسی بے لوث اجنبی کی حاجت تھی۔ بہر نوع تیرھویں صدی کے نصف اول میں امرا کے درمیان مشاجرات برپا ہوگئے۔ اور یہ مشاجرات بہت جلد گوئلف اور گبلین کے عام مناقشے میں محو ہوگئے۔ امرا میں گوئلف بھی تھے۔ اور گبلین بھی تھے، مگر قدیم خاندان تقریباً سب کے سب گبلین تھے، اور حرفتی عنصر اور منظم اہل حرفہ زیادہ تر یوپ کی حمایت کرتے تھے۔

اب امرا اور اہل حرفہ کا عناد بڑھ چلا، اور سنہ ۱۲۵۰ء میں عامۃ الناس نے اپنے ایک قائد عوام Capitans popolo کے تحت میں اپنی جداگانہ فوجی و سیاسی تنظیم قائم کرلی۔ اس تنظیم کا مقصد یہ تھا کہ امرا کی بے ضابطہ زیادتیوں کو موثر طور پر دبایا جاسکے۔ چھ محلے کمپنیوں میں منقسم کر دئے گئے جن کی کل تعداد بیس تھی، اور ہر ایک کمپنی کا ایک علم تھا۔

تاکہ جب قائد عوام "برج اسد" پر بڑا گھنٹہ بجائے تو کل قوم فوجی ترتیب میں مرتب ہو کر یکجا ہو سکے۔

گبلین فریق کے عارضی غلبے کے دوران میں یہ انتظام جلد معطل کر دیا گیا، مگر ۱۲۶۷ء میں کچھ ترمیمات کے ساتھ اس کی پھر تجدید کی گئی۔ اس کا نتیجہ ایک نہایت ہی پیچیدہ دستور بلدی کی صورت میں ظاہر ہوا، کیونکہ حکومت عمومی کی جانب فلورنس کی تحریک کا اصل الاصول یہ تھا کہ اہم فرائض کا بیشتر حصہ موجود الوقت حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ اور عام اغراض کے بہتر تحفظ کے لئے ایک نئی تنظیم کا اس پر اور اضافہ کر دیا جائے۔ پس اس طرح ۱۲۶۷ء کے بعد سے حسب ذیل بلدی دستور قائم ہوا۔ اولاً یہ کہ حسب سابق ایک پودستا تھا (جس کا انتخاب سال بسال غیر ملکی امرائیں سے ہوا کرتا تھا) اور اس کے ساتھ نوے اشخاص کی ایک مجلس خاص اور ایک اس سے بڑی مجلس تین سو شخصوں کی ہوا کرتی تھی۔ یہ مجلسیں امرا اور عوام دونوں سے مرکب ہوتی تھیں، مگر انتظامی کاموں کے معمولی انجام دہی کے لئے بارہ شخصوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جنھیں اشخاص نیک (Buoni Uomini) کا لقب دیا جاتا تھا، اس میں ہر محلہ سے دو شخص ہوا کرتے تھے۔ ان کا انتخاب عام قوم میں سے ہوتا تھا، اور سو شخصوں کی ایک مجلس انھیں مشورہ دیتی تھی، اور اس کا انتخاب بھی عام قوم ہی میں سے ہوتا تھا، اس کے بعد قائد عوام ہوتا تھا۔ اور وہ بھی پودستا کی طرح کوئی غیر ملکی امیر ہوتا تھا جس کا انتخاب کسی گوئلف قصبے سے ہوتا تھا، اس کی بھی خاص و عام مجلسیں ہوتی تھیں وہ شہر کی فوج محافظ کی سرداری کرتا تھا، یہ پیدل فوج عام اشخاص کی کمپنیوں سے مرتب ہوتی تھی پودستا خارجی معاملات میں جمہوریت کا خاص نمایندہ ہوتا تھا، اور اکثر کل فوج کا سپہ سالار اعظم بھی وہی ہوتا تھا، مگر زیادہ تر وہ سوار دل کا سپہ سالار ہوتا تھا، جو تقریباً تمام تر امرا اور دوسرے پیشہ ور سپاہیوں سے مرکب ہوتی تھی[عله]۔ پودستا دیوانی و فوجداری کی عام عدالت کا

عله - ایک طرف ۱۲۵۰ء کے بعد سے شہر کی زندگی میں حرفتی عنصر کا غلبہ قوی ہوتا جاتا تھا۔ اور سیاسی تنظیم میں اس کا اظہار یوماً فیوماً زیادہ ہوتا تھا، دوسری طرف سوارہ فوج کی ترقی یافتہ گراں سلاحی کی وجہ سے جاگیری عنصر کا فوجی غلبہ بڑھتا جاتا تھا، جیسا کہ ۱۲۶۰ء کی جنگ مونتاپرتی سے ثابت ہوا۔ اس سے جنگ میں اجیر سپاہیوں سے کام لینے کی ترقی ہوئی، امرا کے خاندانوں کے لڑکے چند مہ کے سردار بننے اور جنگ کے نئے

صدر ہوتا تھا، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں کہ قائد عوام کا خاص فرض یہ ہوتا تھا کہ جو امرا عوام کے خلاف زیادتیوں کا ارتکاب کریں انھیں رد کرے۔

نتیجہ اس کا یہ تھا کہ جس کارروائی کے لئے تمام صاحبتی جماعات کے اتفاق رائے کی ضرورت تھی اس میں عجیب پیچیدگی پڑجاتی تھی یا وہ جو کارروائی تجویز کرتے تھے اس پر (۱) مجلس صدر (۲) قائد کی مجلس خاص (۳) قائد کی مجلس عام (بالعموم ایک دن میں) (اور دوسرے دن) (۴) پودستا کی مجلس خاص اور (۵) اس کی مجلس عام کی رائے لی جاتی تھی۔ نامناسب تاخیرات کے روکنے کے لئے تقریریں نہایت سختی کے ساتھ محدود کردی گئی تھیں، اور یہ بھی ایک وجہ ہے، کہ فلورنس، اور درحقیقت تمام ہی اطالیہ میں خطابت کو شاندار ترقی کبھی حاصل نہیں ہوئی۔

۳۔ مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ فلورنس کی حکومت جو اس طرح پر قائم ہوئی تھی اس کا تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہم حاوی و غالب گوئلف فریق اور تجارتوں یا صنعتوں کے انتظام کا بھی اندازہ نہ کرلیں۔

ان میں سے اول الذکر کی کیفیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں چھ سرداران فریق گوئلف مقرر کئے گئے تھے اور ان کے ساتھ بھی خاص و عام مجلسیں تھیں اور ان کا کام یہ تھا کہ حامیان شہنشاہ کی جائدادوں کی ضبطی سے حامی پوپ فریق کو جو سرمایہ حاصل ہو گیا تھا اس کا انتظام کریں۔ یہ لوگ بتدریج بعض امرا کے لئے باقاعدہ حکومت کے عضو ہو گئے، اور یہ تو فرض کرلیا گیا تھا کہ حامی پوپ فریق ہمیشہ برسراقتدار رہے گا۔ باقاعدہ حکومت کے اندر فریقانہ تنظیم کا اس طرح داخل کیا جانا آخری دور ازمنۂ وسطی کے سیاسی دستور کا ایک ایسا قابل لحاظ وصف ہے جس کی تقلید زمانۂ جدید کی کسی مملکت نے ابتک نہیں کی ہے، مثلاً انگلستان میں ۱۷۱۴ء سے ۱۷۶۱ء تک یہ ایک مسلمہ عقیدہ تھا کہ وھگ فریق ہمیشہ برسراقتدار رہے گا، مگر دستور مملکت نے کسی نوعیت سے وھگ فریق کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ فلورنس کے فریقوں کا ذکر کرتے ہوئے ابھی ابھی یہ بیان کرچکا ہوں کہ گوئلف اور گبلین جماعت کی کشمکش امرا اور عوام کی کشمکش سے کلیۃً مماثل نہیں تھی، اگرچہ دونوں کی بعض کارروائیوں میں مماثلت بھی پائی جاتی ہے۔ امرا کے قدیم خاندان تقریباً سب گبلین تھے اور گوئلف فریق کی قوت اہل صنعت کی تائید پر منحصر تھی مگر امرا میں جس طرح گبلین تھے

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ فن میں شہرت حاصل کرنے لگے۔ اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، خودسری حکومت کے لئے یہ ایک بار دگر منبع بن گیا۔

ویسے ہی گونفلف بھی تھے اور در حقیقت فرلق گونفلف کے چھ قائدوں میں سے تین قائدامرائیں سے اور تین عوام میں سے ہوتے تھے۔ بعد میں ان کا خود ایک محل بن گیا، اور جیساکہ میں کہہ چکا ہوں انھیں بعض سرکاری فرائض بھی تفویض ہو گئے جن میں سے خاص فرض گبلین گروہ کی دار و گیر کا تھا، اور جیساکہ ہم دیکھیں گے بعد میں اس فرض کو حکومت کی نوعیت کے تعین میں فیصلہ کن اہمیت حاصل ہو گئی۔

۴۔ مگر تجارتوں اور صنعتوں کی تنظیم اور بھی زیادہ اہم ہے در حقیقت یہی وہ محور تھا جس پر ۱۲۶۶ء کا دستور چکر لگاتا تھا، اور چونکہ یہی تنظیم اور شہر کی حکومت میں اس کی نمایندگی وہ شے ہے جس سے شہروں کی ازمنۂ وسطی کی ساخت و کیفیت اول اول صاف طور پر نمایاں ہوتی ہے اس لیئے میں اس پر ذرا زیادہ وسعت کے ساتھ بحث کرونگا۔

حرفتی انجمنیں جنھیں اطالیہ میں آرتی Arti کہتے تھے ان کی ابتدا جیساکہ ہم دیکھ چکے ہیں، رومانی زمانہ تک پہنچتی تھی، اور اس میں شک نہیں کہ فلورنس میں ان کی کارگر تنظیم ابتدائی زمانے میں ہو چکی تھی۔ ۱۲۶۶ء۔۱۲۶۷ء میں جو کچھ ہوا وہ غالباً اتنا ہی تھا کہ جو نظام مدت دراز سے قائم اور موثر طور پر زیر عمل تھا اسے قانوناً تسلیم کر لیا جائے، اور شاید یہ کہ اس میں نسبتاً زیادہ استقامت و نظم پیدا کر دیا جائے، اور جدید حکومتی ہیئت میں ان حرفتی تنظیمات کو باضابطہ طور پر کوئی اہم جگہ دیدی جائے، خواہ وہ جگہ تحتانی ہی جگہ کیوں نہو۔ ان تجارتی انجمنوں کے خاص خاص حکمراں اعضا اپنے عہدے کے اعتبار سے قائد عوام کی مجلس خاص و مجلس عام دونوں میں نشست کرتے تھے۔

جو فنون اس طرح تسلیم کیئے جاتے تھے، ان کی تعداد سات تھی، اور انھیں "فنون اعلیٰ" کہتے تھے۔ ان میں ایک فن کے اشخاص یعنی "جج اور مختار" دوسروں سے علحدہ تھے، کیونکہ نظر اول میں ان لوگوں کا کام تجارتی کام نہیں معلوم ہوتا تھا لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ اچھے ججوں اور مختاروں کے تقرر کو اطالیہ میں بہت اہم معاملہ سمجھا جاتا تھا کیونکہ تجارتی خوش حالی، تجارتی تنازعات کے فیصلے شخصیہ کے قوانین کی ترتیب، نظر ثانی و نفاذ اور معاہدات کی تحریر وغیرہ سب انھیں لوگوں پر منحصر تھی۔ دوسرے چند فنون وہ تھے جو فلورنس کی غیر ملکی تجارت کی ممتاز شاخوں کی نمایندگی کرتے تھے۔ اس زمانہ میں سب سے اول جگہ غیر ملکی کپڑوں کو نفیس بنانے اور رنگنے Arti Di calimala

اور خانہ ساز کپڑوں کے لین دین Arti della Lana کو حاصل تھی۔ چونکہ اطالیہ کی اُون اول اول ناقص تھی، اور اطالیوں کا ذوق طبیعت بلند تھا اس لئے کپڑوں کو نفیس بنانے اور رنگسازی کے فن کو سب سے پہلے خوشحالی حاصل ہوگئی تھی۔ بعد میں جب خود اطالیہ میں خام مال کو ترقی دینے کی کوششیں کامیاب ہوگئیں تو خانہ ساز اُون کے مصنوعات کو زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی، ان دونوں کے ساتھ ہی ساتھ ساہوکاروں اور صرافوں Arti del cambio کو بھی اول درجہ حاصل تھا اس کے بعد ریشم کے کاروبار کرنے والوں Arti della seta کا درجہ تھا جسے بعد میں زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی۔ اس کے بعد طبیبوں Medici کا درجہ تھا، جو پہلی نظر میں تجارتی طبقہ کی بہ نسبت زیادہ تربیتہ ور طبقہ معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ طبیب طبی مشورہ دینے کے ساتھ ہی ساتھ ادویات وغیرہ کا کاروبار بھی کرتے تھے، اور گرم مصالحہ بیچنے والوں Speziali کے ساتھ مگر یہ شرقی تجارت کی ایک ایسی شاخ کی نمایندگی کرتے تھے جسے غیر اہم نہیں کہہ سکتے اس فہرست کا خاتمہ سمور کے کاروبار کرنے والوں پر ختم ہوتا ہے۔

ان میں سے متعدد انجمنیں ایسی تھیں جن میں اس وقت کی کئی کئی متعلقہ شاخیں داخل تھیں، اور یہی انجمنیں یکجا طور پر شہر کی حرفتی آبادی کے طبعی سرگروہ کی حیثیت سے پیش پیش تھیں، اور اس میں شک نہیں کہ اس وقت میں ادنٰے درجہ کی حرفتیں انھیں کو اپنا سرگروہ سمجھتی تھیں مگر ان ادنٰے درجہ کی حرفتوں نے دوسری نسل کے دوران میں اپنے لئے قانونی تنظیم پیدا کرلی، اور اس کے بعد سیاسی اعتراف حاصل کرلیا، ان اہل حرفہ کے قانون سے یہ فرق صاف طور پر واضح ہوجاتا ہے، ان کے نام حسب ذیل تھے بزاز، موچی، بقال، قصاب، کلال، سرادار، زین ساز، دباغ، زرہ و قفل ساز، معمار، نجار، طباخ وغیرہ وغیرہ یہ پست تر فنون تقریباً سب کے سب اندرون ملک ہی میں اشیا و خدمات کے تبادلہ سے متعلق تھے، اور اس لیئے فنون اعلیٰ کے مقابلے میں ان کے کاروباری اغراض کا حلقہ زیادہ محدود تھا، فنون اعلیٰ کے لوگ ان تجارتوں میں مشغول تھے جن کی وسعت مغرب سے مشرق تک پھیلی ہوئی تھی، اور اس لئے وہ بالطبع شہر کے خارجی سیاسی تعلقات سے واقف ہوگئے تھے، اور ان تعلقات سے انھیں گہرا تعلق ہوگیا تھا، اور یہ تو ظاہر ہے کہ ایک بڑی حد تک وہ ان تعلقات کو تجارتی اصول کے مطابق چلاتے تھے

ان فنون کی تنظیم کا تصور قائم کرنے کے لئے میں ان میں سے اسی فن کو لیتا ہوں جسے اس زمانے میں مقدم حیثیت حاصل تھی یعنی کپڑوں کو نفیس بنانے اور انھیں رنگنے کا فن Arti della calimela ہر چھٹے مہینے انبار خانوں اور دکانوں کے سرگروہ یکجا ہو کر اپنی پسند سے انتخاب کنندگان کا تقرر کرتے تھے۔ یہ انتخاب کنندے چار قنصل منتخب کرتے تھے جو اس حرفت پر حکمراں ہوتے تھے، اور ان کی مدد کے لئے ایک چانسلر، ایک مختار بارہ شخصوں کی ایک خاص مجلس اور ایک اس سے کسی قدر بڑی عام مجلس ہوا کرتی تھی (مختار کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ قوانین کے لفظ بلفظ عملدرآمد پر نظر رکھتا تھا۔ اور اکثر جلسوں میں قنصلوں کی جانب سے تقریریں بھی کیا کرتا تھا) قنصل دکانوں اور انبار خانوں کا معائنہ کرتے۔ اور آمیزش مال کی خرابی، وزن کی کمی، حساب کتاب کی لاپروائی کے لئے جرمانہ کی سزا دیتے تھے اور آخری چارۂ کار کے طور پر ایسے اشخاص کو اہل حرفہ کے زمرے سے خارج کر دیتے تھے۔[1] (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) ۱۲۶۷ء میں سات اعلیٰ فنون کے قناصل باضابطہ طور پر قائد عوام کی مجلس خاص میں شامل کر لئے گئے تھے جسے سرگروہان اہل حرفہ Capetudim delle کہتے تھے۔

۵۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ جس عجیب و پیچیدہ دستور کی تفصیل ابھی ابھی بیان کی گئی ہے اس میں امرا کا حصہ کم ہی کم تھا، اور اس کی مجلسوں میں اہل حرفہ کے سرگروہوں کی اہمیت بلاشک و شبہہ بہت بڑھی ہوئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سیاسی اغراض کے لئے بھی چھوٹے اور بڑے اہل حرفہ بمنزلہ قوم کے تھے لیکن پندرہ برس بعد جب ۱۲۸۲ء میں خاص عاملانہ حکومت چھ اکابر Priori کے ہاتھ میں دیدی گئی جن کا انتخاب دو دو مہینے کے لئے ہوتا تھا، اور چھ اعلیٰ فنون کے ہر فن میں سے ایک شخص لیا جانے لگا تو ان کا غلبہ نمایاں طور پر بڑھ گیا۔ ساتویں حرفہ کے لوگ (یعنی جج اور مختار) اس وجہ سے ساقط کر دئے گئے تھے کہ ان کو اپنے پیشہ کی نوعیت ہی کی وجہ سے کافی سیاسی اثر حاصل تھا، اور (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) مختار ہر حرفہ میں ایک اہم عہدہ دار ہوتا تھا۔ پس اس طرح سب سے

[1] بیرون ملک میں بھی ان کے قناصل ہوتے تھے جن کا کام یہ ہوتا تھا کہ وہ اس حرفہ کے ارکان کے مقاصد پر نظر رکھیں۔ زمانۂ جدید میں قنصلوں کے تقرر کا انتظام سلسلہ بسلسلہ یہیں سے آیا ہے۔

بڑے عاملانہ عہدے پر پہونچنا ان منظم تجارتوں میں سے کسی ایک نہ ایک تجارت کے رکن ہونے پر منحصر ہو گیا جن امرا کو انتخاب کی خواہش ہوتی تھی وہ ان چھ حرفوں میں سے کسی ایک نہ ایک حرفے میں اپنا نام درج کرا لیتے تھے۔

پس اب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک حرفتی عدیدیت باضابطہ قائم ہو گئی تھی مگر اسوقت تک یہ ایک فطری عدیدیت تھی۔ اس وقت تک یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اعلے حرفتوں کے ارکان کے متعلق کسی قسم کی تخلیت کی شکایت پائی جاتی ہو۔ وہ قوم کے طبعی سرگردہ تھے، اور تیرھویں صدی میں تمام چھوٹی بڑی حرفتیں بظاہر امرا کے خلاف بدستور متحد معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی حالت تقریباً ویسی ہی تھی جیسی انگلستان میں انیسویں صدی کے ابتدائی حصہ میں قوانین غلہ کے خلاف جد و جہد میں شہری سرمایہ دار اور اہل حرفہ ذی املاک امرا کی مخالفت میں متحد ہو گئے تھے۔ اس کا اظہار گیارہ برس سے تیرہ برس بعد تک ۱۲۹۳ء سے ۱۲۹۵ء تک میں ہوا جبکہ امرا کا تختہ اور بھی الٹ گیا، اور فلورنس کے نہایت معزز خاندان اکابر کے عہدے کے ناقابل قرار دیدئے گئے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہ اکابر بارہ حرفتوں کے صدروں اور دیگر عقلمند اور نیک چلن "اہل حرفہ" کے ذریعہ سے منتخب ہوتے تھے۔ درحقیقت اس وقت کی عموامانہ تحریک میں بعض چھوٹے درجے کی حرفتوں نے بھی بظاہر نہایت اہم دخل حاصل کر لیا تھا، اور چھوٹے بڑے اکیسوں حرفتوں نے ملکر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس زمانے کی نہایت ہی نمایاں جدت "احکام انصاف" کو جن سے بالتخصیص امرا کے خلاف کام لینا مقصود تھا، برقرار رکھیں گی۔ میں اس پر ایک لمحہ کے لئے توقف کرنا مناسب سمجھتا ہوں کیونکہ اس سے نہایت ہی نمایاں طور پر ان اطالوی شہروں کے مشکلات کا اظہار ہوتا ہے جو امرا کو حفظ قانون و نظم ملک کا پابند بنانے کے ابتدائی مرحلہ کی تکمیل میں سرگرداں تھے، اور ادھر ان امرا کی حالت یہ تھی کہ یورپی تہذیب کے میدان کے عین وسط میں تیرھویں صدی کے آخر تک اتنی کچھ تہذیب و شائستگی پھیل جانے پر بھی ہنوز ویسی ہی کندۂ ناتراش تھے۔

فلورنس میں حرفتی عنصر نے خصوصیت کے ساتھ حقیقی کامل و مرفہ الحال نشو و نما حاصل کر لیا تھا، تقریباً تیس برس تک اسے سیاسی فوقیت بھی میسر رہی تھی، جس کی طمانیت ۱۲۶۶ء میں ہوئی، اور ۱۲۸۲ء میں اس میں اور اضافہ ہوا۔ پودستا و قائد عوام وہاں موجود تھے،

اپنی ذات کی حفاظت کے لئے حریفی عنصر کو منظم کرنے کی ہر طرح کی کوششیں عمل میں آچکی تھیں، مگر ان تمام باتوں کے باوجود وہاں بھی یہ صاف نظر آرہا ہے کہ امرا اپنی دولت، اپنے امتیاز خاص، اپنے خاندانی روابط اور اپنے حشم خدم کی وجہ سے اس قابل بنے ہوئے تھے کہ قانون کے علی الرغم ایسی کارروائیاں کرتے رہیں جو پرامن شہریوں کے لئے ناقابل برداشت ہوجائیں، وہ گواہوں کو ڈراتے دھمکاتے، گرفتار شدہ مجرموں کو چھوڑا لیجاتے اور اسطرح اپنی عادتی زیادتیوں کے لئے فی الواقع سزا سے بالکل مامون تھے، اس کا خاتمہ کرنے کے لئے یہ نئے احکام بنائے گئے تھے اور ان کو عمل میں لانے کے لئے ایک نئی کل بھی تیار کی گئی تھی۔

ان احکام کے اہم خصوصیات حسب ذیل تھے، (۱) خاندانی رفتہ جو بے ضابطگیوں کی پشت پناہی کررہا تھا، اسی کو قانون شکنی کے دبانے کا ایک ذریعہ بنایا گیا۔ اگر کسی امیر خاندان کے کسی رکن سے کوئی جرم سرزد ہوتا تو اس کے رشتہ دار اس کے ذمہ دار بنائے جاتے، (امیر خاندان سے مراد وہ خاندان تھے جن کے ارکان میں سوار زمشاغل ہوں) یہ بھی حکم دیا گیا کہ پندرہ برس سے ستر برس تک کی عمر کے تمام امرا سالانہ پودستا کے سامنے حاضر ہوا کریں، اور اپنی نیک چلنی کی ضمانت دیا کریں۔ چھوٹی چھوٹی زیادتیوں کے لئے ضامن کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اور وہ اس کی تلافی مجرم کے مال و اسباب سے کرلیتا تھا، اگر کسی عام آدمی کو کوئی امیر مار ڈالتا یا مہلک طور پر زخمی کردیتا تو پودستا کا یہ فرض تھا کہ مجرم کا سر اڑا دے، اس کے مکانات ڈھا دے، اور اس کا مال و اسباب ضبط کرلے؛

(۲) مگر سب سے زیادہ تعجب خیز کارروائی ان زیادتیوں کے گواہ فراہم کرنے کی دشواری کو رفع کرنے کے لئے اختیار کی گئی تھی یہ حکم دیدیا گیا تھا کہ کسی امیر کے خلاف جرم کے ثابت کرنے کے لئے عام افواہ (جس کی تصدیق دو ثقہ گواہ کردیں) کافی ہے۔ اس قاعدے کی تائید کرنا دشوار ہے مگر تدارک کی اس سختی سے بدنظمی کی شدت کا ثبوت ملتا ہے۔ اس قاعدے کا نفاذ اس شرط کے ساتھ محدود تھا کہ اگر عوام امرا کے مناقشات میں شرکت کریں گے تو پھر یہ غیر معمولی احکام قابل نفاذ نہ ہوں گے۔

عل بعد میں اس کی تعداد تین کردی گئی۔

نئی کل یہ تھی کہ ایک علمدار انصاف مقرر کیا گیا، ایک ہزار مسلح عوام اس کے تابع حکم ہوتے تھے، اور بعد میں ان کی تعداد چار ہزار تک بڑھادی گئی تھی، ان عوام کا فرض یہ تھا کہ بوقت طلب یا ہنگامے کے موقع پر سینیوریا کے محل (ایوان حکومت) کے گرد جمع ہو جائیں۔ علمدار کا کام یہ تھا کہ وہ پودسٹا کے احکام کی تعمیل میں اس کی تائید کرے۔ یا اگر پودسٹا اور "قائد عوام" اپنے ادائے فرض میں کوتاہی کریں تو وہ خود ان کے عوض کام کرے۔ علمدار اور چھ اکابر سے ملکر سینوریا یعنی "حکومت عاملانہ" بنی تھی۔ اور آخر میں یہی علمدار اس حکومت کا خاص رکن ہوگیا اس کا انتخاب بھی اکابر کی طرح سالانہ ہوتا تھا، اور یہ انتخاب بارہ فنون اور دوسرے اہل حرفہ کے صدر کیا کرتے تھے جو شہر کے مختلف حصوں سے لئے جاتے تھے صرف حرفتوں کے ارکان اس عہدے کے قابل تھے، اور امرا اس سے خارج رکھے گئے تھے خواہ وہ کمپنی میں اپنا نام ہی کیوں نہ درج کرالیں۔

ان درشت احکام سے بھی مقصد فوراً ہی حاصل نہ ہوا، نصف صدی تک امرا ان احکام کے خلاف جد و جہد کرتے رہے، اور چودھویں صدی کے آغاز میں "ابیض" و "سود" کے درمیان جو تنازعہ ہوا اس میں امرا بالکل قدیم طرز پر لڑتے ہوئے نظر آتے ہیں، مگر قوم ان احکام پر ثابت قدم رہی اور ضرور ہے کہ ان سے کوئی معتد بہ نتیجہ نکلا ہوگا۔ یہ احکام اس قدر اہم ثابت ہوئے کہ ۱۳۳۸ء میں روما نے بھی فلورنس سے اس قانون کی ایک نقل کی خواہش کی۔

۶۔ اسی دوران میں ۱۳۲۳ء میں عمال کے انتخاب کے طریقے میں ایک ایسا اہم تغیر واقع ہوا جو ان طلبہ کے لئے خاص طور پر دلچسپ ہے جو ازمنۂ وسطیٰ کے اطالوی نظم دستوری کا قدیم یونانی نظم دستوری سے مقابلہ کرنا چاہتے ہیں، یعنی کسی حد تک قرعہ اندازی کا رواج ہوگیا تھا۔ اس وقت تک اکابر (Priori) اگرچہ ہر دوسرے مہینے بدل جاتے تھے لیکن ان کا انتخاب چھ مہینے کے لئے ہوا کرتا تھا، مگر اس سے یہ خیال پیدا ہوا کہ انتخابات کی بہت کثرت ہو جاتی تھی اور پھر اس پر سازشیں مستزاد، اس لئے یہ قرار پایا کہ ایکدم سے تمام اکابر کا انتخاب بیالیس مہینہ قبل سے کر دیا جایا کرے یعنی اکیس تغیرات کے لئے ایک ہی مرتبہ انتخاب ہو جایا کرے، اور اس کے بعد دو ماہہ میعاد کے لئے تقدم و تاخر کا تعین قرعہ کے ذریعہ سے ہوا کرے، اور جب تک یہ کل تعداد ختم نہ ہو جائے، اس وقت تک کوئی شخص دوبارہ منتخب نہ ہو سکے عموی نقطۂ نظر سے اس میں

یہ بھی فائدہ تھا کہ اس طرح اس عہدے کا دروازہ زیادہ تعداد کے لئے کھل جاتا تھا۔ ساڑھے تین برس کے اندر اکابر کے عہدے پر فی الواقع ۲۶ مختلف اشخاص لازماً فائز ہو چکیں گے، اور ہر شخص یہ خیال کر سکتا ہے کہ یہ تعداد بہر نوع ان اشخاص کی تعداد کا ایک معتد بہ جز تھی جنہیں ان سے کمے عمال اس عہدے کے قابل سمجھ سکتے تھے، اور چونکہ اس طریقہ کو تمام ناظموں (مجسٹریٹوں) کے عہدے پر بھی حاوی کر دیا گیا تھا (جن کی تعداد سسمونڈی کے اندازے کے مطابق ۱۳۶ تھی) اس لئے یہ امر تقریباً متیقن معلوم ہوتا ہے کہ فلورنس کے ہر ایک موقر شہری کو کوئی نہ کوئی عہدہ ملجاتا رہا ہوگا، بشرطیکہ وہ سرکاری کاموں میں وقت صرف کر سکتا ہو، کیونکہ کسی عہدے کا کوئی معاوضہ نہیں ملتا تھا بجز ان عہدوں کے جو غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھے۔

سسمونڈی اس بیان پر یہ اضافہ کرتا ہے کہ اطالیہ کے تقریباً تمام آزاد شہروں نے فلورنس والوں کی اس جدّت کے اختیار کرنے کی طرف سبقت کی[1]، اور وہ کہتا ہے کہ یہ عملدرآمد انیسویں صدی کے اوائل میں لوکا اور ٹسکنی کی یا تہائے کلیسا کے بلدیات میں بدستور جاری تھا۔

حکام کی تعداد کا تصور کرتے ہوئے ہمیں دل میں یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ چودھویں صدی کے نصف اول میں فلورنس ایک بہت بڑا شہر ہو گیا تھا۔ سسمونڈی کا اندازہ یہ ہے کہ ۱۳۴۳ء میں اس کی آبادی ڈیڑھ لاکھ نفوس کی تھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اگرچہ طریق انتخاب کا مذکورۂ بالا تغیر اس اعتبار سے عمومی ہے کہ نسبتاً زیادہ آدمیوں کے لئے حصول عہدہ کے مواقع پیدا ہو گئے تھے مگر جن لوگوں کو ان کے انتخاب کا حق حاصل تھا وہ اب بھی معدودے چند اشخاص رہتے تھے، کیونکہ یہ قاعدہ ہے کہ جو نام قرعے کے ذریعہ سے نکالے جاتے ہیں ان کا انتخاب عام شہریوں کی جانب سے نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ہی بہت تفصیلی تجویزیں اس امر کی اختیار کی گئی تھیں کہ کوئی شہری جو واقعی قابل انتخاب ہو وہ انتخاب سے رہ نہ جائے۔ ۱۳۲۸ء میں جب ڈیوک کالابریہ کے انتقال کے بعد (جو تین برس تک فلورنس کی امارت پر فائز رہا تھا)[2]، سخت کوشش اس امر کی گئی کہ جہاں تک ممکن ہو حکومت کو وسیع

---

[1] - تاریخ جمہوریات اطالیہ" جلد پنجم باب ۳۱۔

[2] - یہاں برسبیل تذکرہ میں یہ خیال ظاہر کر سکتا ہوں کہ ازمنۂ وسطیٰ کے اطالیہ میں جمہوری خود مختاری کے قائم رکھنے میں جیسی تعجب خیز دشواریاں درپیش تھیں ان کا اظہار اس سے بہتر کسی امر سے نہیں ہو سکتا

بنیاد پر قائم کیا جائے بشرطیکہ اختیار گوئلف فریق ہی کے ہاتھ میں رہے، اس وقت اکابر اور علمداروں کے انتخاب میں جو کارروائی اختیار کی گئی اگر میں اسے بیان کرنے میں، اس وقائع نگار کے نقش قدم پر چلوں تو فلورنس کی چودھویں صدی کے دستور کی خصوصیت بمودمند طور پر واضح ہو جائے گی۔ یہ طریقہ حسب ذیل تھا (۱) اکابر جن کے ساتھ شہر کے ہر محلے سے دو عوام بھی شامل کئے جاتے تھے۔ گوئلف فریق میں سے تیس برس سے زائد عمر کے غیر امرا شہریوں میں سے چند ایسے شخصوں کا انتخاب کرتے تھے جن میں اکابر بننے کے شرائط پائے جاتے تھے (۲) کمپنیوں کے سردار بھی جن کے ساتھ ہر کمپنی سے دو تمام شخص شامل کئے جاتے تھے ایسا ہی کرتے تھے مگر اتنا ہی کافی نہیں تھا بلکہ غیر تقابہ تنظیم اور حرفتی تنظیم کو بھی اس انتخاب میں امداد دینا پڑتی تھی، اس لئے (۳) گلف (حامی پوپ) فریق کے سرگروہ بھی بشمول مجلس ایک فہرست تیار کرتے تھے، اور (۴) علیٰ ہذا پنج عہدہ داران تجارت بھی اعلیٰ صنعتوں کے دو قنصلوں کے ساتھ ملکر فہرست مرتب کرتے تھے، یہ صورت بالکل ایسی ہی ہوتی اگر انگلستان میں یہ روش اختیار کی جائے کہ لبرل فریق ہمیشہ برسر اقتدار رہے (جس طرح جارج اوّل اور جارج دوم کے وقت وِگوں کو ہمیشہ اقتدار حاصل رہا تھا) اور وزارت کا انتخاب اس طرح پر ہو کہ کابینہ نیشنل لبرل فڈریشن (قومی وفاقیہ احرار) اور سربرآوردہ اتحادات مزدوراں کے وکلا کی مدد سے وزارت کا انتخاب کیا کرے۔

جب فہرستیں تیار ہو جاتیں تو آئندہ دو برس کے لئے اکابر کے عہدے کے قابل اشخاص کا آخری تعین کسی قدر مختلف الترتیب اشخاص کی جماعت کی خفیہ رائے دہی سے عمل میں آتا، اس جماعت میں حسب ذیل افراد شامل تھے "اکابر اور بارہ اشخاص نیک" جن میں سے اکابر اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے" انیس علمداران (سرداران کمپنی بارہ اعلیٰ فنون میں سے ہر ایک کے دو دو قنصل ۲۴ اور چھتیس وہ اشخاص جنہیں اکابر اور "اشخاص نیک" نے شہر کے چھ محلوں میں سے چھ شخص فی محلہ کے حساب سے مقرر کیا ہو

بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ۔ کہ جمہوریت کے سربرآوردہ حامی فلورنس کو بھی مجبور ہو کر گاہ بگاہ عارضی طور پر غیر ملکی امرا کو قبول کرنا پڑتا تھا۔ البتہ اس قسم کے امرا بلدی حکومت خود اختیاری کے حقوق کو بخوبی محفوظ رکھ کر قبول کئے جاتے تھے، پھر بھی ان کا قبول کیا جانا فی نفسہ ایک تعجب انگیز امر ہے۔

پسندیدگی کے لئے اڑسٹھ رایوں کی ضرورت تھی، اس کے بعد ان پسند شدہ اشخاص کے نام تھیلیوں میں رکھے جاتے تھے، شہر کے ہر محلہ کے لئے ایک تھیلی ہوتی تھی اور ہر دوسرے مہینے ہر تھیلی میں سے ایک ایک نام قرعہ کے ذریعہ سے نکالا جاتا تھا، ان میں سے جن جن اشخاص کا نام نکل آتا تھا وہ آئندہ دو مہینے کے لئے اکابر کا عہدہ پر کرتے تھے مگر اسمیں شرط یہ تھی کہ ایک ہی شخص دو برس کے اندر (دوبارہ) اکابر میں داخل نہیں ہوسکتا تھا اور نہ ایک ہی خاندان کے دو رکن چھ مہینے کے اندر یہ عہدہ حاصل کرسکتے تھے نہ دو بھائی یا باپ اور بیٹا ایک سال کے اندر اس پر فائز ہوسکتے تھے علمدار اور بارہ اشخاص نیک ابھی اسی قسم کی فہرستوں سے منتخب ہوتے تھے اور ہر ایک حرفت اپنے قنصل بھی اسی طریق پر منتخب کرتی تھی۔

یہ بھی ملحوظ رہے کہ اسی (۱۳۲۳ء کے) زمانہ میں مذکورۂ بالا پیچیدہ نظم مجالس دو مجلسوں تک محدود کردیا گیا تھا، "ایک مجلس عمومی" تھی جو کہ مختلف فریق کے عوام میں سے تین سو اشخاص پر مشتمل تھی اور دوسری "مجلس کمیون" تھی جس میں امرا اور عوام کے ڈھائی سو پسند شدہ اشخاص شامل تھے مقصد یہ تھا کہ مملکت کے تمام اعلےٰ اغراض و مقاصد کی کسی نہ کسی طرح پر نمایندگی ہو جائے، تاآنکہ "مجلس کمیون" میں امرا کو بھی نمایندگی عطا کی گئی تھی جس کا مقصد یہی تھا کہ فریقانہ ظلم و تعدی کے خلاف انہیں قرار واقعی تحفظ حاصل ہوسکے۔

۷۔ مگر ان پرشور و شر زمانوں میں سیاسی دستور دل کی مدت قیام بہت تھوڑی ہوا کرتی تھی۔ اعلےٰ فنون جو تجارتی عنصر کی نمایندگی کرتے تھے اور ادنیٰ فنون جن میں اہل حرفہ کا عنصر شامل تھا، ان دونوں کے درمیان اتحاد خیال کم ہوتا جاتا تھا، اور ایک طرف امرا اور سربرآوردہ عوام اور دوسری طرف زیادہ متمول عوام اور معمولی اہل حرفہ کے دہرے دہرے مناقشے سے مطلق العنانی کو غلبہ کا موقع میسر آتا جاتا تھا، اور شمال اپے نین کے شہر تو پہلے ہی عام طور پر اس مطلق العنانی کے قدموں کے نیچے آچکے تھے ستمبر ۱۳۴۲ء میں جب والٹر ڈی بری این (ڈیوک ایتھنز) عارضی طور پر شہر کا مالک بن گیا تو یہ قدیم امرا اور ادنیٰ طبقہ کے اہل حرفہ ہی کا اتحاد باہمی تھا جس نے ایک بے ترتیب پارلامنتو کے اندر اس کے لئے شہر کا آقائے مادام الحیات ہونے کا آوازہ بلند کردیا۔ مگر آئندہ جولائی میں فلورنس کو اس مطلق العنانی سے آزادی دلانے کے لئے تمام طبقات متفق ہوگئے۔ اس اتحاد کو قائم رکھنے کے لئے تھوڑی دیر کے لئے یہ کوشش کی گئی، کہ امرا کو بھی

عہدوں میں شریک کرلیا جائے، اور ان کے خلاف احکام عارضی طور پر معلق کر دئے گئے، مگر بقول وقائع نگار مذکور ہی نوع انسان کے دشمن نے امرا کے غرور و تمرد کو متحرک کر دیا۔ عوام ان کی زیادتیوں سے برافروختہ ہو گئے، اور ان کو اعلیٰ عہدے سے خارج کر دیا۔ ایک مختصر سی مسلح کشمکش ہوئی اور (۱۳۴۳ء میں) امرا ہمیشہ کے لئے دب گئے۔ اسکے بعد قدیم امرا نے بہ حیثیت ایک طبقے کے پھر کبھی مقابلے کے لئے سر نہیں اٹھایا، احکام متذکرۂ بالا دائمی طور پر جاری کر دئے گئے اگرچہ اب کے زیادہ منصفانہ صورت میں جاری ہوئے کسی امیر مجرم کے لئے رشتہ داروں کی ذمہ داری اس کے قریب ترین اقربا تک محدود کر دی گئی۔ نیز امرا کا مفہوم بھی بدل گیا، بعض جرائم کے لئے عوام بھی امرا کے مفہوم میں قرار دیدیئے گئے یعنی ان کے اہل خاندان و رشتہ دار بھی اس وقت تک شریک جرم سمجھے جاتے تھے جبتک کہ وہ اس مجرم کو انصاف کے لئے حوالہ نہ کر دیں۔ دوسری طرف امرا کے چند قدیم خاندان اور کچھ افراد مراعات کے طور پر عام فیصلے سے عوام میں داخل کر دئیے گئے۔

مختلف ناموں کے ساتھ اسی قسم کی کارروائی امرا شکنی کی دوسری آزاد جمہوریت سی رینا لیسٹویا، لوکا نے بھی اختیار کی اور جو شہر آزاد رہے ان میں بھی عام طور پر یہ ہوا کہ طبقۂ امرا تمام حاکمانہ عہدے سے خارج کر دیا گیا، اور ایک سے زاید شہروں میں فلورنس کے مانند امرا کی ایک فہرست اندراج کھول دی گئی، جس میں بطور سزا کے ان لوگوں کے نام درج کئے جاتے تھے جو امن عامہ میں خلل ڈالتے تھے۔ ازمنۂ وسطیٰ کے جن ادارات کا ہمیں علم ہے ان میں سے یہ ایک نہایت ہی عجیب ادارہ ہے۔

اب پھر فلورنس کی طرف پلٹ کر دیکھئے۔ جب انجام کار میں قدیم امرا کی طاقت زائل ہو گئی تو سوال یہ باقی رہ گیا کہ ایک خالص حرفتی حکومت کے اندر تلبیبی عدیدیوں اور ان اہل حرفہ کے درمیان جو چھوٹے چھوٹے پیشوں میں منضبط ہو گئے تھے، اختیارات کی تقسیم کیونکر عمل میں آئے ۱۳۴۳ء کے بعد پہلے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا موخرالذکر غالب آجائیں گے۔ ۱۳۲۵ء اور ۱۳۴۳ء کے مابین خاصکر ۱۳۴۲ء و ۱۳۴۳ء کے پر آشوب زمانے میں عمومیت کی جانب بہت زیادہ توجہ مبذول کی گئی،

لہ جیووانی ویلانی، جلد ۱۲ باب ۱۹۔

کیا جاتا تھا کہ قابل انتخاب اشخاص کی پسندیدگی میں تعجیل دینے سے گبلین عہدوں پر فائز ہو گئے ہیں اور اس مردود عام جماعت کے مخالف جوش کے پردہ میں گوئلف سوسائٹی نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ بیس برس تک اختیارات اس کے ہاتھ میں رہے، اس سوسائٹی میں ایسے قدیم امرا کا معقول اثر تھا، جو گوئلف تھے اور جس طرح قدیم روما میں ہوا کم و بیش اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ سر برآوردہ دولتمند عوام سے مل کر انھوں نے ایک نیا گروہ بنا لیا جس کا میلان عدیدیت کی طرف تھا، انھوں نے ایک قانون یہ منظور کرا لیا کہ جو گبلین کسی عہدہ پر قابض ہوگا وہ جان و مال کی سزا کا مستوجب ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی گلف سوسائٹی کے سرگروہوں کو یہ حق بھی دیدیا گیا کہ مشکوک گبلین کو متنبہ کر سکیں گبلین ہونے کی اس غلط تعبیر سے ان لوگوں نے ۱۳۵۷ء سے ۱۳۷۸ء تک یہ انتظام قائم رکھا کہ نہ صرف گبلین فریق کو عہدوں سے خارج کر دیں بلکہ ہر اس شخص کا عہدہ چھین لیں جو حکمراں گروہ کا مخالف ہو۔

اس سے بددلی پیدا ہوئی اور وہ منجر ہوئی اس انقلاب کی طرف جو غالباً فلورنس کا سب سے زیادہ مشہور انقلاب ہے یعنی ۱۳۷۸ء کا چیومپی فریق کا انقلاب جس میں دہری تاریخی دلچسپی ہے۔ کیونکہ (۱) فلورنس میں عمومی تحریک کی یہ انتہائی حد تھی اور (۲) یہی پہلا موقع تھا کہ یہ تحریک باقاعدہ منضبط شدہ تجارتوں اور حرفتوں کی حد سے گزر کر عارضی طور پر حکومت میں عوام کے ایک اور زیادہ پست طبقہ کی شرکت کا باعث ہو گئی، اس طبقہ میں کسی قدر کام کرنے والوں کا وہ گروہ شامل تھا جنھوں نے ابھی آزادانہ شخصیت نہیں حاصل کی تھی بلکہ وہ کسی نہ کسی اہل فن کے ساتھ تابع و متبوع کا تعلق رکھتے تھے، مثلاً ایک حرفت Arte di Lana تھی جسے میں عام محاورے میں "بزازوں کی شرکت" کے نام سے ترجمہ کر سکتا ہوں، اس کے ساتھ اون کے صاف کرنے والے، رنگنے والے اور بننے والے سب ضمنی حیثیت سے اس کے تابع تھے بلکہ غیر ماہر مزدور بھی شامل تھے۔

انقلاب کی مختلف صورتوں کو سلسلہ وار بیان کرنے کے لئے بہت وقت چاہیئے۔ اس کا نفاذ اس طرح سے ہوا کہ وہ واقعی یا مشتبہ حامیان شہنشاہی جن کی دار و گیر ہو رہی تھی، چھوٹے درجے کے اہل حرفہ اور پست تر طبقے کے لوگ سب

چنانچہ وقائع نگار نے لکھا ہے کہ امرا پر فتح حاصل کر کے عوام (اور خاصکر طبقۂ متوسط اور چھوٹے
درجہ کے اہل حرفہ) بہت بلند منزلت اور جرأت و اقتدار کے درجہ پر پہنچ گئے تھے عله
فی الجملہ شہر کی حکومت اکیس فنون کے ارباب عاملانہ کے ہاتھوں جاری ہی۔ چھ ضلعوں،
(حلقوں) کی قدیم تقسیم از کار رفتہ ہو گئی تھی۔ لہذا شہر اب چار محلوں میں تقسیم کیا گیا اور اکابر کی
تعداد چھ سے بڑھا کر آٹھ کر دی گئی یعنی ہر محلہ سے دو شخص اور انھیں لوگوں سے بشمول علمدار
انصاف (جو اب حکومت کا صدر سمجھا جاتا تھا) نو شخصوں کی حکومت عاملانہ مبنی تھی۔ یہ انتظام
کر دیا گیا کہ ان نو اشخاص میں سے تین شخص نیچے درجہ کی حرفتوں میں سے لئے جائیں گے۔
وقائع نگار نے آگے چلکر لکھا ہے کہ بہ حیثیت ایک امر واقعہ کے اس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ
ان نیچے درجہ والوں کو اس نسبت سے زائد جگہیں ملگئیں خاصکر اس وجہ سے کہ ایک ہی
خاندان کے دو شخصوں کے چھ ماہ کے اندر اکابر منتخب ہونے کی ممانعت کا اثر قدیم خاندانوں
پر زیادہ سخت پڑتا تھا کیونکہ ان کا سلسلۂ قرابت دور تک معلوم تھا، نئے لوگوں پر اتنا اثر نہیں
پڑتا تھا کیونکہ وہ اپنے پرکھوں کی لوگوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔

۸۔ مگر جیسا کہ میں پہلے ظاہر کر چکا ہوں عدیدیت بالعموم بڑی مشکل سے زائل ہوتی ہے
کہا جاتا ہے کہ جب یہ معلوم ہوا کہ ذلیل و جاہل اشخاص نے اکابر کے عہدے حاصل کر لئے ہیں عله
تو عملاً عدیدیت کی جانب رجعت شروع ہو گئی اور اس کا نفاذ ذرا خاص طریقے سے ہوا۔
میں یہ بیان کر چکا ہوں کہ گیوں کر حاوی و غالب گوئلف فریق ایک گوئلف سوسائٹی (انجمن)
کے طور پر منظم کیا گیا تھا جس کی مجلس و قائدین ہوتے تھے۔ اور کس طرح بعد کے زمانہ میں
اس فریق کے قائدین ان قابل انتخاب شہریوں کی فہرست کے مرتب کرنے میں حصہ
لینے لگے جن میں سے بذریعۂ قرعہ اندازی کے حکام کا انتخاب ہوتا تھا۔ مشتبہ شہنشاہی
پسندوں پر مقدمہ چلانے کے لئے بھی ان میں ایک عہدہ دار ہوتا تھا، اور ان کے
اثر کی وجہ سے گبلین تین ربع صدی تک (یعنی ۱۲۶۶ء سے ۱۳۴۳ء تک) عملاً عہدوں سے
خارج رکھے گئے تھے لیکن ۱۳۴۳ء کے تغیر کے بعد یہ یقین کیا جاتا تھا یا بہ تصنع ایسا ظاہر

عله ۔ ویلانی جلد ۱۲، باب ۲۲۔
عله ۔ ہیلم (از منۂ وسطی) باب سوم حصۂ دوم صفحہ ۴۲۹۔

متحد ہو گئے۔ ایک خاص موقع پر تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پست تر طبقہ نے اس پورے لقمہ کو دانتوں میں دبا لیا ہے اور ایک عام جوش کی رو میں (جس سے ۱۷۸۹ء کے بعد کے زمانہ کے انقلابوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے) سب کو بہا لے جائے گا۔ اسے عارضی طور پر یہ حق حاصل ہو گیا کہ نو حکام عاملانہ (یعنی آٹھ اکابر ایک علمدار انصاف) میں سے تین حکام وہ مہیا کرے۔ اس کے بعد ایک ردعمل واقع ہوا۔ جس کا نتیجہ ایک نظام سلطنت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس میں پست تر فنون کو غلبہ حاصل ہو گیا، مگر یہ حالت صرف تین برس تک قائم رہی۔ ۱۳۸۲ء میں "امیرانہ عوام" کو پھر اقتدار حاصل ہو گیا اور پر زور عمومیت کی تحریک کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ پست تر حرفتوں نے عہدہائے انتظامت کا ربع حصہ اپنے قبضہ میں رکھا مگر وہ حقیقتاً "انجمن ہائے حرفتی" نہیں رہیں، دولتمند نوجوان ان میں داخل ہو گئے۔ اور عام اہل حرفہ سرمایہ داروں کی حکمران عدیدیت کے بیجان آلہ کار ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ پچاس برس بعد جس ارتقاء نے اس جمہوریت کو رفتہ رفتہ عملاً خاندان میدیچی کی شاہی میں بدل دیا اسے بالکل اسی طرح عوام کی تائید حاصل تھی جیسی رومانی جمہوریت کے وقت میں حاصل ہو چکی تھی۔

عسٹ۔ میں نے صرف فلورنس سے بحث کی ہے۔ تاکہ حتی الوسع ایک مختصر بیان کو صفائی کے ساتھ پیش کیا جا سکے۔ لیکن قریب قریب اسی زمانہ میں منضبط مگر پست درجہ حرفتوں کی عمومیت کو اسی طرح عارضی کامیابیاں سی اینا وغیرہ کے مانند دوسرے شہروں میں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔

خطبہ بست و یکم

ازمنۂ وسطیٰ کے نیابتی ادارات

۱۔ اب میں اس موضوع پر قلم اٹھاتا ہوں کہ ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کے عین جاگیری یا نیم جاگیری حالات کے جزوی اختلافات کو نظر انداز کر کے ہم یہ قرار دے سکتے ہیں کہ وہ دسویں صدی سے تیرھویں صدی تک قائم رہے ان حالات اور سولھویں اور سترھویں صدیوں کی خالص شاہی کو غلبہ حاصل ہو جانے کے درمیانی زمانہ میں مغربی یورپ کے اندر جو نظم سلطنت ازمنۂ وسطیٰ کے دور آخر میں قائم تھا اس نظم سلطنت کے آغاز و زوال کو مختصراً بیان کروں اس نظم کی نسبت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ جمعیتہائے طبقات کے زیر نگرانی شاہی نظم سلطنت تھا لیکن ذہن میں یہ ملحوظ رہے کہ ان جمعیتوں میں امیروں اور پادریوں کے علاوہ شہروں کے نمائندے بھی شامل تھے ۔

لیکن قبل اس کے کہ میں اس بیان کو شروع کروں میں چاہتا ہوں کہ قدیم و جدید سیاسی خیالات کے ایک اہم فرق کی طرف توجہ دلادوں جس سے ان خیالات پر روشنی پڑے گی جن کا اظہار میں اس باب میں کرنے والا ہوں۔ ارسطو کی جس عبارت کا اقتباس پہلے پیش کیا گیا ہے[1] اس میں اس نے مباحثی جماعت کے فرائض بیان کرتے وقت محصولوں کے متعلق کچھ نہیں کہا ہے۔ اس کے نزدیک مقاصد عامہ کی ضرورت

[1] ۔ خطبہ دوازدہم صفحہ ۱۷۴ ۔

کے لئے محاصل عائد کرنے کا مسئلہ اس قدر صریحی طور پر ثانوی اور زیریں حیثیت رکھتا تھا کہ اس کی نسبت اس نے کچھ نہیں کہا، اس کے برخلاف لاک کی مشہور کتاب "ملکی حکومت" (مصنفہ ۱۶۹۰ سنہ) میں اس سوال کو کہ اجرائے محصول کا تعین کون کرے اس سے بھی زیادہ اساسی سوال قرار دیا ہے کہ وضع قوانین کا تعین کون کرے۔ لاک اس امر کے تسلیم کرنے پر آمادہ ہے کہ کوئی قوم یہ کر سکتی ہے کہ وضع قوانین کے فرض کو کسی مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھ میں دیدے اور اس کے ساتھ صرف یہ مبہم سی شرط لگا دے کہ قوانین کا مقصود قوم کی بہبود ہونا چاہیئے، مگر لاک اس کو قبول نہیں کرتا کہ قوم نے کسی وقت بھی اس طرح پر کسی حکومت کو یہ حق دیدیا ہو کہ وہ قوم کی رضامندی کے بغیر (خواہ یہ رضامندی اسنے خود دی ہو یا اس کے نائبوں نے دی ہو) قوم کی جائداد پر محصول عائد کر سکتی ہے[۱]، یہ رائے قدیم سیاسی نظریہ کی رو سے جس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے جدید نظریے کے لحاظ سے بھی اس کی غرابت اس سے کم نہیں ہے مگر سترھویں صدی کی آئینی کشاکش میں تاریخی طور پر مسئلہ مالیات کو جو فوقیت حاصل تھی، اس کے یہ عین مطابق ہے۔

قدیم و جدید سیاسی تخیلات کے درمیان یہ فرق میری دانست میں اس طرز پر مبنی ہے جس طرز سے جدید نظم سلطنت جاگیری حالات سے گزر کر بتدریج نمودار ہوا۔ جاگیری نظم سلطنت میں محصول خالص کو کوئی حیثیت نہیں حاصل تھی۔ یہ سمجھ لیا گیا تھا، کہ بادشاہ اپنی بادشاہی کے اخراجات اپنے صرف خاص کی آمدنی اور ان جاگیری خدمات، حقوق اور گاہ بگاہ کی "امداد" سے چلاتا تھا جو اس کے تابعین سے حاصل ہوتی تھیں، بعد ازاں جب خاصکر جنگ میں تنخواہدار پیشہ ور سپاہیوں کے غالب مفاد کی وجہ سے تاج کے اخراجات بڑھے تو پھر بادشاہ کے نقدی ضروریات کا تصادم اس کے تابعین کی اس مستحکم عادت سے ہوا کہ وہ صرف معینہ لگان، حقوق اور معاوضۂ خدمات کے ایک سلسلہ حق و فرض کے ادا کرنے کے پابند تھے۔ چنانچہ جب فرانس میں مجلسوں کے دور کا آغاز ہوا تو ہیلم (اس وقت کے) شاہ فرانس کے متعلق یہ لکھتا ہے کہ ایک واقعی امتیاز خاص ایسا تھا جسے بادشاہ باوجود اپنی ازدیاد طاقت کے بزور ربط دینے کی

---

[۱] "رسالہ ملکی حکومت" باب یازدہم فقرہ ۱۴۲۔

توقع نہیں کرسکتا تھا یعنی اس کے بیرنوں کو محصول سے جو بریت حاصل تھی اسے وہ ساقط نہیں کرسکتا تھا[1] اور اس پر ہم یہ بھی اضافہ کرسکتے ہیں کہ حقوق یافتہ شہروں کو مشوروں کے ذریعے سے ان کی سالانہ ادائی رقوم کے متعلق اپنی رائے سے اضافہ کرنے کے خلاف جو طمانیت دی گئی تھی اسے بھی معمولی طور پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، پس بادشاہ کے مالیات کے راستے میں جو رکاوٹیں اسطرح حائل ہوگئی تھیں ان پر غالب آنے کے لئے بادشاہ کے نقطۂ نظر سے عام مجلسوں کا اجراء و قیام ایک اہم ذریعہ تھا۔

۲۔ اس امر کو اصولی اہمیت حاصل ہے کہ ازمنۂ وسطی کے سیاسی ارتقا کا وہ دور جس میں گو نہ نیابتی جمعیتیں حکومتی اقتدار کے اہم اعضا بن گئی تھیں، وہ دور اس ارتقا سے مقدم تھا اور ایک حد تک اسی سے پیدا ہوا تھا جس سے ملکی سلطنتوں کے اندر شہری جماعتوں کو جاگیری امرا کے ہم پایہ خود مختاری حاصل ہوگئی، اگرچہ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اندرونی حیثیت سے اس کا انتظام ان اصولوں پر تھا جو جاگیریت سے بالکل غیر مشابہ (بلکہ حقیقتاً حرفتی) تھے اور جن میں کچھ زمانے کے لئے کم و بیش نیم عمومی نظام سلطنت کا میلان پایا جاتا تھا۔ اسی ارتقا کی وجہ سے یہ ہوا کہ جب یہ جمعیتیں بنیں تو یہ صرف جنگجو اور مذہبی امرا کی جمعیتیں نہ تھیں بلکہ ان میں نظم معاشرت کے ترقی یافتہ حرفتی عنصر کے نمایندے بھی شامل تھے اور حرفتی عنصر کی بھی شمولیت تھی جس سے نہایت ہی قطعی طور پر یہ ظاہر ہوتا تھا، کہ ان جمعیتوں سے قوم کے ارتقا کے ایک نئے دور کا اظہار ہوتا ہے۔

وجہ یہ ہے کہ ان جمعیتوں کا جاگیری عنصر کوئی نئی شے نہیں تھا، بادشاہ کے براہ راست تابعین کی جمعیت کی یہ صرف بعد کی شکل تھی، یہ جمعیت "شاہی عدالت" یا شاہی مجلس کے نام سے جاگیری دور میں حکومت کا مشہور و مانوس عنصر تھی، البتہ جس پابندی کے ساتھ وہ اپنے فرائض اس زمانہ میں ادا کرتی تھی اس میں اور اس زمانے میں بہت فرق تھا قدیمی نظم سلطنت میں یہ جمعیت سرداروں کی مجلس کی صورت میں موجود تھی، اس کا اجتماع اس لئے ہوتا تھا کہ وہ صلح و جنگ کے معاملے میں بادشاہ کو مشورہ دے، اہم عدالتی فیصلے صادر کرے اور اتفاقی جنگی محصولوں (امداد) کا انضباط کرے اور ازمنۂ جاگیری میں محصول کی صرف یہی ایک ممیز و عام شکل تھی، اگر تنہا یہی جمعیت بادشاہ کو صلاح و مشورہ دیتی اور قوانین و محاصل سے اتفاق کرتی رہتی، تو یہ لوگ صرف اس کشمکش کو جاری رکھتے

[1] ازمنۂ وسطی صفحہ ۲۲۳ باب دوم حصۂ دوم۔

جو ملوکیت و عدیدیت کے درمیان برپا تھی جس کی نسبت میں ابھی ابھی یہ کہہ چکا ہوں کہ ابتدائی ازمنۂ وسطیٰ کی مخصوص خصوصیت ہی تھی، مگر شہروں کے شیوع سے طبقات کے جلسوں میں ایک زیادہ عمومی عنصر داخل ہو گیا جسنے تیرھویں صدی کے بعد سے شاہی کو کسی قدر مدد بھی دی، اور کسی قدر اقتدار بھی اس پر قائم رکھا۔

ان جمعیتوں کی تکوین قوم کی ترقی پذیر ارتباط کا نشان و اظہار ہے یہ ایسا بیان ہے جو ان سب پر عاید ہو سکتا ہے لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جن اسباب سے یہ صورت زیادہ تر پیش آئی ان کی نسبت کوئی ایسا بیان مشکل ہے جو صاف طور پر تمام حالات پر عائد ہو سکے، بعض وقت ان جمعیتوں کی تکوین کا تحریک کلیۃً بادشاہ اوپر سے شروع ہوتا معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ بادشاہ کی حکمت عملی کے اسباب اور خاصکر مالیاتی حالت ہوتی تھی، لیکن بعض وقت اس کا شیوع نیچے سے ہوتا تھا، اور یہ ایک وسیع تر و موثر نتیجہ تھا، رضاکارانہ اتفاق کی اس فوری تحریک کا جو ایک ہی معاشری طبقے کے اشخاص کی جماعتوں میں پیدا ہو جاتی تھی اور ازمنۂ وسطیٰ کے موخر دور کی یہ ایک خاص خصوصیت ہے، لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ دونوں اسباب مخلوط ہو جاتے تھے۔

لیکن غالباً ہر شخص کو یہ توقع ہوگی جس تحریک کے بموجب تیسرے طبقہ کے قائم مقاموں کو بیرنوں اور مذہب کے پیشواؤں کے پہلو بہ پہلو نشست ملی ہو، وہ تحریک جہاں اوپر سے چلنے کے بجائے نیچے سے شروع ہوئی ہو وہاں نہایت درجہ اغلب یہ ہے کہ یہ تحریک ترقی کر کے ایک پائدار و مستقل آئینی حکومت کی صورت اختیار کریگی۔ مگر واقعہ اسکے برعکس تھا، جرمنی وہ ملک ہے جہاں ہم اتفاق کی قوت کو نہایت ہی واضح اور نہایت ہی پر زور طور پر عمل کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ چنانچہ جرمنی ہی میں یہ ہوا کہ شہروں کی مشہور رضاکارانہ لیگیں قائم ہوئیں جن میں سے ہنسائی لیگ بالتخصیص ایک نہایت ہی نمایاں مثال اس قوت و عملی خودمختاری کی ہے جو ان عناصر کے خود ساختہ اشتراک و اختلاط سے ظہور پذیر ہوئی جو خود انفرادی حیثیت سے باضابطہ سیاسی ماتحتی کی حالت میں رہے۔ انگلستان، فلینڈرز، اسکینڈینیویا، روس وغیرہ کے ایسے غیر ممالک کے جرمانی تاجروں نے اپنے اغراض مشترک کے تحفظ کے لئے اتحادات قائم کئے، اور شمالی جرمنی کے تجارتی شہروں میں مختلف مقاصد کے لئے چھوٹے چھوٹے اتحادات قائم ہو گئے

آخر الامر انھیں سے ترقی کرکے چودھویں صدی کے وسط میں "ہنسا" کے نام سے شمال جرمانی شہروں کا ایک بہت بڑا اتحاد قائم ہوگیا، اس کی حکومت ان قراردادوں کے مطابق ہوتی تھی جو مختلف شہروں کے قائم مقاموں کے اجلاسوں میں منظور ہوتی تھیں، بری و بحری راستوں کو مامون رکھنا، جو شہر اتحاد کے رکن ہوں، ان کے مناقشات کا حَکَم سے طے کرنا اور غیر ممالک میں تجارتی حقوق کا حاصل کرنا اور ان پر نگاہ رکھنا یہ امور ان کے اولین مقاصد میں داخل تھے، سنہ ۱۳۶۷ء میں اس اتحاد نے کامیابی اور شان کے ساتھ سکینڈینوی سلطنتوں کے خلاف جنگ کی، اور اس کے بعد ہی مدت دراز تک اس کی پرجوش زندگی قائم رہی، جو شہر اس میں داخل تھے، ان کا اندرونی نظم سلطنت اسی اتحاد کی نگرانی میں رہا اور "اصلاح" کا دور آیا تو اس اتحاد نے مذہبی معاملات تک میں دخل دیا۔ شہنشاہی طاقت کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد ازمنۂ وسطیٰ کے آخری زمانے کے جرمانی شہروں کی عہدیت کی مختلف مثالوں میں سے یہ صرف ایک مثال ہے جرمنی کے اندر صرف شہروں ہی میں ایسا نہیں ہوا کہ مشترکہ اغراض کے لئے متحد ہونے کا یہ بے ساختہ میلان ظاہر ہوا ہو، بلکہ امرا اور خاصکر نیچے درجہ کے امرا بھی اپنے حقوق و اختیارات کی حفاظت کے لئے برادریوں میں متحد ہو گئے تھے، یہ تحریک کسانوں تک میں پہنچ گئی اگرچہ سوئیزرستان کے کسانوں کے مشہور واقعے کے سوا اور جگہ یہ تحریک ناکل اور عارضی سی رہی۔ آخری امر یہ ہے کہ چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں، (جو ازمنۂ وسطیٰ کی پارلیمنٹوں کا دور تھا) رضاکارانہ اتحاد کی قوت کا اظہار خصوصیت کے ساتھ جرمنی ہی میں اس طرح ہوا کہ حکمرانوں کے مظالم کے خلاف امرا، قسیس، سپاہ زادہ اور شہری اپنی محافظت کے لئے زیادہ وسیع اتحادات میں متحد ہو گئے۔ بایں ہمہ جرمنی میں طبقات کے اجلاسوں کا یہ ازمنۂ وسطیٰ والا نظم کمزور پڑ گیا اور سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں میں باقی بھی رہا تو حاوی و غالب مطلق العنانی کے مقابلے میں کسی قسم کی پرزور مقاومت پیش نہ کر سکا۔

اس کے برخلاف انگلستان میں جہاں کہ ازمنۂ وسطیٰ کی پارلیمنٹ سے زمانۂ جدید کی پارلیمنٹ تک کا تغیر بتدریج و غیر منفک طور پر عمل میں آیا، وہاں شہروں کی

عہ ملاحظہ ہو خطبۂ بست و سوم صفحہ ۲۳۶۔

جانب سے باہمی اتحاد کا یہ خود ساختہ دور نمایاں نہیں ہوا۔ شہروں کو اول اول بے ترتیب طور پر بیرنوں کی طرف سے طلب کیا گیا اور معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس سے ان کا خاص مقصود و اخلاقی تائید حاصل کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ بادشاہ کے مقابلہ میں بیرنوں کے معاملہ کو قومی جد و جہد سمجھنے کی زیادہ موثر وجہ موجود ہے، بعد میں شہروں کی طلبی با ترتیب طور پر ہونے لگی خاصکر اس وجہ سے کہ بادشاہ کی مالیاتی ضروریات کے لئے روپیہ حاصل کرنے میں شہروں سے علٰحدہ علٰحدہ گفت و شنید کرنے کی بہ نسبت قائم مقاموں کے توسط سے مجموعی طور پر گفت و شنید میں زیادہ سہولت تھی۔ اسپین میں ان مجلسوں کا ظہور زیادہ پہلے ہوا، چنانچہ پرسکاٹ کہتا ہے کہ اب یہ دریافت کرنا بعد از وقت ہے کہ (اسپین میں) قومی مجالس میں طبقۂ سوم کا شمول بادشاہوں کی مدبرانہ فکر کا نتیجہ تھا یا شہروں کی ترقی پذیر قوت و اہمیت کی وجہ سے انھیں مجبور ہو کر ایسا کرنا پڑا تھا[1]۔ انگلستان کی طرح فرانس میں بھی یہ ظاہر ہے کہ اس تحریک کا اجرا اولاً اوپر سے ہوا، مگر فرانس میں جب بادشاہ کی حکمرانی کمزور و ناکام نظر آنے لگی تو جو مجلس اس طرح سے طلب ہوتی تھی اس نے جلد تر اس میلان کا اظہار کر دیا کہ وہ زمام اختیار اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہتی ہے۔

۳۔ قبل اس کے کہ میں ان غیر معمولی حالات کا تجزیہ کروں جو انگلستان میں ازمنۂ وسطی کے ان نیابتی ادارات میں زیادہ مکمل اور زیادہ کامیاب نشو و نما کا باعث ہوئے، ہمیں مقابلے کے طور پر فرانس کی صورت حال کی تحقیقات کرنی چاہئے جس کی وجہ کسی قدر یہ ہے کہ نیابتی ادارات کے اس عارضی دور کے بعد جب شاہی کا زمانہ آیا تو فرانس ہی میں شاہی شان و شوکت اور اس کے اثر کو سب سے زیادہ نمود حاصل ہوئی۔

ہم اس کا آغاز اس بیان سے کر سکتے ہیں کہ جیسا گیزو نے اشارہ کیا ہے[2] جب فرانس کی ازمنۂ وسطی کی تاریخ میں طبقۂ سوم نے اہم حصہ لینا شروع کیا اس وقت شہروں کی خود مختاری کی حالت وہ نہ تھی جو اس سے قبل رہ چکی تھی۔ قانون پیشہ اشخاص کی مدد سے بادشاہ کی طاقت ظاہراً و باطناً جس قدر بڑھتی جاتی تھی اور اس کے ساتھ

---

[1] ۔ تاریخ فرڈی نینڈ و ازابیلا۔ (حاشیۂ تمہید)

[2] ۔ تاریخ تمدن فرانس خطبۂ نوزدہم۔

ملک کے اندرونی نظم وارتباط میں جس قدر ترقی ہوتی جاتی تھی اسی قدر شہروں کی انتظامی خودمختاری اور خاصکر بعض شہروں کے نیم فرمانروایانہ اختیارات بتدریج گھٹتے جاتے یا منسوخ ہو جاتے تھے، کیونکہ وہ اس ارتباطی نظم سے موافقت نہیں رکھتے تھے جو اہل قانون کا منتہائے خیال تھا اور جہاں تک کہ بادشاہ کی فوقیت کے قیام کو اس سے استحکام حاصل ہوتا تھا بادشاہ کی ہوس بھی بالطبع یہی تھی۔ یہ کارروائی تیرھویں صدی کے بیشتر حصص میں جاری رہی اور اس کے بعد سے بھی دو صدیوں تک اس کا سلسلہ چلتا رہا، اگرچہ چودھویں صدی کے آغاز تک شہروں کے نمائندے طبقات عامہ کی جمعیت میں تیسرا طبقہ قائم کرنے کی غرض سے طلب نہیں کئے گئے اور نہ اس صدی کی وسط تک اس طبقے نے اپنے مطالبات پیش کرنے اور دشمن کے قلعے پر گویا حملہ کرنے کی روش اختیار نہیں کی۔ اس کی وجہ میرے خیال میں یہ آتی ہے کہ بادشاہ اگرچہ برابر یہ کوشش کرتے رہتے تھے کہ شہروں کو ان کے نیم فرمانروایانہ اختیار سے محروم کر دیں تاہم شہروں کی طرف سے انھیں نہ وہ اندیشہ تھا اور نہ وہ انھیں اپنا ویسا حریف سمجھتے تھے جیسا جاگیری امیروں اور پادریوں کو سمجھتے تھے اور بادشاہوں نے جاگیری طرز وروش کی جو عام مخالفت اختیار کی تھی، اس میں ان کے لئے یہ بہت اہم منفعت کا باعث تھا کہ وہ صرف شاہی املاک کے شہروں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ عام طور پر ملک کے تمام شہروں کے ساتھ براہ راست تعلق پیدا کریں۔

طبقات عامہ کا پہلا اجلاس جو ۱۳۰۲ء میں منعقد ہوا اس سے بادشاہ کا اولیں مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ پوپ کی مخالفت میں اسے اپنی ساری بادشاہی کی تائید حاصل ہے لیکن (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اس کے سوا ایک دوسرا اہم مقصد یہ بھی تھا کہ زیادہ آسانی سے روپیہ حاصل ہو سکے، اور میرا خیال ہے کہ انگلستان کی طرح فرانس میں بھی بہ حیثیت مجموعی اس مقصد کو نسبتہً زیادہ اہمیت حاصل تھی، اگرچہ اس کی اہمیت دفعتہً پر سمجھی نہیں گئی۔ عام جمعیت نے ان مالیاتی انتظامات میں آسانی پیدا کر دی جو بصورت دگر بادشاہ کو اپنے تابعین سے فرداً فرداً کرنا پڑتی۔ بادشاہ نے غالباً یہ توقع کی (اور حقیقتاً ویسا ہی ہوا بھی) کہ شہروں کے نائب اسے مالی مدد دینے کے لئے زیادہ آسانی سے راضی ہو جائیں گے، اور اس طرح جاگیری امرا کے ساتھ ان کی موجودگی کی وجہ سے روپیہ کے حصول کے مشکلات کم ہو جائیں گے، لیکن یہ تدبیر کیسی ہی دلفریب

کیوں نہ ہو اس کا تجربہ بغیر اس کے نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شاہی کو یہ خاص خطرہ لاحق ہو جائے کہ تمام مقاموں کو اتحاد باہمی کا جو مزید موقع حاصل ہو گا وہ انھیں اس جانب لے جائیگا کہ جب کبھی شاہی میں ضعف آئے تو وہ حکومتی اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیں، اور وضع قوانین اور نظم و نسق میں مداخلت کرنے لگیں، اور ۱۳۵۳ء میں جنگ پواتی ایری مصیبت ناک تباہی کے بعد فرانس میں واقعۃً یہی صورت پیش آئی۔ یہ ملحوظ رہے کہ اس وقت اصلاح (یا انقلاب) کی تحریک کو شہروں نے خاصکر ابھارا تھا، اور ان کی سرپرستی تاجران پیرس کے نمایندے کر رہے تھے۔ اسی قسم کی ایک تحریک (جس کی سرگروہی یہی شہری عنصر کرتا تھا) اس وقت بھی ہوئی جب ۱۴۱۳ء میں ملک متخاصم فریقوں کے ظلم و تعدی سے پاش پاش ہو گیا تھا۔

مگر مختلف طبقات اور خاصکر شہریوں اور اعیانیوں کے درمیان اتحاد کی کمی اس امر کے لئے کافی تھی کہ عموعی نگرانی ان اضطراری کوششوں کو قیام و دوام حاصل کرنے سے باز رکھے۔ اس اتحاد کے نقص کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ امرا اور پادری مالگزاری سے بری تھے اور غیر امرا کو زمین کا محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ اصول یہ اختیار کیا گیا تھا کہ پادری اپنی دعاؤں سے، امرا اپنی تلواروں سے، اور عوام اپنے روپیہ سے گویا محصول ادا کرتے ہیں، جہاں تک محصول کے عام بار کا تعلق تھا وہاں تک تو بہر نوع یہی اصول رائج تھا۔ پس چونکہ اس طرح ممتاز طبقات کو ان مالیاتی مسائل سے دلچسپی نہیں رہی تھی جن کی بحث مجالس طبقات عام میں ہوتی تھی، اس لئے اہل شہر بمرور خود اتنے کمزور ہو گئے کہ وہ تن تنہا بادشاہ سے کشمکش نہیں کر سکتے تھے۔ مالیات کی اصولی اہمیت پر خیال کرتے ہوئے اس کا انقلابی لمحہ اور کشمکش کے نقطۂ بازگشت کا وقت ۱۴۳۹ء میں آیا۔ اب طبقات نے مستقل محصول پر رضامندی ظاہر کی یا یہ سمجھ لینے میں کامیابی ہو گئی کہ انھوں نے ایسی رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ یہ اصول کہ اجرائے محصول کے جائز ہونے کے لئے طبقات کی منظوری ضروری تھی صریحی طور پر ترک نہیں کیا گیا تھا۔ نصف صدی بعد ۱۴۸۴ء میں اس کا دعویٰ کیا گیا اور زیادہ باقاعدگی کے ساتھ ہر دوسرے برس جمعیت کے انتخاب اجلاس کا مطالبہ کیا گیا۔ بادشاہ سے جو کچھ چاہا گیا اس نے اس کا وعدہ کر لیا مگر اس نے اس کے بعد سے جمعیت کو طلب نہیں کیا۔ اور محصول حسب دستور سابق وصول کرتا رہا۔

فرانس کے طبقات عامہ اور طبقات صوبجاتی کی جمعیتوں کی تاریخ کے مسلسل بیان کرنے میں بہت طوالت درکار ہے۔ عام خواہشوں کے اظہار کے لئے وہ ایک اہم و موثر آلہ تھیں۔ اور حکومت جب دانشمند ہوتی تھی تو وہ ان اظہارات سے قابل قدر صلاح و اشارہ حاصل کرتی تھی۔ لیکن عام طور پر ہر شخص یہی کہنا چاہے گا کہ جن طبقات کی نمائندگی ہوتی تھی ان میں اتحاد کا نہ ہونا ہی زیادہ تر وہ سبب تھا جس کی وجہ سے یہ مرکب جمعیت حکومتی اختیار میں کوئی اہم و مستقل حصہ پانے سے محروم رہتی تھی۔ امرا و عوام کے مابین اس مہلک عدم اتحاد کا اظہار بہت ہی نمایاں طور پر ۱۶۱۴ء کے طبقات عامہ کے اجلاس میں ہوا جبکہ امرا نے باضابطہ بادشاہ کے حضور میں یہ شکایت کی کہ طبقۂ سوم کے ایک مقرر نے امرا و قسیس و عوام کے تین طبقوں کو ایک ہی خاندان کے تین بھائیوں سے تشبیہ دی ہے طبقۂ سوم نے صرف برادر خرد ہونے کا دعویٰ کیا تھا، مگر امرا اتنی اخوت کے بھی روادار نہیں تھے۔ جب یہ تینوں طبقات پونے دو صدی بعد ۱۷۸۹ء میں پھر جمع ہوئے تو جیسا کہ کبھی کبھی خاندانوں میں بھی یہی ہو جاتا ہے، سب سے چھوٹا بھائی سب سے زیادہ طاقتور ہو گیا تھا۔ اور اس نے اپنی طاقت کا لوہا منوا دیا۔

اسی قسم کے ایک سبب نے ایسا ہی نتیجہ اسپین میں بھی پیدا کیا، جہاں قومی جمعیتوں میں شہروں کی نمایندگی کا رواج بارھویں ہی صدی میں ہو گیا تھا، اور جہاں کاسٹیل اور اراگان دونوں حصوں میں ایک مدت تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ کے ادبار ان جمعیتوں کا اقتدار زیادہ مضبوطی و باقاعدگی کے ساتھ قائم ہو گیا ہے اور پندرھویں صدی تک یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان جمعیتوں کی باقاعدہ آئینی حکومت میں ترقی کر جانے کی امیدیں زیادہ قوی ہیں، لیکن یہاں بھی بادشاہی کی طاقت اسی میں مضمر تھی کہ اس کے حریفوں میں اتحاد مفقود تھا، اور حریف اس امر پر رضامند رہتے تھے کہ وہ اپنے ساتھیوں کو نقصان پہنچا کر خود خاص خاص حقوق حاصل کرلیں۔ چنانچہ کاسٹیل کے شہروں کی نمایندگی کی قوت میں اس طرح ضعف آیا کہ جب چودھویں صدی میں بادشاہ نے جرات کر کے ان شہروں کی تعداد جنہیں اپنے نمایندے بھیجنے کا حق تھا اٹھارہ تک گھٹا دی تو ارکان کی تعداد بھی کم ہو گئی، خفیف تغیرات کے ساتھ یہ تعداد اسی حالت پر قائم رہی جن شہروں کو حقوق خاص حاصل تھے وہ (دوسروں کے لئے) ان حقوق کی توسیع میں

سدراہ ہوتے تھے۔ طبقۂ امرا کو یہاں بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ اپنی ذاتی فوجی خدمت کی وجہ سے محصولوں سے بری ہیں۔ اس طرح امرا اور شہریوں کے درمیان جو تفریق قائم ہوگئی تھی اسی نے سولھویں صدی میں مطلق العنانی کی طرف منقلب ہونے کو نہایت آسان کردیا۔

اسکینڈنیوی بادشاہوں کی پارلیمنٹوں میں عمومی ہیئت زیادہ مستحکم بنیاد پر قائم تھی۔ ان پارلیمنٹوں میں امیروں اور شہریوں کے نمایندوں کے ساتھ کسانوں کے نمایندے بھی شامل تھے درحقیقت سویڈن نے موثر پارلیمنٹی قوت کی مثال اٹھارھویں صدی جیسے بعید زمانے تک میں پیش کی ہے۔ تاہم ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جس ناگہانی کارروائی نے ۱۶۶۰ء میں ڈنمارک کی حکومت کو مطلق العنان شاہی میں بدل دیا وہ اسی مالیاتی غرض کی تفریق کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ شہروں کے رہنے والے امرا کے اس انکار سے غضب ناک تھے کہ جب وہ امرا اپنی جاگیروں میں رہیں تو ان پر محصول نہ لگایا جائے۔ بادشاہ نے ہوشیاری کے ساتھ ان کے غیظ و غضب کو اور بھڑکا دیا جس نے ایک عمومی انقلاب کی صورت اختیار کرلی۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مطلق العنان بادشاہی قائم ہوگئی۔

۴۔ پس اب اگر ہم یہ سوال کریں کہ مغربی یورپ کی بڑی سلطنتوں میں سے صرف انگلستان ہی میں کیوں ایسا ہوا کہ ازمنۂ وسطیٰ کے طبقوں کی جمعیتیں اپنے علی التسلسل سے موجودہ پارلیمنٹی حکومت کی صورت میں آگئیں، تو میرے خیال میں اس کا خاص جواب یہی ہوسکتا ہے کہ جو سبب (یعنی مختلف اجزا و درجات میں فقدان اتحاد) دوسری جگہوں میں ناکامی کا موجب ہوا اس کا اثر انگلستان میں بہت کم ہوا میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ پندرھویں صدی کا انگلستان صوبجاتی رقابت یا درجاتی رقابت سے بالکل مبرا تھا مگر ان رقابتوں کا اثر دوسری جگہوں کی بہ نسبت انگلستان میں بہت کم تھا میرے خیال میں اس کے دو خاص اسباب تھے ایک انگلستان کی جزائری حالت، اور دوسری نارمن بادشاہوں کی طاقتور حکومت۔

میرا دل کہتا ہے کہ میں اس بات پر یقین کروں کہ جزائری حالت اور اس کے معینہ حدود نے قومی احساس کے اتحاد کے خیالات پر براہ راست اثر انداز ہونے میں زیادہ سہولت پیدا کردی۔ جزیرے سے باہر کے لوگ صاف طور پر غیر ملکی نظر آتے تھے۔ اسی لئے نارمن فاتحوں اور انگلو سیکسن مفتوحوں کے درمیان بہت ہی مکمل امتزاج ہوگیا اور صورت حالات کو دیکھتے ہوئے یہ امتزاج بہت عجلت کے ساتھ ہوا۔

اگر ہم (Dialogue de scacceario) ("مکالمۂ خزانہ") پر اعتماد کریں تو (ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ) یہ اتحاد ڈیڑھ صدی کے اندر اندر عملاً مکمل ہوگیا تھا۔ غالباً جزائری حالت کا دوسرا زیادہ اہم اثر یہ تھا کہ مدتوں تک کسی شدید حملے کا خوف نہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً زیادہ باامن حالت کی طرف سے طمانیت ہوگئی تھی۔ یہی سبب تھا کہ (بہ الفاظ مسٹر ہربرٹ اسپنسر) بر اعظم کی بہ نسبت عسکریت کا غلبہ یہاں کم ہوا۔ انگلستان میں ہمیشہ ان زمینوں کے ساتھ ہی ساتھ جو فوجی خدمت کی بنا پر عطا کی گئی تھیں، بہت وسعت کے ساتھ غیر فوجی خدمت کی بنا پر بھی زمینیں ملی ہوئی تھیں۔ اور جزیرہ کے باعث نسبتاً زیادہ باامن صورت کے پیدا ہو جانے سے زمیندارانہ املاک رکھنے والوں کا زیادہ باامن عنصر دوسرے عنصر کو جذب کرنے لگا تھا۔ بادشاہ کو براعظم میں اپنے مقبوضات کے حفاظت کی ضرورت رہا کرتی تھی مگر سمندر کے پار کی ان لڑائیوں میں خدمت کرنے کا فرض رفتہ رفتہ ایک طرح کا بار معلوم ہونے لگا۔ مبارز معاوضہ نقد دیکر اس خدمت سے بچ نکلنے پر خوش تھے مگر جب یہ ذمہ داری نقدی میں بدل گئی تو پھر مبارزوں کو یہ نقدی ذمہ داری بھی تکلیف دہ معلوم ہونے لگی۔ اور تیرھویں صدی میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا اجرا جبراً کیا جاتا تھا۔ پس اس طرح چھوٹے درجہ کے زمینداروں میں فوجی و غیر فوجی عنصر کا فرق ہٹ چلا، اور دیہات کے شرفا اور شہر کے تجار کے لئے عوام کے نام سے ایک پر زور و پر حوصلہ جماعت میں متحد ہو جانے میں زیادہ سہولت پیدا ہوگئی۔

انگریزی نظم معاشرت کے مزید اندرونی ارتباط کا ایک دوسرا اہم سبب ولیم فاتح کی قائم کردہ بادشاہی کا غلبہ و زور ہے۔ ایک معنی کر کے ولیم نے جاگیریت کو رائج کیا، مگر جاگیریت کے خاص سیاسی اثرات یعنی حکومتی اختیار کے تجزیے کو بہت ہوشیاری کے ساتھ خارج رکھا گیا تھا۔ اس کے پر زور ہاتھ اور شاطرانہ حکمت عملی نے اپنے ان ماتحتوں کو جن کے ساتھ اس نے غنیمت کا حصہ بخرہ کیا تھا فرانسیسی یا جرمانی جاگیرہ ہی متاجروں کے مانند کسی قسم کی خود مختاری حاصل نہ ہونے دی۔ چنانچہ ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ انگلستان میں یہ اصول قائم رکھا گیا تھا (اور کم از کم اصول و ضابطہ کی رو سے تو ضرور یہی یہ تھا) کہ بادشاہ کی ذات کے ساتھ وفاشعاری نہ صرف بادشاہ کے بلا واسطہ تابعین و متاجرین اعلےٰ پر واجب تھی بلکہ ان تابعین کے تابعین پر بھی لازم تھی، انگلستان کی زمین کی

غنیمت کو فیاضی کے ساتھ تقسیم کرنے میں ولیم نے یہ خیال رکھا تھا کہ اسے ٹکڑے ٹکڑے کرکے تقسیم کرے تاکہ جہاں تک ہو سکے کسی زبردست امیر کو کسی ایک ہی حصۂ ملک میں زائد از ضرورت غلبہ نہ حاصل ہو جائے۔ اس نے چیسٹر اور ڈرہم کے سرحدی صوبوں کے سوا (جن پر اہل ویلز و اہل اسکاٹلینڈ کے خلاف فوجی مدافعت کا فرض عائد تھا) اور جگہوں میں انتظامی نظم کے وسیع اختیارات کو بڑے بڑے امرا کے ہاتھوں میں جانے سے روک لیا تھا۔

علاوہ ازیں، انگلستان میں بارھویں صدی سے دورہ کرنے والے عادلوں کے ذریعہ سے عدالت مقامی کے نظم ونسق پر نگرانی قائم رکھی گئی تھی، اور اس شاہی انصاف نے مقامی رسم ورواج کو دباکر قوم کی یکرنگی وہمنوائی میں اضافہ کردیا تھا، (یہ یاد رہے کہ نارمنوں سے قبل بھی براعظم کے مقابلہ میں انگلستان میں قومی یکرنگی بڑھی ہوئی تھی) ہنری دوم کے بعد سے ناقابل لحاظ مستثنیات کو چھوڑ کر انگلستان کا صرف ایک عام قانون رہا ہے۔ مزید براں جب نیابتی ادارات کا آغاز ہوا تو انگلستان میں "صوبہ جاتی طبقات" کے مثل کوئی شے موجود نہیں تھی بلکہ اسکے بجائے صرف ایک پارلیمنٹ تھی علاوہ ازیں، انگلستان میں مختلف طبقات کے ارتباط میں انگریزوں کے ایک خاص خیال سے بھی مدد ملی گئی کہ اعیانیت کو وہ ایک ایسا وصف سمجھتے تھے جو چھوٹے بیٹوں کی طرف منتقل نہیں ہوتا تھا، ایک حد تک اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دارالامرا[1] (یعنی ملک کی مجلس اعظم) ہماری مضبوط اور مرکزی نارمن حکومت کا ایک ایسا باقاعدہ عنصر تھا کہ براعظمی سلطنتوں میں اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ نارمن بادشاہ اپنی

---

[1] ولیم کے جاری کردہ جاگیریت کے اثر کے تحت میں قومی مجلس نے (جس کا عمومی عنصر نارمنی فتح کے بہت ہی قبل ناپدید ہو چکا تھا) تقریباً غیر محسوس طور پر عقلا کی جمعیت سے شاہی دربار کی صورت اختیار کرلی (جیسیں منشورات منتخبہ (Select charters) صفحہ ۱۵) جس میں (بادشاہ کے) جاگیری مستاجرین اعلےٰ مگر عملاً بڑے بڑے بیرن شامل ہوتے تھے۔ (اگرچہ دستور کی رو سے تمام فوجی اعلےٰ مستاجرین کو شرکت کا حق حاصل تھا) بس جہاں تک کہ پارلیمنٹ کی ارتقا کے تسلسل کا تعلق ہے دارالامرا ہی وہ ایوان ہے جو قدیم قومی مجلس کا گویا قائم مقام ہے۔

کارروائیوں کے متعلق اپنے امرا کی مجلس کی مخالفت سے خائف نہیں رہتا تھا، بلکہ اسے خوف تھا تو مقامی مقاومت کا خوف تھا، اور مجلس کی رضامندی اس مقاومت کو روک دینے کا باعث ہو سکتی تھی، اس لئے جو امرا فرداً فرداً مجلس میں بلائے جاتے تھے جو نہیں بلائے جاتے تھے، ان کا فرق انگلستان میں بہ نسبت اور ممالک کے زیادہ نمایاں ہو گیا، جو نہیں بلائے جاتے تھے، وہ بادشاہ کے چھوٹے درجہ کے مستاجرین میں ملکر آخر میں اعیان سلطنت کا ایک طبقہ بن گئے۔

پس اس طرح ہم ایک زبردست بادشاہی، ایک کمزور تر طبقۂ امرا اور ایک ہم رنگ و متحدہ قوم کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ لہٰذا طبقۂ امرا کو مجبور ہو کر بادشاہ کی مطلق العنانی کی مقاومت کرنا پڑی تو بالطبع وہ اس طرف مائل ہوا کہ ان دوسرے طبقات کے ساتھ ملکر اس ظلم و ستم کو محسوس کرتے تھے خود کو تقویت دے[1]۔ اس اتحاد میں اس سے بھی سہولت پیدا ہوئی کہ انگلستان کے شہروں کے ارتقا میں اس قسم کی کشمکش نہیں پائی جاتی جو اکثر براعظمی تاریخ میں شہریوں اور امیروں کے درمیان نظر آتی ہے۔ یہ بھی ملحوظ خاطر رہنا چاہیئے کہ اس زمانہ میں انگلستان زیادہ تر ایک زرعی اور مرغزاری ملک تھا، لیکن جو بڑے شہر وہاں تھے (اور جو زیادہ تر براہ راست بادشاہ کے تابع تھے) ان کی تاریخ امرا کے ساتھ اس قسم کے طولانی، تلخ و ظالمانہ مناقشات سے پر نہیں رہی جو دوسرے مقامات میں اتحاد کے لئے سنگ راہ ہو گئے تھے، اور چونکہ پرزور مرکزی نظم و نسق نے چھوٹے چھوٹے شہروں کے باشندوں کو مختلف اغراض کے لئے صوبے کے حکام کے تابع کر دیا تھا اسلئے دہقانی و شہری عناصر مشترکہ کاموں کے عادی ہو گئے تھے۔

پس اس طرح نارمنی فتح کے ڈیڑھ صدی بعد بادشاہ کی غیر معمولی قوت ان دوسرے

---

[1] چنانچہ یہ بیرن ہی تھے جنھوں نے ۱۲۱۵ء میں جان سے بزور "منشور اعظم" لکھوایا یہ بیرن قوم کی جانب مائل تھے، اور "منشور اعظم" کسی بڑے مفہوم کے عدیدی گروہ کے اغراض کے لئے مرتب نہیں ہوا تھا اس کا مقصود یہ تھا کہ کم از کم تمام آزاد زمینداروں کے لئے خود رایانہ محصول سے اور تمام آزاد اشخاص کے لئے خود رایانہ قید و سزا سے آزادی حاصل کرے۔

اسباب کے ساتھ ملکر جنھوں نے انگریزی معاشرے کے عناصر میں اتفاق باہمی کی غیر معمولی قابلیت پیدا کردی تھی، پارلیمنٹ کی قوت کا ایک خاص سبب بن گئی، اور پارلیمنٹ چودھویں صدی کے آغاز میں حکومت کا ایک باقاعدہ جزو ہوگئی۔ دوسرے ممالک کی طرح یہاں بھی پارلیمنٹ کا موقع بادشاہ کی مالیاتی ضروریات ہی کے اندر مضمر تھا۔ مگر پارلیمنٹ[1] کے اندر نمایندہ عنصر کے زیادہ مستحکم ارتباط کی وجہ سے دوسرے ممالک کی بہ نسبت یہاں پر اس موقع سے زیادہ مستعدانہ عزم کے ساتھ کام لیا گیا، اور چودھویں صدی کے قبل ہی یہ گرانقدر اصول قائم ہوگئے تھے کہ بغیر منظوری پارلیمنٹ کے نیا محصول[2]

---

[1] - نمایندگی کا اصول "منشور اعظم" میں نہیں پایا جاتا، مگر جہاں تک کہ آزاد زمینداروں کا تعلق ہے اس کا رواج بتدریج ہوتا گیا، اور ہیلم و فریمین کے ساتھ میرا بھی یہی خیال ہے کہ اسکا باعث زیادہ تر یہی تھا کہ اس سے روپیہ حاصل کرنے میں سہولت ہوتی تھی۔ سائمن ڈی منٹفرٹ نے جب ۱۲۶۵ء میں پہلی مرتبہ شہروں کے نمایندوں کو پارلیمنٹ میں طلب کیا تو درحقیقت یہ طلبی مالیاتی وجوہ پر نہیں تھی، تاہم مالیاتی وجوہ کا اثر یہ ہوا کہ اس طریقہ کو اس نے باقاعدہ دستور کا ایک فرد بنا دیا۔ اور اسی کی وجہ سے عہد اڈورڈ اول ۱۲۹۵ء میں تینوں طبقوں کی پہلی مکمل نمایندگی ہوئی۔ اس کے بعد بہت ہی جلد (۱۲۹۷ء میں)، نئے محصولوں کے اجرا کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری کی ضرورت باضابطہ تسلیم کرلی گئی۔ پہلے پارلیمنٹ میں تین طبقے تھے۔ اور معابا زرشہریوں سے علحدہ رائے دیتے۔ اور اپنے اوپر محصول عائد کرتے تھے۔ مگر چودھویں صدی میں پادریوں نے پارلیمنٹ میں شریک ہونا ترک کردیا۔ اور خود اپنے مذہبی جلسوں میں علحدہ طور پر جمع ہونے کو ترجیح دی، اور نائنٹ شہریوں میں مل گئے، مگر ہمیں یہ محفوظ رکھنا چاہیئے کہ پندرھویں صدی میں انتخاب کنندگان کی تمام کثرت میں کمی آگئی۔ ۱۴۲۹ء میں "چالیس شلنگ" والے آزاد اراضی داروں کی شرط نے ایک معقول تعداد کو حق رائے دہی سے محروم کردیا، نیز بہت سے قصبوں میں بلدی حکمراں جماعت اپنا انتخاب کرنے والی ہوگئی۔ اور نمایندوں کے انتخاب کرنیکے حق کو غصب کرلیا۔ یہ واقعہ بجنسہ ویسا ہی ہے جیسا کہ ہم جرمنی و اطالیہ کی نسبتاً زیادہ خود مختار شہری جماعتوں کے حالات میں دیکھ چکے ہیں۔

[2] - رسم و رواج کے متعلق کچھ شکوک کے ساتھ، اور یہ شکوک بعد کو بہت اہم ہوگئے یہاں تک کہ طویل العہد پارلیمنٹ نے آخری طور پر ان کا تصفیہ کردیا۔

لگانا ناجائز اور وضع قوانین کے لئے دونوں ایوانوں کا اتفاق رائے ضروری ہے[1] اور یہ کہ دارالعوام النظم ونسق کی خرابیوں کی تحقیقات اور اس کی ترمیم کا مطالبہ کرسکتا ہے اگرچہ اس وضاحت وتکمیل کے ساتھ نہیں پھر بھی یہ مسلم ہوگیا تھا کہ انگریزوں کے حقوق وآزادی میں محض بادشاہ کے فرمان یا حکم کی بنا پر جائز طور پر کوئی مداخلت یا ترمیم نہیں کی جاسکتی ان اصول نے انگلستان کے شعور سیاسی میں بہت گہری جڑ پکڑ لی تھی یہاں تک کہ جب گلابوں والی لڑائیوں کے بعد پارلیمنٹ کا جوش عارضی طور پر پست ہوگیا اور بادشاہ کو عملاً غلبہ حاصل ہوگیا تب بھی وہ علانیہ پارلیمنٹ کے روایتی حقوق کو زیر بحث نہیں لایا اور نہ انھیں پامال کیا۔ ٹیوڈر بادشاہ اپنے منشاء دلی کے موافق چلے، اور بعض جہات میں انگریزوں کے روایتی حقوق میں سختی کے ساتھ دست اندازی بھی کی، مگر انھوں نے بالعموم اپنی یہ من مانی کارروائیاں پارلیمنٹ کی رضاجوئی سے انجام دیں، اس کے آئینی حقوق کو زیروزبر کرکے انجام نہیں دیں۔

---

[1] - پہلے دستور یہ تھا کہ نئے قوانین عوام کی درخواست اور امرا کی منظوری سے بنائے جاتے تھے۔ اس کے بعد بتدریج درخواستوں نے مسودات قانون کے نام سے مکمل قوانین کی صورت اختیار کرلی، کیونکہ یہ معلوم ہوگیا تھا کہ اکثر جو کچھ درخواست میں ہوتا تھا بادشاہ حقیقتاً وہ سب کچھ عطا نہیں کرتا تھا۔

خطبۂ بست و دوم

مطلق العنان شاہی کی جانب میلان

۱۔ سلسلۂ کلام میں اس سے پہلے جہاں ہم نے مغربی یورپ کی ملکی سلطنت کا مقابلہ قدیم یونان کی شہری سلطنت سے کیا ہے وہاں میں نے اس امر پر توجہ دلائی ہے کہ جب ہم اپنی توجہ کو حکومت اور اس کی شکل کے ادبر مرکوز کر کے خالص سیاسی حیثیت سے اس پہ نظر کریں تو دور آخر کے ارتقا میں (قدیم یونان سے) ایک بہت ہی نمایاں فرق معلوم ہوتا ہے۔ یہ فرق بادشاہی کا دوام ہے۔ ارتقا کے مختلف مدارج میں موروثی بادشاہی بدستور قائم رہی لیکن شہری مملکت کے ارتقا میں حکومت کی جو مختلف شکلیں یکے بعد دیگرے قائم ہوئیں، ان سے مشابہات کا پتہ چل سکتا ہے، یہ بادشاہی اس دور میں بھی قائم رہی جو شہری سلطنتوں کے عہد میں، قدیمی عہدیات یعنی، قدیم خاندانوں کی عہدیات کے ہم شکل ہے۔ جس زمانہ میں بالفاظ مورخین شوریدہ سر امرائے نے بادشاہی کی شان و شکوہ کو ماند کر دیا اور اس کے اختیار کو گھٹا دیا تھا جس زمانہ کی نسبت ہم یہ سنتے ہیں کہ ڈیوک، کاونٹ یا ارل جس بادشاہ کی رسمی اطاعت کا دم بھرتے تھے اختیارات میں اس کی ہمسری کا دعوا رکھتے تھے، اس زمانے میں بھی ان لوگوں کو اس امر میں کبھی کامیابی نہیں ہوی کہ وہ موروثی بادشاہی کی تنظیم کو تباہ کر دیتے (وہ اس کا خیال کبھی دل میں نہیں لاتے تھے) اور اب جس عمومی دور میں سے ہم گذر رہے ہیں، اس دور میں بھی یورپ کے اکثر ممالک میں بادشاہی بدستور موجود ہے حالانکہ اس زمانہ میں تقریباً ہر ایک متمدن ملک میں تشریعی اختیارات کا

بہت بڑا حصہ بالضرور قوم کے نمایندوں کے ہاتھ میں ہے اور اس قسم کے اکثر ممالک میں ان نمایندوں نے رائج الوقت نظم و نسق پر بھی بڑی حد تک اقتدار حاصل کر لیا ہے اور اس طرح جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں وہ دور جو کم و بیش مطلق العنان بادشاہی کا دور تھا اور جو ان دونوں عہدوں کے درمیان واقع تھا اور جس کا غلبہ وزور یورپ کے سب سے زیادہ اہم ممالک میں سترھویں صدی کے آخری حصہ اور اٹھارھویں صدی کے اختتام کے قریب تک قائم رہا۔ یہ دور اگرچہ یونانی تاریخ کے خود سر حکمرانوں کے قدیم تردد سے کچھ مشابہت رکھتا ہے، مگر یہ ایک شخص کی حکومت کی جانب بیقاعدہ خلاف قانون بازگشت کا دور نہیں ہے، بلکہ قدیم قائم شدہ حکومت میں ایک عنصر کا تدریجاً یا دفعۃً دوسرے عناصر پر غالب آجانا ہے۔

جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، میرے خیال میں اس واقعۂ عجیبہ کا خاص سبب یہ ہے کہ ایک ملک کے اتنے وسیع قطعہ پر جو لوگ بسے ہوئے تھے ان میں قومی اتحاد اور سیاسی نظم کا قائم رکھنا زیادہ دشوار طلب تھا اور اسی دشواری کی وجہ سے ملکی سلطنت میں مادام الحیات سرگروہی کے ذریعہ سے اتحاد و اجتماع اختیار پیدا کرنے کی زیادہ ضرورت تھی۔ ہم فرانس و جرمنی کی تاریخ میں یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کے مقابلہ میں سربرآوردہ امرا کے اختیارات کے اضافہ کا آخری میلان زیادہ تر اس طرف ہوتا تھا کہ سلطنت مختلف حصوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایسا کم ہوتا تھا کہ ایک مجتمعہ عدیدی نظام سلطنت قائم ہو جائے اور (دوسرا اثر یہ ہوتا تھا کہ) امرا خلاف قانون ظلم و ستم کرنے اور آپس میں لڑنے جھگڑنے لگتے تھے، برخلاف ازیں، یونان و روما کی قدیمی عدیدیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کے خلاف منضبط صورت سے اور قانونی کا رنگ لئے ہوئے ظلم و زیادتی کرتا تھا۔ اس لئے جس ملک میں جہاں تک قومی احساس داور اک کو ترقی ہو جاتی تھی، اسی حد تک وہ بادشاہی کو اس ابتری و پریشانی کے مقابلہ میں ایک ضروری روک سمجھ کر قائم رکھتا تھا، اور تمدن کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی تھی اسی قدر ایسے لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی جو اپنے ہمسایوں کے ساتھ پرامن قانونی تعلقات کے ساتھ رہنا چاہتے تھے اور (اس لئے) وہ بادشاہ کی

مدد کے خواہاں ہوتے، اور بدنظمی و بے ضابطگی کے خلاف بادشاہ کی تائید کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

لیکن خاص سبب اگرچہ یہی ہے تاہم ہمیں ان خیالات کے اثر کو بھی حساب میں لانا چاہئے جو رومانی شہنشاہی سے حاصل ہوئے تھے، ان خیالات کی نقل و سرایت مختلف ذرائع سے ہوئی تھی، اول ذریعہ مفتوح قوموں میں حکم برداری کی عادت تھی، دوسرے ۸۰۰ء میں چارلس اعظم نے جب قدیم لقب شہنشاہی کی تجدید کی تو اس لقب کی منزلت و امتیاز کا اثر پڑا، اور اس کے بعد کلیسا اس کا وسیلہ بنا، اگرچہ یہ وسیلہ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) غیر مسلسل رہا، آخر آخر میں قانون پیشہ اشخاص اسکا ذریعہ ہوئے۔

ان تمام اسباب کے مجموعی اثر کی وجہ سے بادشاہی ان مختلف صدمات و خطرات کے درمیان جو ازمنۂ وسطیٰ کے طولانی دور عمل میں اور اس کے بعد کی مذہبی جنگ و جدل میں، اسے پیش آئے، بحال خود قائم رہی اور آخر الامر اٹھارھویں صدی کے اوائل میں سب پر غالب آگئی اگرچہ بلا استثنا ہر جگہ ایسا نہیں ہوا۔ ونیس کی قدیم عدیدیت اور ہالینڈ و سوئزرلینڈ کی جدید سقفیت میں حکومت کی جمہوری شکل قائم رکھی گئی۔ انگلستان میں ۱۶۸۹ء کے بعد سے بادشاہ کو پارلیمنٹ سے بالمقابل ہو کر حکومت کرنا پڑی جسکی فوقیت کو قانون سازی و مالیات کے باب میں بادشاہ نے بالآخر تسلیم کر لیا۔ (یہ پارلیمنٹ فی الاصل ایک وسعت یافتہ عدیدیت کی نمایندگی کرتی تھی)۔ اور نظم و نسق پر بادشاہ کا اثر صرف اس طریقے سے قائم رہا جسے متین اشخاص اثر اور بد تہذیب لوگ عہدوں اور وظیفوں کی رشوت وہی کہتے تھے۔ شمال میں سویڈن میں ۱۶۹۳ء سے ۱۷۱۸ء تک کی کلی مطلق العنان بادشاہی کے مختصر دور کے بعد چارلس دوازدہم کی فوجی مہمات کی وجہ سے قوم کے وسائل پر جو سرفانہ بار پڑ گیا تھا اس نے یہ رجعت قہقری پیدا کر دی کہ ایک جمعیت کی نگرانی قائم ہو گئی جس میں انگلستان ہی کی طرح سے عدیدیت کا غلبہ تھا اور یہ صورت پچاس برس سے زائد تک قائم رہی (۱۷۲۰-۱۷۷۲) دوسری طرف مشرق میں پولینڈ کے امرا نے بادشاہ سے اور ہر طرح کے نظم و انتظام سے عملاً خود مختاری حاصل کر لی، اور اپنے ہمعصروں کے سامنے ایک دلچسپ مثال اس بدترین عدیدیت کی پیش کی جس کا علم تاریخ کو ہوا تاہم یہ سب مستثنیات میں تھے

دوسری جگہوں میں رومانی وجرمانی قوموں میں یکساں طور پر حکومت کی شاہی شکل مستحکم رہی، چنانچہ فرانس، اسپین، پرتگال، ہردوسسلی، ڈنمارک بشمول ناروے، آسٹریا اور جرمنی وشمال اطالیہ کی اکثر وہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں جن میں مقدس رومانی شہنشاہی منقسم تھی، ان سب میں یہی شکل رائج تھی۔

بس اسی نقطۂ نظر سے میں نے ان خطبات میں یورپ کی تاریخ کے خاکہ کھینچنے کی کوشش کی ہے اگر اسی نقطۂ نظر سے براعظم (یورپ) کا کوئی بے لوث مبصر اٹھارھویں صدی کے وسط میں بالاختصار اس تاریخ کی رفتار کا پتہ چلاتا تو غالباً وہ یہی خیال کرتا کہ منظم ملکی سلطنتوں کی تکوین کا جو عمل مدت سے جاری ہے وہ اس طرف منجر ہوا ہے کہ حکومت کی آخری شکل اس طرز کی بادشاہی ہے جسے مطلق العنان[1] کہتے ہیں اور یہ حکومت کی وہ شکل ہے جس نے سیاسی ہیئت کی دوسری شکلوں کے ناکام ہوجانے کے بعد ایک متمدن سیاسی نظم کے قیام ودوام کو بہ حیثیت مجموعی کمال کو پہنچایا ہے۔

اس کے بعد عین اس وقت جب کہ یہ بادشاہی نہایت مستحکم طور پر قائم شدہ معلوم ہوتی تھی، اور خاص اس ملک (فرانس) میں جہاں اسے سب سے زیادہ شان وشکوہ حاصل ہوگئی تھی، خیال ورائے کی ایک ایسی تحریک شروع ہوئی جس نے بتدریج آزادی، مساوات اور عمومی حکومت کے لئے پرجوش مطالبہ پیدا کردیا اور اس مطالبہ نے سب سے پہلے پرزور طور پر شمال امریکہ کی عظیم الشان متفقہ جمہوریت کی قسمت کی تکوین وتعیین میں اس کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد اس کامیابی سے قوت حاصل کرکے اس نے فرانس کی بادشاہی کا تختہ الٹ دیا۔ بعد ازاں اس سے جو خطرناک تباہی برپا ہوئی اور پھر نپولین نے اسے اپنی فوجی مطلق العنانی سے بدل دیا۔ اس سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے باوجود کہ دوسرے ملکوں میں حب الوطنی کی پرزور تائید کے ساتھ نپولین کی اس جیرہ دست مطلق العنانی اور اس کے انقلابی سوابق کے خلاف رجعت قہقری پیدا ہوگئی، پھر بھی عمومی حکومت کی تحریک کو ان تمام

[1] میں نے بنظر اختصار اس اصطلاح کا استعمال روا رکھا ہے، اگرچہ اس میں بعض شرائط کی ضرورت ہے جیسا کہ ہمیں آگے چل کر معلوم ہوگا۔

ممالک میں جو مغربی یورپی تمدن میں شریک تھے، از سرِ نو زندگی حاصل ہو گئی، اس نے ترقی کی اور ایک بڑی حد تک اپنے مقصد کو حاصل کر لیا، تا آنکہ ڈیڑھ صدی گزر جانے کے بعد اس کے بجائے کہ مطلق العنان بادشاہی متمدن ملکی سلطنت میں حکومت کی معمولی شکل ہوتی، وہ عام طور پر صرف اس قابل سمجھی جاتی ہے کہ وہ نیم متمدن روس کے لئے موزون ہے اور مغربی یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس خطبۂ زیرِ بحث اور بعد کے خطبات میں میں یہ چاہتا ہوں کہ انھیں دونوں تحریکوں پر بحث کروں، جو اس مطلق العنانی کے پیدا کرنے کا باعث ہوئیں، اور اسکے بعد انہیں بادشاہی یا جمہوریت کی طرف رہبری کی۔ ایک نقطۂ نظر سے یہ دونوں تحریکیں ایک دوسرے کے قطعی مخالف ہیں۔ عام الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں، کہ ایک تحریک آزادی سے مطلق العنانی کی طرف جاتی تھی اور دوسری مطلق العنانی سے آزادی کی طرف۔ لیکن یہ خیال صرف ایک نقطۂ نظر سے ہے دوسرے نقطۂ نظر سے وہ دونوں ایک ہی مسلسل عمل کے جو ایک ہی منزل کو جا رہا ہو، دو مدارج ہیں۔ وہ منزل سیاسی معاشرت کے متعلق از منۂ وسطے کے تصور کے بالمقابل اس کا جدید تصور ہے۔ اس تمام مراتبِ عمل کے ایک مکمل و متوازن خیال کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس پر دونوں نقطہائے نظر سے بحث کیجائے۔

۲۔ لیکن اگر اس موقع پر میں قطع کلام کر کے اس آسان سے سوال کا جواب دوں، جو میرے مذکورہ بالا بیان سے پیدا ہوگا تو غالباً میرا یہ فعل منفعت سے خالی نہ ہوگا گر اس آسان سوال کا جواب ایسا آسان نہیں ہے میں نے سیاسی نظم معاشرت کے متعلق از منۂ وسطے و از منۂ جدیدہ کے تصورات کا ذکر کیا ہے مگر سوال یہ ہو سکتا ہے کہ جدید تاریخ کا آغاز کس وقت سے ہوتا ہے؟ اس سوال کا قطعی طور پر جواب دینا مشکل ہے کیونکہ از منۂ وسطے کے خیالات و واقعات سے جدید خیالات و واقعات کی طرف جو تغیر ہوا ہے وہ تدریجی و مسلسل ہوا ہے اور اس امر میں بہت اختلافِ رائے ہے کہ اس تاریخ کا تعین کہاں ہونا چاہئے مثلاً یہ کہتا ہوں کہ بلنچلی[1] اس تاریخ کے تعین میں ۱۷۴۰ء تک کی تاخیر کرتا ہے

---

[1] نظریہ سلطنت (Theory of the state) کتاب اول باب پنجم۔

وہ کہتا ہے کہ "اصلاح" کے زمانہ سے تقریباً ۱۷۴۰ء تک ہم یورپ میں عام طور پر جدید دور کے نوجوانانہ خصائص کے بجائے وہی پرانا زمانہ اور ازمنۂ وسطیٰ کے خصوصیات کا انحطاط دیکھتے ہیں اور ۱۷۴۰ء تک ہم یہ محسوس نہیں کرتے کہ کوئی نیا زمانہ آرہا ہے۔ میرا خیال بھی یہ ہے کہ اس بیان میں کسی حد تک صداقت موجود ہے اور اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب ہی یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے بادشاہوں نے اس تغیر کو تکمیل تک پہنچایا کہ وہ ایک حد سے بڑھے ہوئے جاگیری آقا ہونے کے بجائے زمانۂ جدید کے مطلق العنان بادشاہ بن گئے۔

ایک طرف تو یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جاگیری و نیم جاگیری دور میں (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) بادشاہی محض نیم جاگیرانہ تھی۔ دوسری طرف بادشاہی کے ساتھ جاگیری خیالات کے اثرات باقیات اس زمانے کے بعد تک عیاں رہے جب بادشاہی نے جاگیریت کو دبا دیا۔ ایک طرف جاگیری دور میں جہاں بادشاہ سب سے اعلیٰ جاگیری آقا ہوتا تھا وہیں اس کے تعلقات بہ حیثیت مجموعی تمام قوم اور قوم کے تمام ارکان کے ساتھ جاگیرانہ حیثیت سے کچھ مختلف بھی ہوتے تھے، یہ تعلقات قدیم جرمانی و رومانی شہنشاہی خیالات کے امتزاج سے پیدا ہوئے تھے، اور شاید اس میں کچھ رنگ ایشیائی بادشاہی کا بھی تھا جو "عہد نامۂ قدیم" سے ماخوذ تھا۔ دوسری طرف جب جاگیری و نیم جاگیری ادارات سلطنت جدیدہ کی ترقی کے سامنے ساقط ہو گئے تب بھی حقوق عامہ و حقوق خانگی کے جاگیرانہ طرز کا خلط مبحث بادشاہ کی ذات کے ساتھ وابستہ رہ گیا۔ بادشاہوں کے ذہن میں یہ جما ہوا تھا کہ وہ ایک طرح پر (اپنے ملک کی) سرزمین اور اس کے باشندوں پر مالکانہ حق رکھتے ہیں اور ان کی حیثیت محض ایک عہدہ دار سے کچھ زیادہ ہے جو ملک و قوم کی بہبود کو ترقی دینے کے لئے مقرر کیا گیا ہو۔ لوئی چہاردہم کے لئے فرانس کل کا کل بادشاہ کی ملک ہو گیا تھا، ۱۷۱۰ء میں جب اسے اپنی رعایا پر محصول لگانے کا عارضی تردد پیش آیا تو اسے اس خیال سے پھر تیقن ہو گیا کہ وہ اپنی رعایا کی تمام جائداد کا اصلی مالک ہے (علیٰ ہذا)، اگرچہ سلطنت مثل دیگر املاک کے حکمران کے لڑکوں میں تقسیم نہیں کی جا سکتی تھی تاہم اس وقت تک یہ صحیح سمجھا جاتا تھا کہ شاہی عقد کے ذریعہ سے مثل دوسری املاک کے سلطنتوں

کا بھی اتحاد ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہنوور کی بلا انگلستان کے سر اسی وجہ سے آئی۔ یہ خیال ان آثار باقیات سے تھا کہ بادشاہ اگر اپنی رعایا کو ایسے مناقشات کے متعلق جنگ کرنے کو بھیجتا ہو جن سے اس کی رعایا کا کوئی تعلق نہ ہو تو اس میں بادشاہ کی کوئی غلطی نہیں ہے۔ تغیر بتدریج ہوا مگر وسیع معنی میں بکلی کی طرح میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس کا زمانہ اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب سمجھنا چاہئے۔ اسی زمانہ کے قریب یہ ہوا کہ مغربی یورپ کے سربرآوردہ بادشاہوں کی نسبت عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا اور وہ خود بھی اپنے کو ایسا ہی سمجھنے لگے کہ وہ ایسے عام عہدہ دار ہیں جن کے ہاتھوں میں سلطنت کے اختیارات کے ہونے کی بابت یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ عام اغراض کے لئے مجتمع کر دئے گئے ہیں۔

تاہم میں تخیلات و سیاسات میں اس تغیر کو اتنا اہم نہیں قرار دیتا جتنا کہ بکلی نے خیال کیا ہے۔ سیاسی اختیار کی تقسیم میں اس سے فرق نہیں آیا، نہ اختیارات کے معمولی عملدرآمد پر اس کا کوئی قوی اثر پڑتا ہے، بس بکلی کی تاریخ میرے خیال میں تاثیر کی جانب منحرف ہو گئی ہے۔

دوسری طرف، عام خیال یہ ہے کہ جدید تاریخ کا آغاز ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ کے زوال سے سمجھا جائے، اور اس میں شک نہیں کہ جس سال میں مشرق کی قدیم رومانی شہنشاہی کے بجائے ترکوں نے ایک اول درجہ کی یورپی شہنشاہی کی حیثیت سے اپنے قدم جما لئے اور اس کے ساتھ ہی قسطنطنیہ سے یونانیوں کے ترک وطن کی وجہ سے مغربی یورپ میں علوم کی تجدید میں پر زور حرکت پیدا ہو گئی یہ سال ایک سے زائد اعتبارات سے پر از نزاکت سال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف نقطۂ نگاہ کے لحاظ سے جدید تاریخ کا آغاز مناسب طور پر مختلف اوقات میں مقرر کیا جا سکتا ہے۔

مگر اس موجودہ سلسلۂ بحث کی غرض کے لئے مجھے بکلی کی تاریخ جس طرح بہت بعد از وقت معلوم ہوتی ہے اسی طرح یہ تاریخ بہت قبل از وقت معلوم ہوتی ہے اس زمانے میں بادشاہی بدستور جاگیریت سے کشمکش میں مبتلا تھی، اور راز منہ وسطے کے پارلیمنٹی ادارات یعنی جمعیتہائے طبقات کی طرف سے وقتیں حائل ہو رہی تھیں البتہ فرانس میں شاہی کو صاف طور پر تقویت حاصل ہوتی جا رہی تھی اور پندرھویں صدی کے

ختم ہونے کے قبل شاہی کا غلبہ عارضی طور پر مکمل ہو گیا تھا، اور پندرھویں صدی کے اختتام پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ فرانس، انگلستان اور اسپین سب جگہ یکساں طور پر زور دار بادشاہ پیدا ہو گئے تھے اور شاہی کے غلبہ کی جانب نمایاں قدم بڑھ رہے ہیں، مگر یہ سلسلۂ عمل ہنوز نامکمل تھا، فرانس میں بادشاہی کی طاقت "اصلاح" کی کشمکش سے پھر کم ہو گئی سولھویں صدی کے اواخر اور سترھویں صدی کے اوائل میں جو ملکی مناقشات پے در پے برپا ہوئے وہ صرف مذہب پروٹسٹنٹ اور مذہب کیتھولک کی جنگ و جدل تک محدود نہ تھے، بلکہ امرا ابھی بادشاہ کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے انگلستان میں شاہان ٹیوڈر نے اپنی حکمرانی میں مطلق العنانی کے اظہار کو بہت ہوشیاری سے بچایا اور وضع قوانین پر پارلیمنٹ کی ظاہری نگرانی کو قائم رکھا۔ اسپین میں بھی اس وقت تک پارلیمنٹی روایات بدستور قوی تھے، اور فرڈیننڈ قوت کے بجائے زیادہ تر تدبیر و ہوشیاری سے اپنی بات چلاتا رہا۔ اسپین میں مطلق العنانی کا استحکام فلپ دوم (۱۵۵۶-۱۵۹۵) کے وقت میں ہوا، اور فرانس میں مطلق العنانی کے قیام و استحکام کا آخری و قطعی کام سترھویں صدی میں جلیل القدر رشلیو اور اس کے بعد مازارین کے ہاتھوں سے انجام پایا۔ کامل فتحمندی کے ساتھ بادشاہی کا قرار "فروند" کی کشمکش کے بعد ہوا۔ اسی طرح یہ دور سترھویں صدی کے وسط تک آ جاتا ہے اور یورپ میں بہ حیثیت مجموعی یہی وہ زمانہ ہے جب اس جانب نہایت ہی قطعی رجحان محسوس ہونے لگا ہے۔

چنانچہ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یورپ کی تاریخ میں مطلق العنانی کی جانب سب سے زیادہ حیرت ناک تغیر ۱۶۶۱ء میں ڈنمارک میں وقوع میں آیا جہاں بادشاہ نے شہریوں اور پادریوں کی مدد سے امرا کو مغلوب کر لیا۔ یہ شہری اور پادری امرا سے اس وجہ سے غضبناک تھے کہ وہ محصول میں اپنا موزوں حصہ برداشت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ۱۶۶۵ء میں بادشاہ نے ایک اساسی قانون کا نفاذ کیا جس کے بموجب خود اسے اور اس کے ورثا کو غیر محدود اقتدار اعلیٰ حاصل ہو گیا۔ پرتگال میں ازمنۂ وسطیٰ کی نیابتی جمعیت کورٹیز کا آخری اجلاس ۱۶۷۴ء میں ہوا، اور اسی صدی کے ربع ثالث (یعنی ۱۶۵۰ء سے ۱۶۷۵ء تک) میں برانڈن برگ، کلیو اور پروسین میں (جو بعد کو پروشیا کے اجزا بن گئے) وہ کارروائی جاری رہی جس کے ذریعہ سے

"والیٔ اعظم" نے طبقات کی جمعیتوں کے اختیارات کو توڑنا شروع کر دیا اور باوجود شدید مقاومت کے اپنے شاہی اختیار کو ان جمعیات کے مالی اقتدار سے آزاد کرنے لگا کم از کم پروشیا میں تو ایسا ضرور ہوا۔

پس اپنے موجودہ مطالعے کے نقطۂ نظر سے اس معرکۃ الآرا سوال کا کہ "جدید تاریخ کس وقت سے شروع ہوتی ہے" اس طرح جواب دینا چاہتا ہوں کہ اس کے آغاز کو سترھویں صدی کے وسط میں قرار دوں اور "نشاۃ جدید" اور "اصلاح" اور اس کے بعد کے مذہبی مناقشے کے دور کو یہ قرار دوں کہ وہ ازمنۂ وسطےٰ وازمنۂ جدید کے خیالات کے درمیان ایک طولانی اور انقلابی دور کا کام دیتے ہیں۔ سترھویں صدی کے وسط میں (۱۶۴۸ء کے) معاہدۂ وسٹ فیلیا نے مذہبی جنگوں کا دور ختم کر دیا تھا اور اسی وقت اس کے کچھ بعد یہ صاف عیاں ہو گیا کہ مغربی یورپ کی بیشتر سلطنتوں میں بادشاہی سلطنت کے اندر کے ان عناصر پر غالب آ گیا تھا جو اس کے خلاف جد و جہد کر رہے تھے اور جو امرائے عظام ازمنۂ وسطےٰ میں بادشاہ کی سطوت و شوکت کے حریف بنے ہوئے تھے ان کے جانشینوں پہ بادشاہ کو قطعی غلبہ حاصل ہو گیا تھا۔ منقسم عالم عیسوی کی کمزور شدہ مذہبی طاقت پر بھی بادشاہوں کو آخر الامر فوقیت حاصل ہوئی حالانکہ جب مغربی عالم عیسوی متحد تھا تو اس مذہبی طاقت کے دعاوی بہت دور تک پہنچے ہوئے تھے اور تیرھویں صدی میں تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ جانشین مسیح کو دنیاوی بادشاہوں اور حکمرانوں پر ایسا اقتدار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ اپنی مرضی سے انھیں معزول کر سکتا ہے۔ بادشاہوں نے ایک بڑی حد تک ان شہروں کو اپنی حکومت میں جذب کر لیا تھا جنھوں نے مغربی یورپ کے مختلف حصص میں بہت کچھ خود مختاری حاصل کر لی تھی، اور انجام کار میں یہ بادشاہ اکثر صورتوں میں ان نیابتی جمعیتوں پر بالکلیہ حاوی ہو گئے تھے جنھوں نے دور تقلیب کی صدیوں میں (جبکہ مغربی یورپ کی سلطنتیں جاگیریت کے تحلیل و انتشار کے باعث ترقی کر رہی اور مملکت جدیدہ کے کامل تر اتحاد و تنظم کی طرف جلد جلد قدم بڑھاتی جا رہی تھیں) بادشاہوں کی قوت کو روکا اور اس میں توازن پیدا کیا تھا۔ اس طرح بادشاہوں کے غلبے کی وجہ سے آخر الامر تمام مغربی یورپ میں ایسی سلطنتیں قائم ہو گئیں جن کا اندرونی ارتباط، اتحاد و تنظم،

اس منقسم اقتدار (مشکوک) ارتباط اور ناکمل نظم سے نمایاں طور پر مغایر معلوم ہوتا ہے جو ازمنۂ وسطے کے ادارات کے خصوصیات میں داخل تھے۔

۳۔ ہم اس تقلیب پر اب زیادہ گہری نظر ڈالیں، جب ہم ازمنۂ وسطے میں انسان کے سیاسی و معاشری تعلقات کا مقابلہ ان تعلقات سے کرتے ہیں جو یونانی و رومانی تاریخ سے ظاہر ہوتے ہیں یا اس دور کے تعلقات سے کرتے ہیں جسے میں "جدید" کے لفظ سے ممیز کرتا ہوں تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ ان میں (جواز قانونی و عدم جواز قانونی) کا عجیب و غریب اجتماع پایا جاتا ہے۔ ان میں باضابطہ جواز قانونی کی خصوصیت اس وجہ سے موجود ہے کہ ہر شخص کو حقوق حاصل ہیں۔ یہ قدیم جمہوریات کی تہذیب و تمدن کے مقابلہ میں بہت بڑی ترقی ہے جن میں ایک بہت بڑا طبقہ غلاموں کا ہوتا تھا جو از روئے قانون اپنے آقاؤں کی ملک ہوتے تھے تخت نشین بادشاہ سے لیکر کدال چلانے والے نیم غلام تک ازمنۂ وسطے کے ہر طبقے کے اہم حقوق تھے جو قانون و رواج کے ذریعے سے محفوظ تھے، لیکن اس کے بعد ازمنۂ وسطے کی سلطنتوں میں عملاً خلاف قانون حالات کی صورتیں بھی موجود تھیں کیونکہ کسی شخص کو کافی طور پر یہ طمانینت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کر سکتا تھا۔ جب حقوق کی نسبت کوئی مناقشہ برپا ہوتا تھا اور حیران کن تنوع، پیچیدگی اور تغیر کی وجہ سے ایسے واقعات اکثر پیش آتے رہتے تھے، یا جب چیرہ دستی کے ساتھ ان حقوق کی علانیہ خلاف ورزی کیجاتی تھی تو سلطنت کے اندر کوئی مرکزی اعلی قوت ایسی نہیں تھی جو اس مناقشے کا تصفیہ قطعی طور پر کر سکے اور اگر کوئی شخص یا گروہ اس فیصلے سے علانیہ سرتابی کرے تو قوم کی منضبط مادی قوت اپنے ناقابل اندفاع زور سے اسے پامال کردے۔

لیکن جدید سلطنت کے مسلمہ عام نظریئے میں اس قسم کی قوت کا ہونا لازمی فرض کر لیا گیا ہے۔ درحقیقت سیاسی قوم کی جو تعریف عام طور پر کیجاتی ہے یہ مفہوم خود اس تعریف میں داخل ہے حکومت کے تشریعی، عاملی و عدالتی اعضا کے تقرر، فرائض اور باہمی تعلقات کے بہترین طور پر طے کرنے کی بابت زمانۂ جدید کے تمام مباحث میں حکومت کی مختلف شکلوں کے درمیان جو کچھ بھی اختلاف ہو

لیکن کہیں نہ کہیں کوئی طاقت ایسی ہوگی جو آخری طور پر یہ قرار دے سکے کہ قانون کیا ہے اور جو خاص مناقشات پیدا ہوں ان کے طے کرنے میں وہ اس قانون کا قطعی نفاذ کر سکے اور کارگر طور پر اسے عمل میں لاسکے۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ مغربی یورپ کی ہر ایک سلطنت میں اس قسم کی طاقت اپنی مکمل حالت میں موجود ہے لیکن اگر مکمل حالت میں نہیں تو کم از کم اس کے غیر مکمل وجود سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ فسانہ وار دلچسپی کا وہ عنصر جو از منۂ وسطیٰ کے معاشرے میں اس امر سے پیدا ہوگیا تھا کہ افراد و طبقات اگر چاہیں تو اپنے حقوق کے لئے خود جنگ کرنے کے لئے آمادہ رہیں، یہ دلچسپی فی الجملہ (وسیع معنی میں) جدید سیاسی معاشرے سے معمولی حالات کے اعتبار سے مفقود ہو چکی ہے۔

یہی وہ نقطۂ نظر ہے کہ جب ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو مطلق العنان بادشاہی کی تقلیب یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ اس راستہ کی ایک منزل ہے جس کی ایک آگے کی منزل انیسویں صدی کی آئینی بادشاہی ہے۔ بادشاہی کی فتحمندی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطنت کے اندر تمام دوسرے اقتدارات کو موثر طور پر بادشاہ کے اقتدار کے تحت میں لاکر پہلی مرتبہ تقریباً مکمل اتحاد و نظم کا شیوع عمل میں آیا ہے، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ایسا ہونا ہی اس سوال کی توجیہ کا ایک اہم جزو ہے کہ کیوں تغیر واقع ہوا۔ تمدن کی آہستہ رو ترقی جس قدر بڑھتی رہی اسی قدر مکمل انتظام کی ضرورت بھی زیادہ شدت سے محسوس ہوتی گئی اور اس لئے پر زور افراد یا جماعات کی طوائف الملوکی کی مقاومت کے زیادہ کامل طور پر دبانے میں رائے عامہ کی تائید روز بروز زیادہ حاصل ہوتی گئی۔ قومی اتحاد کے جذبے نے ترقی کی اور اس کے ساتھ اس احساس نے بھی کہ نہ صرف اندرونی نظم و امن کے لحاظ سے بلکہ غیر اقوام کی کشاکش میں تقویت حاصل کرنے کے لئے بھی اس اتحاد کو اور زیادہ مکمل بنانا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے کوئی شے جو قوم کے اندر "شاہی در شاہی" قائم رکھنے کی طرف مائل ہو اسے یہ جذبۂ حب الوطنی نفرت و بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتا تھا اور اس لئے اس قسم کے تمام طوائف الملوکانہ قومی میلانات کے ساتھ بادشاہ کی جنگ و جدل میں یہ جذبہ بادشاہ کی پر زور تائید کرتا تھا۔

یہ قوتیں تغیر پذیر اور مختلف حیثیت و حالت کی تھیں اور اس لئے بادشاہی کی بنا پر زیادہ تکمیل نظم وامن کے حصول کی جد وجہد میں طوالت واقع ہوی اور اکثر صورتوں میں اس میں نمایاں مدوجزر بھی ہوتا رہا ۔ پرزور بادشاہ کے تحت میں بادشاہی کو قوت حاصل ہو جاتی تھی مگر زیادہ تر باہستگی اور پھر کمزور بادشاہ کے تحت میں یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ قوت زائل ہو گئی اور کبھی کبھی یہ ابتری دفعۃً واقع ہوتی تھی ۔ یہ بھی نہیں ہوتا تھا کہ اس کشاکش میں ہمیشہ بادشاہ کو ہی فتح حاصل ہو جیسا کہ رومانی جرمانی شہنشاہی میں ہوا لیکن اگرچہ جرمنی میں خود بادشاہ مظفر و منصور نہ ہوتا ہو مگر شاہی شکل حکومت یہاں بھی زیادہ فیروزمند رہی کیونکہ ماتحت حکمران عملاً بادشاہ ہو گئے ۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بادشاہ کو قوم کے ہر ایک عنصر کے ساتھ باری باری سے کشمکش کرنا پڑی ۔ کبھی امرا کے ساتھ، کبھی شہروں اور کبھی مذہبی جماعتوں کے ساتھ، اور مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں کے لحاظ سے اس کشمکش نے ہر ایک واقعۂ خاص میں مختلف صورتیں اختیار کیں ۔ کبھی کبھی پرزور امراان دوسرے خاندانوں کی بھی نمائندگی کرتے تھے جنھیں قدیمی امتیازات اور بڑی جاگیریں حاصل تھیں جن سے وہ بادشاہ کے حریف بنے ہوے تھے ۔ جب یہ لوگ زیر ہو جاتے تھے تو کبھی کبھی یہ کشمکش خود شاہی خاندان کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کے ساتھ شروع ہو جاتی تھی جنھیں موروثی بادشاہوں نے متمول و قوی بنا دیا تھا جیسا کہ فرانس میں واقع ہوا ۔ سابق جاگیری زمانوں میں یہ کشمکش بالعموم طاقتور باجگزاروں کے ساتھ فرداً فرداً ہوتی تھی پھر اس کے بعد جب اتحاد و اتفاق کا میلان بڑھا تو یہ کشمکش امرائی لیگوں یا انجمنوں سے یا جیسا کہ شاید جرمنی میں ہوا شہروں کی لیگوں کے ساتھ ہونے لگی ۔ علیٰ ہذا کلیسائی ادارات کے ساتھ جو تصادم ہوا اس نے بھی مختلف صورتیں اختیار کیں ۔ بارھویں اور تیرھویں صدیوں میں یہ کشمکش مغربی عالم عیسوی کے ایک کلیسا کے ساتھ ہوی جو روما کے اس غیر ملکی حکمراں کے تحت میں متحد تھا جس کا مقصد اپنی مذہبی حکومت کی فوقیت کا قائم کرنا تھا ۔ اس کے برخلاف اس کی بادشاہی کے آخری غلبے کے عین ماقبل جو دور گزرا ہے جسے مراعات پر لوتھر کے اعتراض کرنے کے وقت سے صلح وسٹ فیلیا تک کا زمانہ کہنا چاہیئے اس دور میں کلیسا جن اجزا میں منقسم ہو گیا تھا وہ مغربی یورپ کے سیاسی نظم و ترتیب کو

ابتر کردینے کی دھمکی دے رہے تھے کیونکہ ان اجزا کے حدود تقسیم مختلف قوموں کے حدود تقسیم کو منقطع کرتے تھے۔ لیکن ان تمام حادثات و تغیرات کے درمیان ان عام میلانات کا غلبہ جو بادشاہی کو فتحمندی کی جانب لئے جا رہے تھے، اور بھی زیادہ نمایاں طور پر ظاہر تھا، تمدن و تہذیب کی ہوا اسی کے موافق چل رہی تھی کیونکہ شاہی قوت کی ترقی کے ساتھ ساتھ عملاً یہ لازمی تھا کہ سیاسی نظم و امن کو بھی ترقی ہو۔

۴۔ جب ہم اس سوال کی منفی حیثیت سے اس پر غور کرتے ہیں اس وقت بھی اس امر سے کہ بادشاہی قوم کے اتحاد کی نمائندگی کرتی تھی ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ ازمنۂ جدیدہ کی سلطنت کے لئے جس مزید نظم و امن کی ضرورت تھی وہ اول ہی سے اس آئینی بنیاد پر کیوں نہیں قائم ہو سکتا تھا جو اسے واقعاً انیسویں صدی میں حاصل ہوئی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا جواب مجملاً یہ ہے کہ ازمنۂ وسطے کے آخری حصہ میں بادشاہ کو جن طبقات سے سابقہ پڑتا تھا اور حکومت کے کام چلانے کے لئے کسی نہ کسی طرح ان کی رضامندی حاصل کرنا تھی، ان طبقات کی حالت یہ تھی کہ جب یہ لوگ جمعیتہائے طبقات میں مجتمع ہوتے تھے اس وقت یہ بالعموم اس قابل نہیں ہوتے تھے کہ ایسا کامل و پائدار اتحاد پیدا کریں جو بتدریج طبقوں کی نمایندگی کو قوم کی نمایندگی میں بدل دے۔ انگلستان اس میں ایک استثنا ہے اور میں اس کی لم کی تشریح کر چکا ہوں لیکن اکثر صورتوں میں ازمنۂ وسطے کی جمعیتوں میں مختلف طبقوں کے نمائندے (جن کے متعلق سابق خطبہ میں بحث ہو چکی ہے) خالصاً و ظاہراً اپنے مخصوص فوائد کے نمائندے و حامی رہتے تھے، جس کی وجہ سے بادشاہ کے بالمقابل جد و جہد میں وہ دوہری کمزوری میں مبتلا ہو جاتے تھے ایک تو باہمی عدم اتحاد کی کمزوری تھی؛ دوسری کمزوری اس وجہ سے لاحق ہو جاتی تھی کہ نمائندوں کا ہر ایک گروہ کل کے اغراض کے مقابلہ میں ایک جزو کے اغراض کی حفاظت کرتا یا اس کا اظہار کرتا تھا، وہ ایک حصہ کے امتیازات خاص کو قوم کے مشترک اغراض کے مقابلہ میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا، اور جیسا کہ ہم ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں انھیں حکومت میں حصہ حاصل کرنے کا موقع انھیں مالیات کی وجہ سے مل سکتا تھا اور یہی وہ موقع تھا جہاں مختلف اغراض کی علحدگی زیادہ شدت کے ساتھ نمایاں ہوتی تھی۔

لیکن جب ہم پیچھے مڑکر دیکھتے ہیں تو علاوہ اس کمزوری کے جو ان جمعیتوں میں پائی جاتی تھی جو ازمنۂ وسطےٰ کے آخری حصہ میں اقتدار اعلیٰ کے لئے بادشاہ کی حقیقی یا اغلبی حریف معلوم ہوتی تھیں، یہ امر آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ کیوں خالص بادشاہی کو وہ پہلی شکل ہونا چاہئے تھا جس میں واقعتاً اقتدار اعلیٰ کا وہ تصور مجسم ہوکر نمودار ہوا جو نظم وامن کے قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا۔ درحقیقت ہمیں اس خاص صورت پر صرف اس دلیل کے عاید کرنے کی حاجت ہے جو میں اپنے پہلے خطبے میں اس امر کے متعلق بیان کرچکا ہوں کہ حکومت کی دوسری شکلوں کے مقابلے میں متمدن نظمہائے معاشرت کے اندر بادشاہی کو عام طور پر کیوں غلبہ حاصل ہوجاتا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کسی طرح کی حکومت کیوں نہ ہو اس میں استقامت، عزم وعمل کے حاصل کرنے کے متعلق ہمارے ذہن میں جو تصور قائم ہے اس کے حصول کے لئے سب سے زیادہ سادہ وکارگر صورت یہی بادشاہی کی ہے۔ اگر ہم اس مقصد کو ازمنۂ وسطےٰ کے آخری دور کے اصحاب فکر کے عالمانہ انداز میں بیان کریں تو یوں کہیں گے کہ وہ "اتحاد" جو ایک منتظم سلطنت کی خصوصیت خاص ہونا چاہئے اس کا حصول سب سے زیادہ آسانی سے اس طرح ہوسکتا ہے کہ اسے اس فرد کی حکمرانی کے تحت میں رکھا جائے جو حقیقتاً واصلاً ایک ہے۔

میرا خیال ہے کہ اقتدار اعلیٰ کا جدید اصول مسلمہ، جب پہلی مرتبہ یورپ کے سیاسی خیال کی تاریخ میں نمودار ہوا اگر ہم اس کی جانچ کریں تو خیال کا یہ میلان بہت ہی نمایاں طور پر واضح ہوجاتا ہے۔ نہ ان بودین (بوڈینوس)، وہ مصنف ہے جس نے سب سے پہلے اس مسلمہ کو صفائی اور پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا اور اس نے اپنی جلیل القدر تصنیف ڈی ریپبلیکا (۱۵۷۷ء) میں [1] جس طرح اس کی توضیح وتشریح کی ہے، جب ہم اس کی جانچ کرتے ہیں تو ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگرچہ اصولاً یہ مسلمہ جس طرح بادشاہی پر عاید ہوتا ہے اعیانیت وعمومیت پر اس سے کم عاید نہیں

[1] ۔ بودین کی کتاب کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ علم سیاست کے متعلق زمانۂ جدیدہ کی پہلی باقاعدہ تصنیف ہے مگر اسے ایک عارضی تصنیف سمجھنا زیادہ بہتر ہے۔

ہوتا لیکن جیسا کہ سر فریڈرک پولک نے کہا ہے بودین فوراً اس طرف مائل ہوگیا ہے کہ جن سلطنتوں میں بادشاہ کا وجود ہے وہاں نظریاتی فرمانروا کو حقیقی بادشاہ کے مرادف قرار دے۔ آسٹن[1] کی طرح اس کی بھی یہ رائے ہے کہ ہر ایک خود مختار قوم میں جس پر قانون کی حکومت ہوتی ہو ایک ایسی طاقت ہونا چاہئے جس سے قوانین جاری ہوں اور جو قانون کو قائم رکھے کیونکہ یہ ایک فضول و مہمل خیال ہے کہ قوانین کو پتھر کی لکیر اور ناقابل تنسیخ سمجھ لیا جائے۔ اس سے بحث نہیں کہ یہ طاقت ایک شخص واحد میں مرکوز ہو یا مختلف شخصوں کو حاصل ہو اور چونکہ یہ طاقت قانون کا منبع ہوگی اس لئے وہ خود قانون سے بالاتر ہوگی اور اس لئے قانوناً اس کی تحدید و تحدید نہیں ہوگی[2] میں کہتا ہوں کہ اصولاً وہ اس غیر محدود طاقت کو ان تمام حکومتوں میں موجود پاتا ہے جو حکومت کے نام کی اہل ہیں وہ اسے خود مختار سلطنت کی ہستی کے لئے لازمی قرار دیتا ہے۔ درحقیقت اس کی کتاب میں ازمنۂ وسطے کے تصورات کے مقابلہ میں جدید سلطنت کا عام اساسی تصور نظر آتا ہے اور واقعی حکومتوں کی ترتیب وہی میں وہ اصولاً یہ چاہتا ہے کہ وہ بالکلیہ واقعات کے زیر ہدایت چلیں۔ لیکن عملاً جب وہ اس اصول کا اطلاق موجود فی الخارج سیاسی امور پر کرنا چاہتا ہے تو اس کا میلان شدت کے ساتھ اس طرف ہو جاتا ہے کہ اگر اس سے ممکن ہو تو وہ نظریاتی صاحب اقتدار اعلےٰ کو حکمراں بادشاہ کے مرادف بنا دے۔ اس کے وقت کی جرمانی شہنشاہی کی صورت میں ایسا کرنا درحقیقت واقعات سے جنگ کرنا تھا اس لئے وہ شہنشاہی کی حکومت کو اعیانیت کے تحت میں شمار کرتا ہے مگر اسے اس میں شک نہیں ہے کہ نظریاتی صاحب اقتدار اعلیٰ کو وہ جس غیر محدود اختیار سے متصف کرتا ہے فرانس کے بادشاہ کو وہ اختیار حاصل تھا

---

[1] ۔ تاریخ سیاسیات صفحہ ۴۹۔

[2] ۔ یعنی قطعی قوانین کے ذریعہ سے اس کی تحدید نہیں ہوگی کیونکہ بودین کے ذہن میں یہ نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے انکار کرے کہ صاحب اقتدار اعلےٰ قانون قدرت کے حصر سے بھی باہر ہیں۔

جیسا کہ میں بعد کے ایک خطبے میں ظاہر کروں گا اس کے بعد کی صدی میں ہابس کے متعلق بھی کم وبیش یہی کہا جا سکتا ہے۔ مطلق العنانی کے متعلق اس کا اصول مسلمہ بادشاہی اعیانیت وعمومیت کے درمیان قطعاً غیر جانبدارانہ حیثیت رکھتا ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ اس کا میلان بادشاہ کی جانب تھا۔ اس کے عام نظریے کا مطالبہ یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں مطلق العنان طاقت موجود ہونا چاہیئے مگر بادشاہ کے اندر اس طاقت کے مرکوز ہونے کو وہ مرجح سمجھتا ہے۔

خطبۂ بست و سوّم

مطلق العنان بادشاہی کی جانب میلان (بسلسلۂ سابق)

ا۔میں نے سابق خطبے میں واقعات وخیالات کی یکساں تحریک کی جس مختصر خصوصیت کے دکھانے کی کوشش ہے اس سے میرے خیال میں اس تسبب کی خاص روش معلوم ہو جاتی ہے جس نے بتدریج وبہ تغیر حالات مگر فی الجملہ قطعی طور پر سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کی خالص بادشاہی کی جانب رہبری کی ہے لیکن جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ہمیں مسیحی دینیات اور رومانی قانون کے خاص اثرات کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے ہیں اس کے قبل یہ بھی ظاہر کر چکا ہوں کہ ایک حد تک ان دونوں صورتوں میں اور خاص کر رومانی اصول قانونی کے معاملہ میں محو شدہ رومانی شہنشاہی کا بالواسطہ اثر بھی پڑا ہے۔ ہمیں چاہیئے کہ ان میں سے ہر ایک کی جانچ کریں اور پہلے دینیات کے اثر کو لیں جس پر بہت فکر کے ساتھ بحث کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ درحقیقت یہ اثر پیچیدہ ہے اور اس کے مختلف عناصر مختلف طریق پر عمل کرتے ہیں۔

بعض وقت یہ کہا جاتا ہے کہ پادری "بادشاہوں کے "حقوق ربانی" کے جس اصول کا وعظ (مثلاً سترھویں صدی میں) بادشاہ کی طرفداری میں کہا کرتے تھے وہ ازمنۂ وسطے کا اصول تھا۔ یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر صرف ایک حد تک اس میں شک نہیں کہ سترھویں صدی کی راسخ الاعتقاد مسیحیت کا یہ اصول نظام عالم

اور انسانی معاشرے کے متعلق ازمنۂ وسطی کی رائے و خیال کا بقیہ یادر نہ تھا مگر یہ ایسا بقیہ تھا کہ حالات متغیر ہو گئے اور یہ اصول بدستور باقی رہا، اس لئے اس کا سیاسی اثر بالکل ہی بدل گیا تھا۔ لاریب کہ ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر یہ دعوی کرتے تھے کہ جائز بادشاہ، بانی حقوق کی رو سے حکومت کرتا ہے لیکن اس مسلمہ سے بادشاہوں کے شاہی اختیارات کا تعین اس سے بہتر نہیں ہو سکتا تھا جتنا کہ زمانۂ جدید کے کسی قدیم الخیال عیسائی کی رائے میں انجیل کے اس مسلمہ اصول سے کہ "جو اختیارات الحال موجود ہوں وہ خدا کی مرضی سے ہیں"، برطانی دستور سیاسی میں حکومتی فرائض کی تقسیم کا تعین ہو سکتا ہے۔ ازمنۂ وسطے کے خیال کے مطابق تمام قدرت اور تمام سیادت خدا کے حکم سے اور خدا کی جانب سے تھی۔ بر سبیل تقریر، یہ مقولہ شاہ فرانس پر اس سے زیادہ صادق نہیں آتا تھا جتنا ان امرائے عظام پر صادق آتا تھا جو اپنے ایسے موروثی حقوق کے بموجب جن میں بادشاہ نہ کمی کر سکتا تھا اور نہ انھیں واپس لے سکتا تھا، اسی بادشاہ کے تحت میں جاگیروں پر قابض تھے۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی صحیح ہے کہ ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر اپنے مخصوص اصول دینیات کی وجہ سے بادشاہی کو سب پر ترجیح دیتے چلے جاتے تھے۔ ان کے خیال میں حکومت کی بہترین شکل وہ تھی جو تمام کائنات پر ایک خدائے عز و جل کی حکومت سے قریب ترین مشابہت رکھتی ہو۔ چنانچہ "حکمرانی والیان ملک" نامی کتاب میں (جو ٹامس اکوئی ناس کی جانب منسوب کی جاتی ہے) یہی دلیل پیش کی گئی ہے۔ چونکہ مذہب عیسوی کا نشو و نما بادشاہی کے تحت ہوا تھا اس لئے سیاسی نظم کے متعلق کلیسا کا فطری تصور بادشاہی کا تھا۔ نیز اعلی دنیاوی حکمراں کی تقدیس کے ذریعہ سے کلیسا کے اقتدار حاصل کرنے کا دعوی بھی بالطبع بادشاہی سے مطابقت رکھتا تھا، یہ خیال کرنا مشکل تھا کہ کسی مجلس یا جمعیت عامہ کی تقدیس موثر اسم کے ذریعہ سے عمل میں آسکتی تھی۔ اس لئے عیسائیت کا خیال اولاً و ابتداءً شاہی کا تھا لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ یہ تخیل ارباب فکر کو اس طرف نہیں لیجاتا کہ جب وہ عالم عیسوی کا اتم و اکمل خیال اپنے ذہن میں قائم کریں تو مغربی عالم عیسوی نیں جو جداگانہ قومیں قطعی طور پر منضبط ہو گئی تھیں، ان کے بادشاہوں کے قطعی خود مختارانہ اقتدار اعلی کو اصولاً تسلیم کریں۔ کم از کم یہ کہ ان کی اولین حالت میں اور ازمنۂ وسطے کے نہایت ہی قطعی تصور کے موافق

یہی کیفیت تھی) اس خیال نے زیادہ تر ارباب فکر کے دلوں میں یہ امنگ پیدا کی کہ ایک ایسی بادشاہی تنظیم ہو جس میں ایک ہی سرگروہ کے تحت میں تمام عیسوی دنیا متحد ہو جائے۔ ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر کے خیال کے بموجب بنی نوع انسان کا تمام نظم معاشرت اپنی منتہائی حالت میں نہ صرف ایک عالمگیر کلیسا میں منضبط ہونا چاہئے بلکہ اسے ایک عالمگیر دنیاوی ملت بھی بننا چاہئے کلیسا کو شاہانہ طور پر ایک پوپ کے تحت میں اور دنیاوی نظم سلطنت کو ایک شہنشاہ کے تحت میں منضبط ہونا چاہئے جن میں سے ہر ایک انجیلی قصص کی ان "دو تلواروں" میں سے ایک تلوار سے کام لے جو مذہبی اور دنیاوی حکومت کی علامت قرار دی گئی تھیں۔

ان دینی دنیاوی دو تلواروں اور دو حکومتوں کی اس حقیقی دوگونہ نوعیت کے اعتبار سے جس طریق پر عیسوی نظم سلطنت کے حقیقی اتحاد کا قائم رکھنا منظور تھا اس کے سوال کے متعلق جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ازمنۂ وسطے کے خیالات کے تمام دوران میں اصولی بحثیں بر پا رہیں، گو ازکمہلڈے براند گے وقت سے تو ایسا ہی رہا۔ اس مذہبی فریق کی رائے کے مطابق جو انوسنٹ سوم اور بونی فیس ہشتم کے دعاوی کی تائید کرتا تھا یہ اتحاد اس طور سے حاصل ہو سکتا تھا کہ دنیاوی تلوار کو سیدھی طرح پر مذہبی تلوار کے تابع کر دیا جائے (ان کی دلیل یہ تھی کہ) پوپ خدا کی جانب سے اخلاقی مسائل کا اعلیٰ فیصلہ کن مقرر کیا گیا تھا اور چونکہ سیاسیات کے تمام مسائل دراصل اخلاقیات کے ہی مسائل ہیں اس لئے جیسا کہ بونی فیس کا دعوی تھا پوپ خدا کی جانب سے تمام بادشاہوں اور بادشاہیوں سے بلند تر تخت عدالت پر بٹھایا گیا ہے' یہ دعاوی اگر پورے ہو جاتے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ تمام مغربی عالم عیسوی کلیۃً ایک مذہبی نظم سلطنت میں بدل جاتا حالانکہ کبھی ایک لمحے کے لئے بھی عملاً ایسا نہیں ہوا لیکن ازمنۂ وسطے کے ارباب فکر کا ایک ذی اثر گروہ ان دعاوی کی پر زور قدح کر رہا تھا اور وہ مذہبی حکومت کی اعلیٰ منزلت کی تعبیر یہ کرتا تھا کہ اس کے معنی صرف یہ ہیں کہ بنی نوع انسان کی اس اخلاقی بہبود کو اعلیٰ اہمیت حاصل ہے جس سے مذہب کا تعلق ہے' اس کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسا حق شامل ہے جو دنیاوی حکمرانوں پر ان کے حد اقتدار کے اندر ان پر غالب آجائے' اور اسلئے

یہ ارباب فکر عالم عیسوی کے منتہائے اتحاد کو ربانی سرگروہ میں مرکوز بتاتے تھے جس کی نمائندگی مذہبی و دنیاوی حدود کے اندر بالترتیب پوپ اور دنیاوی بادشاہ کے ذریعہ سے ہوتی تھی۔

بعد ازاں جبکہ شہنشاہی کی روز افزوں کمزوری نے شہنشاہ کے تحت میں دنیاوی اتحاد کے عدم امکان کو روز بروز زیادہ واضح کر دیا تو سیاسیات پر لکھنے والے کلیسائی گروہ نے معاً علیحدہ علیحدہ قوموں کی بادشاہی کی بے لیت و لعل تائید نہیں شروع کر دی کیونکہ دنیاوی طاقت کے ساتھ ان کے تصادم نے انھیں یہ راستہ دکھایا کہ وہ بلا واسطہ ربانی مبداء حکمرانی مذہبی کے بالمقابل سلطنت کے فطری مبداء پر زور دیں کہ یہ طریق بھی راہِ دور و دراز سے اسی منزل مذہبی کو پہنچ جاتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ازمنۂ وسطے کے موخر زمانہ میں یعنی تیرھویں صدی کے بعد سے یہ نہایت ہی مسلمہ اصول ہو گیا تھا کہ دنیاوی حکومت کی بنا قوم کی رضامندی پر ہے کیونکہ قوم کو یہ خلقی حق حاصل ہے کہ وہ اپنے لئے حکومت کی جس شکل کو چاہے اختیار کرے۔ پس اس طرح اگرچہ یہ مسلمہ کہ "حکمراں خدا کا نائب ہے" باقاعدہ ترک نہیں کر دیا گیا تھا مگر عملاً یہ مسلمہ بے حقیقت سا ہو گیا اور اب بادشاہی کو اس سے کسی قسم کی تائید و تقویت نہیں حاصل ہوتی تھی۔ اس کے بعد مذہبی مناقشات کے تمام زمانے میں مذہب عیسوی کا اثر مخلوط و متنوع رہا۔ کیتھولک اور پروٹسٹنٹ جب (اپنی ضد یعنی) بالترتیب پروٹسٹنٹ اور کیتھولک حکومتوں کے تحت میں رہتے تھے تو دونوں میں یہ قوی میلان پایا جاتا تھا کہ بادشاہی کو دوسری طاقتوں کے تحت میں لانے کے سیاسی اصول کی جنبہ داری کریں۔ لیکن ۱۶۴۸ء کے بعد جب یہ دور ختم ہو گیا اور عالم عیسوی کے مسلسلہ حصوں نے ہمیشہ کے لئے ان مذہبی کوششوں کا خاتمہ کر دیا کہ مذہبی حکومت کی کوئی تنظیم پوپ کے تحت میں قائم کی جائے، تو پھر اصلاح شدہ اور کیتھولک دونوں فرقوں کا حاوی اثر قطعی طور پر بادشاہی کی طرف ہو گیا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم و امن اور خاصکر مذہب میں نظم بادشاہی کی تائید کا جو فطری میلان موجود تھا اب اسے پورے طور سے پھلنے پھولنے کا موقع مل گیا، چنانچہ اس نص کی کہ "موجود الوقت اختیارات خدا کی مرضی سے ہیں" سترھویں صدی میں راسخ الاعتقاد مصنفوں نے

یہ تفسیر کی کہ کوئی عیسائی جائز بادشاہ کی مقاومت کرنے کا قانوناً مجاز نہیں ہے[1]
پس بہ حیثیت مجموعی "اصلاح" اور اس کے نتائج بادشاہی کی طرفداری میں اہم اثر رکھتے تھے، مناقشہ کی صدی ختم ہو جانے کے بعد ان ملکوں میں بھی جو نہایت ہی خالص طور پر کیتھولک تھے، دنیاوی فرمانروائی کے متعلق پوپ و بادشاہ کی رقابت اس طرح ختم ہو گئی کہ پھر کبھی واپس نہیں آئی۔ کلیسا کو اپنا بہترین مفاد اسی میں نظر آتا تھا کہ وہ بادشاہ کی جانب مائل رہے، اس سے مادی تائید حاصل کرے اور خود اسے اخلاقی تائید پہنچائے، اور ان ممالک میں جہاں اینگلیکی یا لوتھری عقیدہ رائج تھا کلیسا کی جانب سے تاج کی اطاعت اور بھی نمایاں تھی۔

اصلاح کی وجہ سے عالم عیسوی میں جو تفرقہ پڑ گیا تھا اس کا وسیع میلان دنیاوی طاقت کو تقویت دینے کا تھا اور اس کی سب سے زیادہ نمایاں مثال اسپین کی حالت میں ملتی ہے۔ اصلاح کے بعد کے دور میں اسپین راسخ الاعتقاد مذہب کیتھولک کے عظیم الشان پشت پناہ کی حیثیت سے نمایاں ہوا، یہ وہ ملک تھا جہاں مذہب کیتھولک اس طرح حاوی تھا کہ اس کا مقابلہ دشوار تھا اور نہایت درجہ سخت غلو اس میں موجود تھا، یہ اگناتیوس لویولا کا ملک تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی ملک عدالت (استیصال ارتداد) انکوئی زیشن کا وطن تھا، اور اگرچہ اس زمانہ میں اسپین کے اندر مذہب پروٹسٹنٹ یا کسی اور زندیقانہ وافتراقانہ اصول کی تحریک کا کچھ اثر

---

[1] یہ محفوظ رہنا چاہئے کہ ابتدائی مصلحین لوتھر، ملانک تھون بلکہ کالون نے بھی موجود الوقت طاقت کی اطاعت اور حکومت کی انقلابی تجاویز سے علٰحدہ رہنے پر زور دیا ہے اور ان کا ایسا کرنا کچھ تو اس وجہ سے تھا کہ وہ اپنے فہم و ادراک کے موافق اناجیل اور قدیم عیسویت کی طرف پلٹنا چاہتے تھے اور کچھ اصطباغین وغیرہ کی رجعت قہقری کی وجہ سے تھا، مزید براں عام طور پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کلیسا کے اندر پاپائی اختیار کی مخالف تحریک نے پانچ صدیوں کی پرانی کشاکش کا ساتھ دیا جو ملکی و مذہبی اختیار کے درمیان برپا تھی مگر یہ اتفاق باہمی مستقل یا ہمہ گیر نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اصلاح کی جو دوسری رد جلی جس کا تعلق لوتھر سے نہیں بلکہ کالون سے تھا اس میں ملکی طاقت کے اوپر مذہبی طاقت کی فوقیت کے ایسے دعاوی دیکھتے ہیں جو بالکل پاپائی دعاوی کے مثل ہیں مگر ان میں سیاسی قوت کی کمی ہے کیونکہ مصلحین کو بہت سخت ضرورت دنیاوی طاقت سے مدد لینے کی تھی۔

نہیں معلوم ہوتا اس پر بھی عدالت مذکور نے فلپ دوم کے عہد میں اپنے متواتر "فیصلہ جات مذہبی" سے چھ ہزار کالبد انسانی کو جلا کر نیست ونابود کر دیا۔ پس خیال یہ ہوتا ہے کہ اگر دنیوی قوت پر پاپائیت کی مذہبی قوت کی فوقیت کا دعویٰ کہیں بھی کامیابی کے ساتھ قائم ہو سکتا تھا تو اسی ملک میں ہونا چاہیے تھا مگر واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ درحقیقت اس کہنے میں کچھ بھی مبالغہ نہیں ہے کہ عملی اغراض کے لئے اسپین میں فلپ دوم ایسا ہی مطلق العناں تھا جیسا انگلستان میں ہنری ہشتم۔ اسپین کے تمام اسقفی گرجوں کی سرپرستی اسی کے قبضۂ قدرت میں تھی، وہی اسافقۂ اعظم اساقفہ اور روساے صوامع کا انتخاب کرتا، کلیسائی انضباط کی جزئیات کو ترتیب دیتا، اور پوپ کے فرامین و مراسلات جب اس کی حکمت عملی کے منافی ہوتے تھے تو ان کے ملک میں داخل ہونے سے انکار کر دیتا تھا۔ عدالت استیصال ارتداد اس کے اشارے پر چلتی تھی نہ کہ پوپ کے۔ وہی اس عدالت کے نام احکام صادر کرتا، اور عدالت کے ارکان کو مقرر و برطرف کرتا اور ان پر نگرانی رکھتا تھا۔ درحقیقت فلپ کے مذہبی جوش جنوں کے باوجود ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جب اس کے معمولی نظم ونسق کے آلات کام نہیں دیتے تھے تو وہ اپنے اس مذہبی غلو کو خالص دنیاوی مقاصد کے لئے کام میں لانے لگتا تھا۔ مثلاً جب اس کے پرمٹ کے عہدہ دار فرانس کی جانب گھوڑوں کی برآمد روک نہ سکے تو اس نے ایک حیلہ یہ تراش لیا کہ اسے یقین ہے کہ گھوڑے پروٹسٹنٹ فوجوں کے لئے درکار ہیں اور اس لئے عدالت استیصال ارتداد کے ذریعہ سے ان کی برآمد کی ممانعت کر دی۔ پوپ نے اس کی شکایت کی مگر آخر پوپ ہی کو دبنا پڑا اور اس کے مذہبی آلات کارگر نہ ثابت ہوئے۔ بادشاہ کا مذہبی جوش بہت سخت تھا مگر اس سے بھی زیادہ سخت تر اعتقاد اسے خود اپنی ذات اور اپنے شاہانہ حقوق کے متعلق تھا اور اس مذہبی جوش کو اس اعتقاد کی حد کے اندر ہی رہنا پڑتا تھا۔

یہی حال لوئی چہاردہم کی فرانسیسی بادشاہی کا تھا، کلیسا کو اگرچہ اہم امتیازات (جو ملک کے مختلف حصص کے اعتبار سے مختلف تھے) بدستور حاصل رہے مگر کلیسا موثر طور پر تاج کے تابع ہو گیا تھا اور وہ اس کی وفادارانہ تائید کرتا تھا جس طرح انگلستان میں انگلیکی پادریوں کے بعض سربرآوردہ نمایندوں نے سترھویں صدی میں

کیا ویسا ہی یہاں بھی کلیسا کے نہایت ممتاز مقرروں نے شاہی مطلق العنانی کی انتہائی صورت کی بے چون وچرا تائید کی؟ بوسوئے کہتا ہے کہ حکمراں یعنی خدا کا برگزیدہ (بادشاہ) اپنے احکام کے لئے کسی انسان کو جوابدہ نہیں ہے کوئی شخص اس سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں "اے شاہان ارض آپ دیوتا ہیں" مقرر اس فقرے کو بت پرستی کی حد تک پہنچا سمجھ کر اس پر یہ ابزاد کرتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ "آپ کے اقتدار کو ربانی نوعیت حاصل ہے آپ کی پیشانیوں پر الوہیت کے نشانات ہویدا ہیں"۔ عل۱

۲۔ اب میں قانون پیشہ اشخاص کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یہاں رومانی، اصول قانون کا اثر اور بھی زیادہ استقامت کے ساتھ اس جانب یعنی بادشاہی کی طرفداری کی طرف مائل تھا۔ جب بارھویں صدی میں رومانی اصول قانون کے مطالعہ کی بیش بہا تجدید سب سے پہلے بولوینا کے دار العلوم میں وقوع میں آئی اس کے بعد ہی اول مرتبہ اس اثر کو اہمیت حاصل ہوئی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قدیم رومانی اصول قانون کے جس موخر شاندار زمانہ کی کتابیں ازمنۂ وسطے کے طلبہ کے مطالعہ میں آئی تھیں وہ بہر نوع شہنشاہی دور تھا، اور جن مقننوں کی عقل ودانش سے یہ طلبہ فیضیاب ہوتے تھے ان کا اساسی اصول یہ تھا کہ تمام حکومتی اختیار بادشاہ کے ہاتھ میں مرکوز ہے۔ لہذا فرانس میں جہاں ملک بے شمار جاگیروں میں منقسم ہو گیا تھا خصوصیت کے ساتھ ایسا ہوا کہ اہل قانون کی یہ فوج جسنے رومانی مقننوں کے علوم کی تربیت حاصل کی تھی اس خدمت پر متعین ہوئی کہ غیر محدود شاہی کے لئے بادشاہ کو اپنے پیشے کی جانبداری کا نفع پہنچائے۔ وہ اس امر پر محکم ہوتے تھے کہ فرانس کے بادشاہ کو یہ سمجھیں کہ وہ رومانی شہنشاہ کے اختیار کا وارث ہوا ہے۔ یہ اعتقاد انھیں تمام متخاصم دعاوی کا مقابلہ کرنے پر برانگیختہ کر دیتا تھا اور اس طرح امرائے عظام کی خود مختاری کے کم کرنے اور بادشاہ کے اختیار کو تمام ملک میں موثر و برتر قرار دینے کے لئے یہ قانون پیشہ اشخاص نہایت ہی اہم ولازمی آلۂ کار بن گئے۔

عل۱۔ "بوسوے سیاسیات ماخوذہ از اناجیل مقدسہ" کتاب ۲، ۴، ۵۔

بادشاہی کے اس تصور کا ایک درجہ قرار دینے میں ہمیں جن قیود و مستثنیات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہئے ان کی نسبت میں اب کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ میں قیود سے ابتدا کرتا ہوں، سب سے پہلا امر یہ ہے کہ جن مختلف ملکوں میں تاج کو غلبہ حاصل تھا، وہاں مختلف حد تک وہ اثرات باقیات موجود تھے جنھیں میں ازمنۂ وسطے کی لاحاصل پارلیمنٹ کے اثرات کہہ سکتا ہوں۔ ان اثرات سے اگرچہ تاج کے خلاف کسی شدید مقابلے کا خطرہ باقی نہیں رہا تھا پھر بھی وہ کسی حد تک تاج کے لئے روک کا کام دیتے تھے یا کم از کم اتنا ہوتا تھا کہ اس کے راستے میں کچھ رکاوٹ پیدا کر دیتے تھے اور اس خیال کو زندہ کئے ہوتے تھے کہ اجرائے محصول کے لئے قوم کی رضامندی ضروری ہے۔

چنانچہ فرانس میں مجلس طبقات کے اجلاس ۱۶۱۴ء کے بعد سے بند ہو گئے تھے مگر بعض حصص میں صوبجاتی طبقات کے اجلاس بدستور ہوتے رہتے تھے لانگ ڈوک، پروونس، برگنڈی، برٹینی اور بعض اور چھوٹے چھوٹے حصوں میں خاصکر ان حصص میں، جو ملک کی حدود کے قریب واقع تھے یہ اجلاس جاری تھے۔ رسماً ان مجلسوں کا کام یہ تھا وہ ان اضلاع کے محصولوں کی نسبت رائے دیں۔ یہ مجلسیں کبھی موثر طور پر بادشاہ کی مخالفت نہیں کرتی تھیں مگر بسا اوقات بادشاہ کسی قدر تدبیر و انتظام، قدرے رشوت دہی یا خفیف سی تہدید کے بغیر ان سے امداد نہیں حاصل کر سکتا تھا۔

اسپین میں بھی اسی قسم کے اثرات موجود تھے، اور وہاں بادشاہی کے مختلف حصص میں ان اثرات کی حالت میں نمایاں فرق تھا کاسٹیل کی کورٹیز د پارلیمنٹ) چارلس پنجم کے عہد میں بالکل بیکار ہو گئی تھی مگر اراگان کی کورٹیز نے (جہاں ازمنۂ وسطی میں کاسٹیل کی بہ نسبت شاہی طاقت زیادہ رقیبانہ طور پر محدود ہو گئی تھی) تقریباً فلپ کے عہد کے آخر تک بادشاہ کی مرضی پر موثر روک قائم رکھی تھی اور محصول کے معاملات پر تو اور بھی زمانہ دراز تک اس کا اثر قائم رہا۔ درحقیقت اراگان کی صوبجاتی کورٹیز سے شاہ اسپین کو اٹھارھویں صدی کے ابتدائی زمانے تک دشواریاں پیش آتی رہیں یہاں تک کہ ۱۷۰۷ء کی ایک شورش کے دبانے کے حیلے سے بادشاہ نے اس صوبے کے خاص حقوق و امتیازات کو منسوخ کر دیا۔ کیٹلان کے دستور سیاسی کو اس قسم کی

مصیبت سے ۱۷۱۴ء تک سابقہ نہیں پڑا اور اس وقت بھی اہل کیٹلانن نے بڑی شدت وہمت سے مقاومت کی۔

علیٰ ہذا جرمنی کے اندر شہنشاہی کے مقبوضات جن مختلف وسعت کی امارتوں میں تقریباً شکست ومنتشر ہو گئے تھے، ان امارتوں میں بھی مختلف مقامات میں مختلف حد تک حکمرانوں کے اختیار میں طبقات کی صوبجاتی جمعیتوں کی طرف سے کچھ نہ کچھ دقت حائل ہوتی رہی، ان جمعیتوں کا اقتدار کہیں بھی زیادہ موثر نہیں تھا اور زمانے کے ساتھ ساتھ گھٹتا ہی گیا۔ اکثر صورتوں میں جو حصہ ان سے پہلے نکالا وضع قوانین کا حصہ تھا، جمعیت کا کام صرف مشورہ دینا رہ گیا تھا اور جہاں ظاہراً دستور سیاسی کی رو سے قوانین کے لئے طبقات کی منظوری ہنوز تسلیم کی جاتی تھی، وہاں بھی ہر طرح کوشش یہ کی جاتی تھی کہ اسے محض ضابطہ پیمائی کی حد تک سمجھا جائے اجرائے محصول کی نگرانی پر بھی اگرچہ شدت کے ساتھ حملے ہوئے مگر یہ کچھ زیادہ سخت جان ثابت ہوئی لیکن یہاں بھی عام محصول پر مضبوط نگرانی حاصل کرنے کی بہ نسبت طبقات کو زیادہ تعلق اس امر سے تھا کہ خاص خاص طبقات کے لئے امتیازات ومستثنیات حاصل کریں، لیکن دوسرا امر یہ ہے کہ جب اصولاً بادشاہ کی مرضی ناقابل مدافعت قرار پاگئی اس وقت بھی مغربی یورپ کی بادشاہیاں عملاً محدود تھیں اور یہ تحدید نہ صرف روایتی قانون، رسم ورواج اور مذہب وغیرہ کی وجہ سے تھی بلکہ جن آدمیوں کے وسیلے سے اسے کام کرنا پڑتا ہے ان کی مدافعانہ قوت بھی اس کا باعث تھی خاصکر امرا میں اپنی شخصی منزلت کا احساس، اہل قانون میں ذہنی عادات اور دونوں میں اپنے جماعتی اعزاز کا خیال اس کا موجب تھا۔ اٹھارھویں صدی کے وسط کے قریب اس زمانے کے نظریۂ سیاسی کے مصنفوں میں ایک نہایت ہی باا ثر مصنف یعنی مونٹسکیو نے اسی زمانے میں اس کا اظہار کر دیا تھا، اور درحقیقت اس امتیاز کے نمایاں کرنے کے لئے وہ "ملوکیت" کی اصطلاح اس معنی میں استعمال کرتا ہے جو مطلق العنانی سے صریحاً ممیز ہے (خیالات میں انقلاب رونما ہونے سے بیشتر) ایک فرد کی حیثیت سے میں مونٹسکیو کے تفکرات کی عام رفتار کی جانچ کے بعد کے ایک خطبے میں

کروں گا مگر اس مبحث پر اس نے جو کچھ کہا ہے اسے میں اپنے ہی اٹھارھویں صدی کے موّرخوں میں سے ایک نہایت ہی عادل موّرخ رابرٹسن کے الفاظ میں بیان کروں گا (اس نے یہ خیال اس موقع پر ظاہر کیا ہے) جہاں اس نے یورپ کی حالت کے متعلق اپنی رائے کو ختم کیا ہے۔

وہ لکھتا ہے کہ جب بادشاہی کا کامل غلبہ مستحکم ہو گیا اس وقت دو چیزیں ایسی باقی رہ گئیں جنھوں نے فرانس کی حکومت کو مکمل مطلق العنانی کی پستی تک پہنچ جانے سے باز رکھا۔ اول یہ کہ فرانس کے امرا نے اگرچہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپنا سیاسی اقتدار کھو دیا تھا پھر بھی انھوں نے اپنے ذاتی امتیازات اور اپنے منصب کے تقدم کو قائم رکھا تھا۔ ان میں یہ احساس وادراک موجود تھا کہ دوسرے طبقات سے وہ مرتبے میں بلند ہیں اور محصول کی زیر باریوں سے مستثنیٰ ہیں۔ انھیں ایسے نشانوں کے اختیار کرنے کا حق خاص حاصل تھا جن سے ان کی منزلت کا اظہار ہوتا ہو، زمانہ صلح میں انھیں یہ حق حاصل تھا کہ ان کے ساتھ ایک حد تک تعظیمی برتاؤ کیا جائے اور جب وہ میدان جنگ میں ہوں تو (وہ اپنے لئے مختلف قسم کے تعظیمی امتیازات کے متقاضی تھے) ان میں سے اکثر دعاوی ایجابی قوانین سے ماخوذ نہیں تھے مگر چونکہ مقولات اعزاز کے بموجب وہ متعین ومشخص تھے اور شخصی اعزاز کے زبردست احساس کی پوری قوت سے ان کی تائید ہو رہی تھی اس لئے انھوں نے عملاً بادشاہ کے اختیار پر حد بندیاں قائم کر رکھی تھیں پس اس طرح بادشاہ اور اس کی رعایا کے مابین ایک درمیانی طبقہ قائم ہو گیا تھا جس کے اپنے روایتی امتیازات تھے اور بہ حیثیت مجموعی بادشاہ کو بڑا زور خیال اس امر کا تھا کہ وہ ان امتیازات کے خلاف نہ کرے۔

فرانس سے مخصوص، بادشاہ کی حرص وہوس میں ایک اور اہم روک پارلیمان کے عدالتی اختیارات کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی بالتخصیص پیرس کی پارلیمان کی وجہ سے جسے عدالت کے نظم ونسق کا اعلیٰ اختیار تفویض تھا۔ فرانس کے بادشاہوں نے جب اوّل اوّل تشریعی اختیارات کو اپنے ہاتھ میں لینا شروع کیا تو وہ اپنے فرامین واحکام پیرس کی پارلیمان میں بھیجتے تھے جہاں وہ درج ہوتے تھے

اور اندراج کے اس رسمی فرض کی وجہ سے پارلیمان کو یہ موقع ملگیا کہ جس حکم کو وہ ناپسند کرے ہو اس کے خلاف تعرض کرے اور وقتاً فوقتاً اس نے اس تعرض سے بہت کارگر طور پر کام لیا۔[علہ] ان دونوں صورتوں میں بادشاہ اپنی مرضی کے بزور نفاذ سے مقاومت کو دبا سکتا تھا مگر امرا اور اہل قانون میں جماعتی اعزاز کا احساس اس قدر قوی تھا کہ اس کے دبانے میں بادشاہ کو بہت کچھ دشواری پیش آتی۔

۴۔ ان خطبات کے سلسلے میں ہم جس مطالعہ میں مشغول رہے ہیں اس کے بیشتر حصہ کے ہر درجہ میں ہمیں اس امر سے تعلق رہا ہے کہ ان خود مختار یا قریب بہ خود مختار جماعتوں کے ممتاز سیاسی خصوصیات کا مقابلہ کرتے رہیں جو کم و بیش ایک ہی سے حالات زندگی کے تابع ہوں اور کسی عام تمدن میں شریک ہوں، چنانچہ یونانی شہری سلطنتیں، ازمنۂ وسطے کی شہری جماعتیں، ازمنۂ وسطے اور زمانۂ جدید کی کشوری سلطنتیں اسی قبیل سے ہیں، اس مبحث میں ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ مملکتوں کے گروہ کے مختلف ارکان میں حکومت کی شکلوں کے درمیان جو عام مشابہتیں ہوں، اور محکوم کو حکومت کے ساتھ جو تعلقات ہوں اور ان میں جو تغیرات واقع ہوں اور ان تغیرات کے جو اسباب ہوں، وہ سب صاف واضح و عیاں ہو جائیں، مگر اس قسم کے تمام مقابلوں میں میری سعی یہ رہی ہے کہ جس طرح تشابہات پر نظر کی جائے اسی طرح تخالفات پر بھی نظر کی جائے، اور میں نے جب کسی مروج طرز حکومت کا ذکر کیا ہے تو یہ خیال رکھا ہے کہ اس بیان میں ایسا حصر اور ایسی حد بندی کر دوں جس سے وہ خاص مواقع صاف واضح ہو جائیں جہاں یہ مروج طرز کارگر نہ ہو۔ استثنائی مواقع میں کسی طرز خاص کے رائج ہونے کے حالات

علہ۔ انگلستان کی پارلیمنٹ کی طرح سے فرانس کی پارلمان بھی ابتداءً ایک قومی جمعیت تھی جو اور فرائض کے ساتھ عدالتی فرض بھی انجام دیتی تھی مگر فلپ نے ۱۳۰۲ء میں پارلمان کو صرف عدالتی فرائض تک مخصوص کر دیا اور اہل قانون کو اس میں نمود حاصل ہو گیا (چنانچہ چودھویں صدی میں اس میں ۸۸۔ اہل قانون اور ۱۲۔ امرا تھے) (چارلس نہم کے عہد میں) لوپیتال نے ۱۵۶۶ء میں عمر و قابلیت کے شدید شرائط کا اجرا کیا۔ رکنیت اکثر موروثی اور ہمیشہ مادام الحیات ہوتی تھی، اس سے فی الواقع خود مختاری حاصل ہو گئی اور پارلمان ایک ایسی جماعت ہو گئی جس میں نیک و بد ہر حالت میں اعزاز جماعتی بہت شدت کے ساتھ برقرار رکھا جاتا تھا۔

واسباب پر غور کرنے کے لئے یہ منفی مواقع عام طور پر نہایت ہی اہمیت رکھتے ہیں
لہذا اپنے آخری خطبے میں جہاں میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ سترھویں اور اٹھارھویں
صدیوں میں مغربی یورپ میں خالص بادشاہی کس طرح غالب آگئی وہاں میں نے
یہ بھی خیال رکھا ہے کہ اس عام نتیجے میں مستثنیات کے موجود ہونے کو بھی ظاہر کردوں۔
اب ہمیں ان مستثنیات اور ان کے اسباب کو کسی قدر زیادہ قریب سے دیکھنا
چاہیئے۔ ازمنۂ وسطیٰ کی جمہوری زندگی کے باقیات یعنی وینس اور جرمانی شہروں کو نظر انداز
کردینے اور چارلس دوازدہم کے بعد سویڈن کے عارضی طور پر عدیدی اقتدار میں
چلے جانے کو ساقط کرنے کے بعد یہ مستثنیات انگلستان، نیدرلینڈز، سویزرلینڈ، اور
پولینڈ تک محدود رہ جاتے ہیں۔ پہلے مجھے یہ ظاہر کردینا چاہیئے کہ ان چار مثالوں میں
سے تین میں مادی حالات کا اثر نمایاں نظر آرہا ہے۔ یہ میں پہلے ہی ظاہر کرچکا ہوں
کہ انگریزوں کی زندگی کے جن مخصوص حالات نے ازمنۂ وسطےٰ کے پارلیمنٹی اوارات کو
خصوصیت کے ساتھ نفع پہنچایا وہ کس طرح زیادہ تر انگلستان کی جزائری کیفیت کے
تابع تھے۔ اپنے آقاؤں سے آزادی حاصل کرنے میں سویزرلینڈ کے کسانوں کی
جدوجہد کو کوہستان آلپس نے کیسے مخصوص طور پر محفوظ رکھا اور نیدرلینڈز کے اہم
حصص کی (سیاسی مفہوم میں) بری و بحری دورنگی نے جسے جوش مذہبی کی قوت
سے مدد مل گئی تھی کیونکر اسے اس قابل بنادیا کہ "اصلاح" کے بعد کے مذہبی مناقشے
والی صدی میں اسپین کے بظاہر حد سے بڑھے ہوئے فوجی غلبے کا
کامیابی کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یہ سب ایسے تاریخی تبصرات ہیں جن سے ہر شخص واقف
ہے۔ ان دونوں جمہوری مملکتوں پر میں دوبارہ اپنے آخر کے خطبہ میں جو فائقیت
سے متعلق ہے بحث کروں گا، سردست میں صرف ان دونوں کے قیام و دوام کے
متعلق کچھ تشریح و توضیح کروں گا۔ سوئزرلینڈ کے باب میں یہ ہوا کہ اس کے مادی
حالات اور اس کی خود مختاری کے آغاز کار کی وجہ سے حکومت کی جس متفقی وجمہوری
شکل نے طبعی کیفیت پیدا کرلی تھی وہ اٹھارھویں صدی کے دوران میں کامیابی
کے ساتھ قائم رہی۔ جس ملک کو ہم ہالینڈ کہتے ہیں اس کے باب میں حکومت کی
اس شکل کی توضیح اس کے آغاز کار کے حالات سے ہوتی ہے وہ بھی اس دور میں

برائے نام قائم رہی مگر یہاں اس کی کامیابی نامکمل رہی اور اس میں رخنہ پڑتا رہا اور فی الواقع وہ بادشاہی کے رنگ میں آگئی میرے خیال میں اس کی صاف وجہ وہ خطرات عظیم ہیں جو ہمیشہ ندرلینڈ کے سر پر منڈلاتے رہتے تھے فرانس کے حملہ کی وجہ سے جو خطرناک نازک حالت پیدا ہوئی وہی اس کا باعث تھی کہ ۱۶۷۲ء میں ولیم سوم غیر محدود اختیارات کے ساتھ ہالینڈ کا اسٹاٹ ہولڈر مشتہر کر دیا گیا، اور اسنے اپنے غلبہ کو اپنے انتقال ۱۷۰۲ء تک قائم رکھا، اور اسی قسم کے ایک خطرے کے باعث یہ ہوا کہ ۱۷۴۷ء میں سات متحدہ صوبوں کا ایک موروثی "اسٹاٹ ہولڈر" مقرر ہو گیا۔

جب ہم پولینڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو وہاں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بادشاہی کے ساتھ کشمکش کرنے میں آخر الامر شورش انگیز امرا کو کامیابی حاصل ہو گئی لیکن یہاں ایک دلچسپ مثال یہ ملتی ہے کہ مغربی یورپ کی سلطنتوں میں تجارتی عنصر کو جو نشو و نما حاصل ہو گیا تھا اس کی یہاں کوئی قدر و قیمت نہیں تھی یعنی جاگیری و نیم جاگیری امرا کی کشمکش میں نہ تو بادشاہ کے نزدیک اس کی کوئی پرسش تھی اور نہ معاشری زندگی اور سیاسی نظم میں اس کی کوئی قدر و منزلت تھی۔ وجہ یہ ہے کہ علی العموم زیادہ مغرب کی جانب کی سلطنتوں کے مقابلے میں پولینڈ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں قوم میں کسی زوردار حرفتی طبقہ کا نشو و نما نہیں ہوا۔ شہروں کے اندر تجارت غیر ملکیوں کے ہاتھ میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ عدیدیت کو بادشاہی پر فتحمندی حاصل ہو گئی اور اس نے ازمنۂ وسطے کی عدیدیت کے انتشارانہ وطوائف الملوکانہ میلانات کا بہت نمایاں اظہار کیا۔ وہ "آزادانہ حق امحا" (جس کے بموجب ۱۶۵۰ء کے بعد سے پولینڈ کی ڈائٹ کا ایک واحد رکن پوری جمعیت کی قرارداد کی منظوری سے انکار کر سکتا تھا) پولینڈ کی اس منزلت کا ایک مخصوص اظہار و نشان ہے جو اسے پوری عدیدیت کے نشو و نما میں حاصل ہوا۔

۵۔ انگریزوں کے سیاسی ارتقا کی غیر معمولی رفتار کا ہمیں نہایت غور و فکر کے ساتھ معائنہ کرنا ہے نہ صرف انگریزوں کے نقطۂ نظر سے بلکہ سیاسیات کے مطالعہ کرنے والے کی حیثیت سے ہمیں ایسا کرنا چاہئے کہ مغربی یورپی سیاسیات کی

عام تاریخ میں اس ارتقا کو نہایت اہم حصے کی حیثیت حاصل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جب وہ وقت آیا کہ خالص بادشاہی سے گزر کر عام طور پر انیسویں صدی کے ان دساتیر کی طرف قدم بڑھایا جائے جن میں ان نمایندہ مجلسوں کو جن کے انتخابات زیادہ وسعت دادہ حق انتخاب کے رو سے عمل میں آئے تھے، اختیار میں بہت بڑا حصہ دیا گیا تھا تو یہ سب کچھ ارتقا کی اسی مخصوص رفتار کا نتیجہ تھا جو انگلستان میں وقوع پذیر ہوئی اور جس نے ایک بڑی حد تک اس تکوین دساتیر میں نمونہ کا کام دیا۔ انگلستان کے دستور سیاسی کا بغور مطالعہ کرنا اس وجہ سے اور بھی زیادہ قابل لحاظ ہے کہ تکوین دستور سازی کے تخیلات اور وہ احساسات جنھوں نے اسے پر زور حرکت دی ان کی شعاعیں انگلستان سے زیادہ فرانس کے مرکز تک ضیاگستر ہوئیں۔

انگلستان میں وہ دور جس میں ہم بادشاہی اختیار کی ترقی کا میلان دیکھتے ہیں یا کم از کم یہ کہ اپنے غلبے کے قائم رکھنے کے لئے بادشاہی کی کشمکش نظر آتی ہے وہ دورہ ہنری ہفتم کی تخت نشینی سے ۱۶۸۸ء کے انقلاب یعنی تقریباً دو صدی تک رہا۔ اس دور کے خصوصیات پر میں سرسری نظر ڈالتا ہوا گزر جاؤں گا کیونکہ اس کے عام کیفیات اچھی طرح معلوم ہیں اور اس کے جزئیات مغربی یورپ کے ارتقا کے عام مطالعے میں کچھ ایسے دلچسپ نہیں ہیں جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں، گلابوں والی لڑائی کے بعد قدیم طبقۂ امرا کی طاقت بظاہر برباد ہوگئی تھی اور پارلیمنٹ بادشاہ کی اس سے زیادہ مطیع و منقاد ہوگئی جتنی اس سے قبل کی دو صدیوں میں تھی۔ اس کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ شاہان ٹیوڈر کو اگرچہ غلبہ حاصل ہو گیا مگر ان کی حکمت عملی یہ رہی کہ پارلیمنٹ کی تشریعی نوعیت کو ظاہری لحاظ سے مسلم رہنے دیں اور ایوانہائے پارلیمنٹ اپنے روایتی امتیازات کے جس رقابت کا اظہار کرتے تھے اس کی وقعت کریں۔ انھوں نے اپنی جانب سے دستور سلطنت کے اصول پر کوئی حملہ نہیں کیا، ناکس نے عورتوں کی عفریتانہ جمعیت" کے خلاف جو لعنت کی ہے اس کا جواب انگریزوں کی طرف سے یہ ہے کہ انگلستان کی حکومت ایک مرکب و محدود شاہی ہے[1]

---

[1] ہیلم، تاریخ دستوری (Constitutional History) جلد اول باب پنجم۔

غیر ملکی خطرے کے گزر جانے کے بعد الزبتھ کے آخری زمانے میں جا کر یہ ہوا کہ تاج کے افعال پر نکتہ چینی کرنے میں دار العوام نے کسی حد تک خود مختاری کا وہ انداز اختیار کیا جو گلابوں والی لڑائی کے قبل پارلیمنٹ میں ظاہر ہوا کرتا تھا۔ دوسری طرف برّ اعظم میں یہ ہو رہا تھا کہ بالتخصیص قانون دان اشخاص میں یہ نظریہ شایع ہو رہا تھا کہ خود شاہی عہدے کی نوعیت ہی میں مطلق العنان و اعلیٰ طاقت خلقتاً موجود ہے"۔ اور اینگلیکی کلیسا بھی اس کی تائید کر رہا اور بادشاہوں کے حق خداداد کے اس مسئلہ کو دوبارہ زندہ کر رہا تھا جو نیم مربیانہ ہونے کے لحاظ سے قانون فطرت کے ہمنوا بنایا گیا تھا۔

اس کے بعد شاہان اسٹوارٹ کے تخت نشین ہونے کے ساتھ فوقیت کے متعلق شاہی و پارلیمنٹی دعاوی کے درمیان تصادم برپا ہو گیا اور اس میں واقعی قرار و سکون اس وقت تک نہیں پیدا ہوا جب تک کہ ۱۶۸۸ء کے انقلاب نے اس کا تصفیہ پارلیمنٹ کے حق میں نہ کر دیا۔ اس تصادم میں دو ممتاز عناصر تھے ایک سیاسی اور ایک مذہبی۔ نئی مطلق العنانی پرانی پارلیمنٹی روک ٹوک کے ساتھ کشاکش میں مبتلا تھی اور مذہب اینگلیکی، مذہب پیوریٹنی اور مذہب کیتھولک کے ساتھ جد و جہد کر رہا تھا۔ مذہب اینگلیکی ہمیشہ بادشاہ کی جانب رہتا تھا اور علاوہ جیمز دوم کے زمانہ تک مطلق العنانی کے مفاد کے دعاوی کی تائید کرتا رہا تھا، ۱۶۸۸ء کے انقلاب میں فیصلہ کن قوت یہی تھی کہ مذہب اینگلیکی نے جیمز سے کنارہ کشی کی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو پھر اس میں شک کی گنجائش ہے کہ وضع قوانین و اجرائے محاصل میں پارلیمنٹی فوقیت کی غیر منفصل روایات اس امر کو روک دیتے کہ برّ اعظم کی طرح انگلستان میں بھی بادشاہی کو غلبہ حاصل ہو جائے۔

اس اعتبار سے شاہان ٹیوڈر کے بجائے شاہان اسٹوارٹ کا حکمراں ہونا ان کی شخصیات کے لحاظ سے ایک امداد غیبی تھی۔ شاہان ٹیوڈر اپنی سعی کرنا چاہتے تھے اور بالعموم اس میں کامیاب بھی ہو جاتے تھے، مگر وہ اتنے دانشمند تھے کہ وہ ایسے دعادی نہیں پیش کرتے تھے جو انگریزی پارلیمنٹی روایات کے مخالف ہوں اور اس طرح وہ خوفناک مخالفت سے پہلو بچا لیجاتے تھے۔ جیمز اول

ایک علم نما اور شیدائے اصول شخص تھا، اور اس لئے وہ ایسے دعاوی کے پیش کرنے کی طرف مائل تھا جن سے اصولاً شاہی امتیاز خاص کو وسعت ہوتی ہو مگر واقعی اسے اتنے اختیارات کا قائم رکھنا منظور نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دار العوام بھی قطعی حیثیت سے بالمقابل دعاوی پیش کرتا تھا۔ چارلس اول اور جیمز دوم کی غلطیاں اس سے مختلف تھیں مگر ایسی قابلیت اور جفاکشی کے باوجود، غالباً چند ہی بادشاہ ہوئے ہوں گے جنھوں نے حکمرانی کے اصول کو اس قدر کم سمجھا ہو، عام الفاظ میں یہ کہنا چاہیئے کہ پارلیمنٹ کی کامیابی کا انحصار چودھویں اور پندرھویں صدیوں کے نظائر کی مستحکم تائید پر حتمی تھا (اور یہ تاریخ کے پڑھنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کامیابی کا مطلق تیقن نہیں تھا) لیکن مذہبی عنصر کے بغیر تنہا اس سے کام نہیں چل سکتا تھا، اور اس میں شک ہے کہ اگر مذہبی عنصر مفقود ہوتا تو آیا صورت معاملات وہی ہوتی جو ہوئی۔

۱۶۸۸ء میں جو نتیجہ حاصل ہوا اور اس کے بعد انگریزی دستور سیاسی کو جو نشو و نما ہوا اس کی نسبت میں بعد کو گفتگو کروں گا۔ آئندہ کے تین خطبات میں میں یہ چاہتا ہوں کہ سیاسی واقعات کے ارتقا کو چھوڑ کر ارتقائے تخیل کی طرف متوجہ ہوں یا یوں کہنا چاہیئے کہ نہایت ہی اہم سیاسی واقعات کے اندر جن تخیلات کو نشو و نما ہوا ان کی جانب براہ راست توجہ کروں۔ میرا خیال ہے کہ نظم سیاست جہاں تک مہذب نظمہائے معاشرت کے قوانین سے بحث کرتا ہے اس کے موضوع کے لئے یہ ایک ضروری جزو ہے اور یہ ایسا جزو ہے کہ تہذیب و تمدن کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس جزو کی اہمیت بھی بڑھتی جاتی ہے۔

خطبۂ بست و چہارم

خیالات سیاسیہ - ہابس و لاک

میں اس خطبے اور آئندہ کے دو خطبوں میں، یہ چاہتا ہوں کہ زمانۂ جدید سے کے اس وقت تک کے سیاسی خیالات کا مختصر تذکرہ کروں جب ان خیالات نے انقلاب فرانس کی صورت میں ظہور کیا۔

سیاسی تخیلات کو سیاسی واقعات کے ساتھ جو عام تعلق ہے، ابتداءً اسی کی نسبت چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ سیاسی تخیلات سے میری اولین مراد یہ ہے کہ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے بنی نوع انسان کی کسی زیر حکم قوم یا ملت کے اندر کیا کیا امور ہونے چاہئیں۔ اس قسم کے تخیلات کا تعلق امور ذیل سے ہوگا:-

(۱) حکومت کے اعضا کس طریق پر مقرر ہونے چاہئیں۔ (۲) انھیں کیا اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ (۳) زیر حکم اشخاص پر ان اختیارات کا نفاذ کس طرح پر ہونا چاہیے۔ (۴) جداگانہ حکومتوں یعنی سلطنتوں اور قوموں کے تحت میں گروہوں کی توسیع و تکوین یعنی نئی سلطنتوں اور قوموں کی بنا کس حد تک اور کس طرز پر ہونا چاہیے (۵) ان گروہوں کے خارجی یا بین الاقوامی تعلقات کیا ہونا چاہئیں۔ یہ تمام سوالات کم و بیش ایک دوسرے سے وابستہ ہیں مگر بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ سب سوالوں کو چھوڑ کر ایک ہی سوال کی طرف توجہ مائل ہو جاتی ہے اور جس سلسلۂ خیال کی ہم اسوقت ایک ساتھ جانچ کرنا چاہتے ہیں اسمیں توجہ بالخصوص پہلے دو سوالوں کی طرف مرکوز ہے یعنی وہ اصول جن پر حکومت کی ترکیب مبنی ہونا چاہیے

اور زیر حکم اشخاص پر اس کے جائز اقتدار کی وسعت و جواز صحت۔

اس کہنے سے کہ سیاسی تخیلات سے اولین مقصود حکومت کے وہ تخیلات ہیں جس طرح پر کہ حکومت ہونا چاہیئے، میری غرض یہ نہیں ہے کہ یہ تخیلات حکومت کے وہ تخیلات نہیں ہیں جس طرح پر حکومتیں ہیں اور رہی ہیں۔ حکومت کو جیسا ہونا چاہیئے پر سکوں وقتوں میں اکثر و بیشتر لوگوں کے لئے وہی حکومت ہے جو اس وقت موجود ہوتی ہے اگرچہ ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے بعض جزئیات میں تغیر ہو جائے۔ اور انقلابی اوقات تک میں بھی جب کہ ہر طرف یہ ارمان دلوں میں جوشزن ہوتا ہے کہ جو کچھ حقیقتاً موجود ہے اس سے کوئی بالکل مختلف شئے حاصل کی جائے اس وقت بھی کوئی سیاسی تصویر خیال جسے عمل کا جامہ پہنایا جائے، باغلب وجوہ کسی نہ کسی ایسے ہی نمونہ پر بنے گی جس کے دوسری جگہ موجود ہونے کا علم ہو یا کم از کم یہ یقین ہو کہ اس کا وجود کہیں نہ کہیں رہا ہے۔ ہم اکثر اس وقت بھی اس امر کو واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں جبکہ اس تصویر خیالی کو عملی جامہ پہنانے کا ذریعہ کسی مجرد سابقہ طریقے کو بتایا جاتا ہے۔ یہ امر نہایت ہی حیرت انگیز ہے کہ وہ سیاسی فلسفی جو انتہائی خیالی مدارج پر پہنچے ہوئے ہیں ان کی پرواز خیال بھی ہیر پھر کر تحریری کے حدود و قیود کے اندر رہتی ہے مثلاً یہ کہ سیاسی معاشرے کی کسی بہشت ارضی کے لئے اگر کوئی نظم سلطنت بنایا جائے تو افلاطون کی جمہوریہ اسکے لئے ایک ضرب المثل اصطلاح ہے اور حقیقت یہ ہے کہ شخصی ملک اور شخصی خاندانون کے محو کرنے کی جیسی اجتماعی تجویز افلاطون نے پیش کی ہے وہ نہ کہیں بروئے کار آئی اور نہ آئیگی۔ اس پر بھی افلاطون یونانی معاشرت کے عملی واقعات سے اس درجہ جکڑا ہوا ہے کہ اس کے ذہن میں سیاسی منتہائے خیال کا تصور یہی قائم ہو سکتا تھا کہ ایک شہر کے اندر رہنے والی قوم ہو جس کی ترتیب و تنظیم زیادہ تر جنگ کے نقطۂ نظر سے قائم کی گئی ہو۔ ایک آزاد قوم جو ایک براعظم پر پھیلی ہوئی ہو اور جس کے نزدیک جنگ ایک تحتانی خیال ہو، اس کا تصور بھی افلاطون کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔

لیکن اس کے بعد، سیاسی تخیلات کے سیاسی واقعات کے ساتھ متعلق ہونے سے ان تخیلات پر ایک دوسرے طریقہ سے بھی اثر پڑتا ہے۔ سیاسی تاریخ کے ان تخیلات کا تعلق صرف ایسا ہی تعلق نہیں ہے جو نتیجہ کو سبب کے ساتھ ہو بلکہ

ایسا تعلق بھی ہے جو سبب کو نتیجہ کے ساتھ ہو۔ انسان خواہ حاکم ہو یا محکوم دونوں صورتوں میں اس کے واقعی طرز عمل پر بہت بڑی حد تک اس کی اس رائے کا اثر پڑتا ہے کہ کس شئے کو وہ حق و انصاف سمجھتا ہے اور اس طرح جہاں سیاسی نظریات کا تعین کسی حد تک سابق الوجود واقعات سے ہوتا ہے وہیں اپنی باری میں یہ نظریات ایسی سیاسی قوتیں بن جاتے ہیں جو واقعات کو تبدیل کر دیتی ہیں اور اسی وجہ سے بہت اہم حد تک یہ نظریات اس طرح بنائے اور ڈھالے جاتے ہیں کہ وہ اس عملی مقصد کے حصول کا آلۂ کار بن جائیں ۔

لیکن نظریات سے واقعات پر جو اثر اس طرح پڑتا ہے مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اس کی حد ایک دوسرے سے بہت مختلف ہوتی ہے، اور یہ امر قابل لحاظ ہے کہ یہ حد یورپ کی قدیم تاریخ کے بہ نسبت ازمنۂ جدیدہ بلکہ ازمنۂ وسطے کی تاریخ میں قطعاً بہت بڑھی ہوی ہے جہاں تک ہماری نظر کی رسائی ہے ہم یہی دیکھتے ہیں کہ یونانی تاریخ کی رفتار پر سقراط افلاطون اور ارسطو کے تفکر کا اثر کچھ ایسا اہم نہیں پڑا۔ سقراط و افلاطون فلسفیانہ اصول کے بموجب اعیانیت کے حامی تھے اور ان کے خیالات تعلیم یافتہ اشخاص میں شایع ہو گئے تھے، مگر ایتھنز میں سیاسی تغیر کی جو مستقل رو عمومیت کی طرف چل رہی تھی اس پر اس کا کچھ بھی اثر نہ پڑا اور جہاں تک ہمیں علم ہے افلاطون و ارسطو کے سیاسی تخیلات کے عمل میں آنے کا ذرہ برابر بھی امکان نہیں تھا اور اس کے حصول کی ادنی کوشش بھی نہیں کی گئی ۔

برخلاف ازیں، آٹھویں صدی کے بعد سے یورپ کی تاریخ میں، واقعات پر خیالات کا اثر مختلف طریقوں سے بہت ہی نمایاں نظر آتا ہے ۔ غیر اہم اور متنازعہ فیہ اثرات سے قطع نظر کر کے اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ازمنۂ وسطے کی رومانی شہنشاہی کے نظری حقوق نے جرمنی اور اطالیہ کی تاریخ کو فرانس و اسپین کی تاریخ کے بہ نسبت بالکل مغائر شاہراہ ترقی پر لا ڈالا جیسا کہ میں ایک سابق خطبے میں بیان کر چکا ہوں[1] اور یہ کہنا تقریباً بالکل درست ہے کہ یہ رومانی شہنشاہی اپنی ہستی کے

---

[1] خطبۂ سیز دہم ۔

بیشتر حصہ میں ایک حقیقت واقعہ ہونے کے بجائے زیادہ تر محض نظری شے تھی)، دوسری طرف اس میں بھی کوئی شک نہیں کرسکتا کہ زمانۂ جدید کے بین الاقوامی قانون میں بین الاقوامی معاملات کے حقیقی مسلمہ قواعد پر قانون فطرت سے متعلقہ نظری خیال کا بہت بڑا اثر پڑا ہے علہ آخری امر یہ ہے کہ اس میں بھی شک نہیں ہے کہ انسانی حقوق اور قومی اقتدار اعلیٰ کے مجرد مسلمات اس اہم تحریک کی ایک قطعی قوت رہی تھی جو ۱۷۸۹ء سے ۱۸۱۵ء کے بعد سے یک بیک یا رفتہ رفتہ جدید یورپی نظم سیاست کو منقلب کرتی رہی ہے۔

غرضکہ سیاسی نظریات ونظمات کا یہ تواتر دو ہی قسم کے اسباب کے زیر اثر چلتا رہتا ہے، ایک داخلی دوسرے خارجی، ان اسباب کے نتائج کا ایک دوسرے سے جدا کرنا اگرچہ تاریخ فلسفۂ سیاسیہ کے مطالعہ کرنے والے کے لئے نہایت درجہ اہم ہے مگر ایسا کرنا نہایت مشکل کام ہے۔ اول یہ کہ اس تواتر میں ہم ارتقا کے داخلی کلیات کے فعل کا ہمیشہ پتا چلا سکتے ہیں، ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جو تصورات واصول پہلے مبہم سے تھے وہ غور وفکر سے واضح ومعین ہو گئے اور جو معنوی نتائج ان میں مضمر تھے وہ زیادہ واضح طور پر قرار پا گئے۔ اس طرح پر حاوی وغالب اصول میں جو کچھ تضاد مخفی تھے وہ عیاں ہو گئے اور اس کے ناواجب ادعا کا پردہ فاش ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عقل انسانی نے جب ترقی کی طرف قدم بڑھائے تو اس کا میلان یہ ہو گیا کہ کسی اور مخالف نظریہ کی لحاظ سے یہ اصول ساقط کر دیا گیا یا اسے محدود کر دیا گیا۔ اولاً یہ نظریہ بھی نسبتاً اپنی عدم تحقیر کے باعث محفوظ رہا اور پھر اس کامیابی کے بعد اس پر بھی ارتقا کا وہی عمل جاری ہوا، مثلاً ہم ادھر حال کے زمانہ میں یہ دیکھ چکے ہیں کہ ایک شئے "آزادی" تھی جب جوش بڑھا ہوا تھا تو اولاً اس کے معنی میں دونوں مفہوم داخل تھے کہ افراد جو چاہیں کریں اور کثرت رائے اپنی سی جو چاہے کرے۔ بعد میں ان دونوں کے درمیان مخالفت وتصادم ظاہر ہوا ۱۲۱ اور عمومیت ایسے لباس میں جلوہ گر ہوئی کہ اس میں "آئندہ کی غلامی" کا امکان نظر آنے لگا۔ علہ

علہ۔ مقابلہ کیجئے میری تصنیف مبادی سیاسیات باب پانزدہم صفحہ (۲۴۳ طبع دوم)

علہ۔ ملاحظہ ہو مسٹر ہربرٹ اسپنسر کی تصنیف فرد بمقابلہ مملکت (The manursees the state)

لیکن اگر سیاسی نظریات محض دار المطالعہ یا درسی کمرے میں بند رہتے تو اس حالت میں اس تواتر کی کیفیت اور اس کی واقعی رفتار اس سے بہت مختلف ہو گئی ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ سیاسی اصول جس حد تک جنگ وجدل کے کار آمد آلات ہیں اسی حد تک جب کام کی ضرورت پڑتی ہے تو ان سے کام لیا جاتا ہے لیکن ساتھ ہی تنازعات کی نازک ضرورتوں کے لحاظ سے اس میں بہت کچھ ترمیم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ازمنۂ وسطےٰ کے دوران میں ایک خاص اصول کی قسمت کا جو حشر ہوا وہ اس کی نہایت ہی نمایاں مثال ہے' اس اصول پر ہمیں بہت کچھ کہنا ہے' وہ اصول یہ ہے کہ دنیاوی حکومت کے اقتدار کا جائز منبع محکوم کی مرضی ورضامندی ہے۔ ازمنۂ وسطےٰ کے بیشتر حصہ میں اس اصول کو مقننوں نے فی الجملہ قبول کر لیا تھا' اور اس زمانے کے نقطۂ خیال سے عالم عیسوی کی ترتیب (نظم) سیاسی کے لئے سب سے اگلی دنیاوی اقتدار شہنشاہوں کا تھا چنانچہ جسٹینین کے "ادارات" میں یہ لکھا ہوا ہے کہ شہنشاہوں کو یہ اقتدار رومانی قوم سے حاصل ہوا ہے۔ جب تک کلیسا اور سلطنت میں ہم آہنگی رہی اس اصول کی دلچسپی محض آثار قدیمہ کی سی تھی مگر جب پاپاؤں اور شہنشاہوں میں جنگ ہونے لگی، تو اس وقت پاپائیت کے پرجوش طرفداروں کو یہ سوجھا کہ قوم نے جو کچھ دیا ہو وہ جائز طور پر اسے واپس بھی لے سکتی ہے' اور جو شہنشاہ اپنے نقض معاہدہ کا مرتکب ہو وہ اسطرح خارج کیا جا سکتا ہے جیسے مرتکب دزدی گلہ بان۔[1] اس طرح "انتقال اختیار" کے ایک قطعی خیال کو فوری دلچسپی حاصل ہو گئی۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ بادشاہوں کو جو اختیار الحال حاصل ہے وہ ابتداً قوم کا حق تھا تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اگر بادشاہ ان اختیارات کو ایک مرتبہ ترک کر دیں تو قوم انھیں پھر اپنے قبضہ میں لیلے۔ اگر ایسا ہو تو کس طرح اور کن حالات کے تحت میں؟ ان سوالات کا جواب جس طرح بھی دیا جائے لیکن اس اصول میں استدلالی ارتقا حاصل ہو گیا تھا اور اقتدار اعلےٰ کے اساسی تصور کو نسبتاً زیادہ قطعی دستی نوعیت حاصل ہو گئی الغرض

[1] یہ مانے گولڈ فون لاؤٹرباخ Manegold von Lauterbach (ولادت ۱۰۳۰ء) کا مقولہ ہے جسے گیرسے بریخیٹ نے زدواد اکادمیہ بیویریا سنہ [illegible] میں نقل کیا ہے۔

سیاسی خیال نے سترھویں اور اٹھارھویں صدیوں کے دقیق و پیچیدہ "معاہدۂ معاشری" کے نظریئے کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا۔

لیکن اس موخر دور میں سر برآوردہ اصحاب فکر نے معاہدۂ معاشری کے اس خیال کو جس طرز سے استعمال کیا ہے اس سے بہت ہی نمایاں طور پر یہ واضح ہوتا ہے کہ خیال پر واقعات کا اثر کس حد تک پڑتا ہے۔ ہابس نے اس سے مطلق العنانی کی بنیاد کا کام لیا۔ لاک نے اسی کو محدود آئینی بادشاہی کی بنا قرار دی، اور روسو نے اسی پر قوم کی فرمانروائی کی عمارت کھڑی کر دی۔

۲۔ ہابس سے شروع کیجئے، اور حقیقت یہ ہے کہ جدید سیاسی تخیلات کی نسبت یہ کہنا بجا ہے کہ ان کی ابتدا اسی نے کی ہے۔ عالم واقعات میں سیاسی نظم و اتحاد کے ملوکی بنیاد پر قائم ہو جانے کا جواب عالم خیال میں ہابس کے اصول تھے، اقتدار اعلے کے جدید اصول مسلمہ کی جس واضح اور بے لاگ طور پر اس نے تعریف و توضیح کی اس سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اصول تخیلات جدیدہ کی طرف پلٹا کھا گیا ہے۔

۱۶۴۲ء میں جب انگلستان کی عظیم الشان بغاوت کا وقت سر پر آگیا تھا مگر ہنوز بغاوت واقع نہیں ہوی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانے میں اس کے تخیلات نے پہلی مرتبہ ایک صورت اختیار کی مگر میں ان کی اس شکل پر بحث کروں گا جو اس نے ہابس کے شہرۂ آفاق رسالہ لیویاتھن میں اختیار کی جس کی اشاعت ۱۶۵۱ء میں ہوی یہ سال ۱۶۴۹ء میں بادشاہ کے قتل اور ۱۶۵۳ء میں پارلیمنٹ کے "قتل" کے عین وسط میں واقع تھا۔ پس اس میں کوئی امر باعث استعجاب نہیں ہو سکتا کہ ایسے نازک موقع پر انانیت کے متعلق کسی سیاسی فلسفی کو بہت تیز بلکہ مبالغہ آمیز احساس پیدا ہو جائے اور وہ نظم و امن کے حالات پر مبالغہ کی حد تک زور دینے لگے۔

بودین[۱] کی طرح ہابس بھی اس امر پر زور دیتا ہے کہ ہر ایک سیاسی قوم میں جو اس نام کی سزاوار ہو یعنی ہر ایک قوم میں جو پائدار سیاسی نظم و امن سے لطف اندوز ہو کہیں نہ کہیں کسی جماعت یا کسی شخص کے اندر ایسا اختیار مرکوز ہونا چاہیئے جو قانون کا

---

[۱] خطبۂ بست وسوم۔

منبع ہونے کی وجہ سے خود قانون کے قیود کے تابع نہ ہو سکے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اختیار ایجابی قانون کے قیود کے تابع نہیں ہو سکتا (ایجابی قانون وہی ہے جسے ہم ملک کے قوانین یا انسان کے بنائے ہوئے قوانین کہتے ہیں) کیونکہ وہی اختیار ملک کے اندر سب سے برتر انسانی قانون ساز ہے، اور وہ خود اپنے قوانین سے مقید نہیں ہو سکتا البتہ یہ اس اعلیٰ و افضل اخلاقی ضابطہ کے تابع ہے جسے فطرتاً ہر شخص فرد ذی عقل کی حیثیت سے اچھی طرح سمجھتا ہے، اسی کو قانون فطرت، قانون ربانی، قانون عقل اوّل جو چاہئے کہے۔ ہابس کے زمانے میں کوئی شخص اس امر سے انکار کرنے کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ ہر شخص کسی نہ کسی مفہوم میں قانون فطرت سے مقید ہے اور اس لئے مقتدر اعلیٰ کا بھی اسی طرح مقید ہونا لازمی ہے، مگر عملی حیثیت سے ہابس کی رائے میں یہ قانون مقتدر اعلیٰ کو صرف خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتا ہی کیونکہ قانون فطرت کے لئے تاویل کی ضرورت ہے اور رعایا پر یہ لازم ہے کہ مقتدر اعلیٰ اس قانون کی جو تاویل کرے وہ اسے قبول کرلیں، اس کی اجازت نہیں ہو سکتی کہ ہر شخص اس حق کا دعویٰ کرے کہ اس کی اپنی رائے کے موافق قانون فطرت کی جو تاویل ہو اس کے موافق وہ فرمانروا پر حکم لگائے، اور جس امر کو وہ اپنی رائے میں اس قانون کی خلاف ورزی سمجھے اس کی مخالفت کرے، کیونکہ اس طرح تو ایسی لاحکمیت کا دروازہ کھل جائے گا کہ اس کے سد باب کی کوئی صورت نہ رہیگی۔ اسوجہ[1] سے (۱) "صاحب اقتدار اعلیٰ کے افعال پر رعایا جائز طور پر الزام نہیں عاید کر سکتی"۔
(۲) "صاحب اقتدار اعلیٰ جو کچھ بھی کرے رعایا اس کی سزا دینے سے معذور ہے"۔
(۳) "صاحب اقتدار اعلیٰ کو یہ استحقاق حاصل ہے کہ وہ یہ فیصلہ کرے اور اس پر عمل کرے کہ رعایا کی امن و محافظت کے لئے کن امور کی ضرورت ہے"۔ (۴) "اور یہ بھی فیصلہ کرے کہ کن اصول و عقاید کی انھیں تعلیم ہونا چاہیئے"۔ (۵) "صاحب اقتدار اعلیٰ کو یہ کل اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے قواعد معین کرے جن کے موافق ہر شخص کو یہ معلوم ہو جائے کہ بغیر اس کے رعایا میں سے کوئی دوسرا شخص اس سے

[1] "لیوایاتھن" باب ۱۸۔

کسی قسم کا آزار پہنچائے وہ کن کن چیزوں سے نفع حاصل کرسکتا ہے اور اسے کون کون سے کام کرنے کی اجازت ہے۔" (۶) تمام عدالتی کارروائی اور تنازعات کے فیصلہ کا حق بھی اسے حاصل ہے۔" (۷) اور اسے یہ بھی حق حاصل ہے "کہ جس طرح وہ مناسب سمجھے صلہ و سزا دے۔" (۸) اپنے حسب صوابدید صلح و جنگ کرے۔" (۹) تمام مشیروں اور وزیروں کا انتخاب کرے۔" (۱۰) یہ حقوق ناقابل تقسیم و ناقابل انفکاک ہیں۔

یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ نگرانی عقاید پر خاص زور دیا گیا ہے جس سے ہابس کی مراد بالتخصیص مذہبی تعلیم سے ہے۔ ہابس نے "مسیحی دولت عامہ" کا جو نقشہ تجویز کیا ہے اس میں اسی (تعلیم مذہبی کی) ہیئت کی حمایت میں تقریباً نصف کتاب صرف ہوگئی ہے ازمنۂ وسطے کے تمام آخری دور یعنی گیارھویں صدی کے ختم ہونے کے بعد سے مغربی یورپ کی سلطنتیں اس مشکل کو محسوس کرتی رہی تھیں کہ انھیں دو مختلف آقاؤں کی خدمت کرنا ہے ایک مذہبی اور دوسرا ملکی مگر عالم عیسوی کے انتشار سے پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کی پرغضب کشمکش میں عارضی طور پر اس مشکل میں اضافہ ہوگیا تھا ہابس کے خیالات نے جب پہلی مرتبہ (۱۶۴۰ء میں) ایک صورت اختیار کی اس وقت تک مغربی یورپ میں ملکی مناقشات یا ملکی مناقشات کے اندیشہ میں ایک صدی گزر چکی تھی، اور یہ مناقشات مذہبی تنازعات کی وجہ سے برپا ہوئے تھے۔ پس اس سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ کیا وجہ ہوئی کہ وہ عقیدۂ مسلمہ جو قواعد مذہبی کو قوانین کے خلاف اور رومانی اقتدار کو ملکی اقتدار کے بالمقابل قائم کرتا ہو ہابس کی نظر میں وہ عقیدہ دولت عامہ کے امراض میں سے ایک بدترین مرض معلوم ہوتا تھا[۱]۔ اس کا بدلا اس کی نظر میں صرف یہی تھا کہ صاحب اقتدار کے لئے اس ناقابل انفکاک حق کا دعوے کرے کہ "رایوں اور عقیدوں کا فیصلہ وہی کرے" اور ہر ایک ایسے عقیدے کی تعلیم کو روک دے جو صلح و امن کا پیدا کرنے والا نہو۔

اس لئے ہابس کے سیاسی عقیدے کی تعریف یہی ہوسکتی ہے کہ "وہ مطلق العنانی" کا طریقہ تھا مگر اصولاً یا ابتداً یہ ضرور نہیں کہ یہ شاہی مطلق العنانی ہو۔ یہ حکومتی مطلق العنانی ہو

---

[۱] لیوِیاتھن Leviathan بابِ بست و نہم۔

یعنی نظم وامن کے اصول کو سیاسی تعمیر کے تمام متصادم اصول پر نظری حیثیت سے فتح حاصل ہونا چاہیئے کیونکہ یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ ہابس کے حقیقی مسلکے میں سیاسی نظم کے لئے صرف یہ ضروری ہے کہ یہ ناقابل بحث و ناقابل تقسیم اختیار اعلیٰ (جو از روئے قانون غیر محدود ہو) کسی جماعت یا فرد واحد میں موجود ہونا چاہیئے وہ اس ضرورت کو لازمی نہیں قرار دیتا ہے کہ یہ اختیار کسی بادشاہ کے اندر مرکوز ہونا چاہیئے۔ اگر یہ اختیار امرا کی کسی جماعت یا قوم کے عامۃ الناس ہی میں مرکوز ہو تب بھی اس کی شرط اسی طرح پوری ہو جائے گی۔ اس کا دعوی یہ ہے کہ ہر ایک منتظم قوم کے افراد کو حکومت کی کسی مسلمہ شکل پر یکساں طور پر رضامند ہونا چاہیئے لیکن اس اطاعت میں یہ استثنا بھی ہے کہ اطاعت کی یہ پابندی اسی حد تک ہے کہ وہ بقائے ذات کے اس سے بھی زیادہ بنیادی اصول کو مغلوب نکردے اور صرف اسوقت تک کے لئے ہے جب تک کہ حکومت میں اس فرد کی حفاظت کی قابلیت موجود ہو۔ سنہ ۱۶۵۱ء میں یہ آخری شرط نہایت ہی اہم تھی۔ یہاں میں اپنا یہ خیال ظاہر کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ سیسے نفسانہ مطلق العنانی جو رعایا کی وفاداری کو بادشاہ کی طاقت محافظت تک محدود کرتی ہو وہ ان عام وفاداران شاہی کے مذاق کے عین موافق نہ تھی جو انگلستان کے عارضی مسلوب الاختیار بادشاہ کے جانبدار تھے۔

اس کے ساتھ تجریدی حیثیت سے ہابس کا بادشاہی کو مرجح سمجھنا صاف طور پر مسلم ہے (اس کے نزدیک) حکومت کی یہی ایک جائز شکل نہیں ہے مگر یہ شکل بہترین شکل ہے کسی اور شکل کی بہ نسبت اس میں مفاد زیادہ اور مضار کم ہیں، نیز اس کا یہ یقین و اعتقاد بھی صاف ظاہر ہے کہ اگر انگریز اقتدار اعلےٰ کے متعلق اس کے اصول کو ایک مرتبہ قبول کرلیں یعنی اگر یہ قبول کرلیا جائے کہ برطانی دستور سلطنت کے اندر کہیں نہ کہیں کوئی غیر محدود الاختیار صاحب اقتدار اعلےٰ موجود ہے تو پھر اس میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ انگریزوں کے آئینی روایات کے بموجب وہ صاحب اقتدار اعلےٰ یہی موروثی بادشاہ ہے ہابس کا خیال یہ ہے کہ جس پارلیمنٹ کے برطرف کر دینے کا حق بلاشک و شبہ بادشاہ کو حاصل ہو تو وہ پارلیمنٹ مقتدر اعلےٰ نہیں ہو سکتی بلکہ اقتدار شاہی پر پارلیمنٹ کی روک ٹوک ناگوار ہے اور اس لئے نظم وامن کے لئے خالی از خطرہ نہیں ہے۔

غالباً خیال فرمانروائی کے انطباق کے متعلق اس بیان سے اس وقت کی عام رائے کا

اظہار ہو جاتا ہے۔ یورپی تاریخ کے اس دور میں یہ اصول کہ ہر سلطنت کے لئے ایک ایسے مقتدر اعلےٰ کا وجود لازمی ہے جس کے اختیارات قانوناً محدود نہ ہوں از روئے قانون فرمانروائی کا غیر محدود اصول (جیساکہ ہر ایک سلطنت کے لئے لازمی ہے) اگرچہ نظری و حقیقی اعتبار سے غیر شاہی تھا مگر نتیجۃً و عملاً عام طور پر شاہی تھا جو جماعتیں بادشاہی سے مقابلہ کر رہی تھیں واقعتاً ان کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ وہ اقتدار اعلےٰ میں حصہ لینا چاہتی تھیں بلکہ وہ اسے محض محدود کرنا چاہتی تھیں

۲- اب ہابس کے اصل نظریہ کی طرف پلٹنا چاہئے اور یہ دریافت کرنا چاہئے کہ جس امر کا اس نے دعویٰ کیا ہے اس کی ضرورت کو اس نے کس طرح ثابت کیا ہے؟ کوئی فرد واحد ایسے صاحب اقتدار اعلیٰ کے اس کامل انقیاد کی حالت میں کس طرح لایا جائے؟ اس موقع پر ہابس نے اپنے مسلمہ کے قائم کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے اس میں زمانۂ حال کے خصائص نظر نہیں آتے، وہ ان خیالات و مفروضات سے کام لیتا ہے جو بہت قدیم زمانہ سے چلے آرہے تھے۔ وہ حکومت کے اس اصول مسلمہ کو اختیار کرتا ہے جو رعایا کی رضامندی سے پیدا ہوتا ہے، اور جس کا میں پہلے ذکر کرچکا ہوں وہ مسلمہ یہ ہے کہ سیاسی نظم معاشرت معمولاً اس معاہدے سے قائم ہوتا ہے کہ جو لوگ انفرادی طور پر "حالت فطری" میں رہتے تھے وہ سب ملکر ایک قوم بن جاتے ہیں۔ اور حکومت کی اطاعت کی پابندی اختیار کرتے ہیں۔ وہ یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اس طرح متحد ہوکر ایک پائدار دولت عامہ کا بنانا اس قسم کے افراد میں ہر ایک کے لئے منفرداً و مجتمعاً نہایت سودمند ہے، کیونکہ "حالت فطری" لاحکمیت کی حالت ہونے کی وجہ سے ہمہ گیر جنگ و مصیبت کی حالت ہے، اور پھر اس کی دلیل یہ ہے کہ واقعی طور پر ایک پائدار دولت عامہ کا قیام صرف اس صورت سے ممکن ہے کہ ایک ایسا معاہدہ ہو جو منفرداً و مجتمعاً سب کو کسی غیر محدود الاختیار صاحب اقتدار اعلےٰ کی بے چون و چرا اطاعت کا پابند کردے۔ اس معاہدہ میں اگر ذرا بھی شرائط کا شمول ہوا تو اس سے بحث و جدل کا دروازہ کھل جائے گا جس کا قرار واقعی تدارک نہ ہوسکیگا اور لاحکومتی تک منجر ہوگا۔

یہاں یہ امر اہم ہے کہ ہابس کے مسلمہ میں روایتی اور طبعزاد عناصر کے درمیان فرق ملحوظ رکھا جائے۔ یہ کہ سیاسی نظم معاشرت کے قبل کوئی حالت فطرت کی تھی۔

یہ مدتوں کی قبول شدہ رائے تھی، اور نیز یہ کہ حکومت اور محکوم کے باہمی حقوق و فرائض ان دونوں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کے معاہدے پر مبنی تھے، مگر مقبول رائے یہ تھی کہ فطرت کی حالت میں افراد، فطرت یا عقل کے قوانین کے پابند تھے، اور یہ کہ سرشت انسانی کے نقص کا لحاظ رکھتے ہوئے، معمولی حالت میں توقع ہو سکتی تھی کہ وہ ان قوانین کی اطاعت کرتے ہونگے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ انسان ایک ذی عقل و مدنی الطبع مخلوق ہے اور دوسرے حیوانات میں اور اس میں مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ پرسکون ارتباط کا شوق اور عقل کی رہبری میں چلنے کا میلان ہے، اس لئے جب وہ انسانی حکومت کے تحت میں نہیں بلکہ فطرت کی حالت میں ہوتا تھا تو وہ عموماً یہ تسلیم کرتا تھا کہ اسے اپنے ہم جنسوں کے اوپر دست درازی کرنے سے بچنا چاہیئے اور ان کے ساتھ اتفاق و ارتباط کو ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اس میں شک نہیں ایک ضعیف البنیان مخلوق ہونے کی وجہ سے وہ کبھی اپنے معاہدوں کو توڑ دیتا، اپنے ہمسایوں پر حملہ کر بیٹھتا اور ان سے مناقشات برپا کر دیتا تھا، اور پھر اس میں بھی شک نہیں کہ اس ہمسائے کے لئے یہ امر باعث زحمت ہوتا تھا کہ کوئی حکومت ایسی نہیں ہوتی تھی جو نظم و امن کو بحال کرے اور اس لئے اسے خود ہی اپنے حقوق کے لئے جنگ کرنا پڑتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ فطرت کی حالت ایک ایسی حالت تھی جس میں جنگ واقع ہوتی تھی، اور اسے جائز قرار دینا پڑتا تھا، اور یہ ایسی حالت ہے کہ زمانۂ جدید کی قوموں کے باہمی تعلقات میں بھی اس حالت کا صاف اظہار ہو رہا ہے مگر اس پر بھی جنگ ایک استثنائی حادثہ تھا یعنی جن سیدھے سادے قواعد کو انسان معمولاً ملحوظ رکھتا ہے جو ایک دوسرے کی ضرر رسانی کی ممانعت اور معاہدے کے عملدرآمد کے حکم پر مشتمل ہوتے ہیں، لیکن کبھی اتفاقیہ انسان انھیں توڑ دیتا تھا۔

یہی مقبولہ رائے تھی، مگر ہابس نے دلیرانہ طور پر ان سب کو قطع کر دیا، اس نے یہ کہا کہ انسان فطرتاً ایک خود غرض مخلوق ہے، جن معاشری میلانات کا وہ اس بلند آہنگی سے اعلان کرتا ہے وہ فی الاصل ان خواہشوں پر مبنی ہیں کہ دوسروں سے وہ انتفاع و شان و شوکت حاصل کرے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ دوسروں کی

مدد کا محتاج ہے، لیکن اگر اس کے تمام خطرات رفع ہو جائیں مثلاً یہ کہ اس کی قوت کا غلبہ صاف طور پر عیاں ہو جائے تو یہ احتیاج اسے اس طرف لیجاتی ہے کہ دوسروں کے ساتھ مساویانہ معاشرت کے بجائے وہ ان پر تسلط و تغلب کا خواہاں ہو جائے۔ اس لئے حالت فطری کو (لامحالہ) یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ ایک ایسی حالت تھی جس میں انسان کی متصادم خواہشوں اور عملاً قوت کی برابری کے احساس کے باعث دائمی جنگ برپا رہتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے مال و اسباب پر حریصانہ نظر لگائے رہتے اور اسے حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے پر حملہ کرتے رہتے تھے۔ اس قسم کے حملے کے خوف سے وہ بغرض حصول اطمینان اپنے ہمسایوں کو فتح کر لیتے تھے، اور جب اور کوئی محرک نہیں ہوتا تھا تو وہ شان و رفعت کے لئے جنگ کرنے لگتے تھے اس لئے کسی فہمیدہ شخص کے لئے بھی جو خود کو اس حالت میں پائے امن اور ان قواعد کی نگہداشت کی خواہش جن سے قیام امن کا مقصد حاصل ہوتا ہو، اس وقت تک محض ایک آرزو و تمنا رہتی تھی، جب تک کہ کوئی دولت عامہ قائم نہ ہو جاتی۔ ہم اس حالت میں ہر ایک شخص کے حق، یا اس فطری آزادی کو محدود نہیں کر سکتے کہ وہ جس شے کو چاہے اپنے قبضہ میں کر لے یہاں تک کہ دوسرے انسان پر بھی قبضہ کر لے، کیونکہ اپنی زندگی کے قائم رکھنے کے لئے اس قسم کا قبضہ و انتفاع بہترین ذریعہ ہے اور عقل اسے اس امر سے روکتی تھی کہ وہ ایسے وسائل کو ساقط کر دے جس سے اس کی زندگی بہترین طور پر قائم رہ سکے اخلاقی قواعد پر اس طرح عمل کرنے سے کہ دوسرے بھی اسی طرح اس کی پابندی نہ کریں نتیجہ صرف یہ ہوتا کہ وہ دوسروں کا شکار ہو جاتا اور ایسا کرنا اس کا فرض نہیں ہو سکتا۔

ہابس کے پرزور الفاظ میں، ایسی حالت میں انسان کی زندگی، بلاشک و شبہ یکہ و تنہا، ضعیف، ناگوار، وحشیانہ اور مختصر ہو جائیگی[1] مگر بایں ہمہ انسان کی فطری حالت یہی ہے، اگرچہ فطرتاً اسے امن کی قوی ضرورت ہے مگر فطری طور پر (یعنی سیاسی نظم و ترتیب کے کسی معاہدے کے قائم کئے بغیر) وہ اس کے حاصل کرنے کی قابلیت بھی نہیں رکھتا ہے۔ امن کا موقع اس کے لئے صرف اسی صورت میں ہے

[1] لیویاتھن، باب سیزدہم۔

کہ وہ کسی ایسی حکومت کی اطاعت پر اتفاق کرے جس کی کارفرمائی کے حق کے متعلق اس نے یہ اقرار کیا ہو کہ جب تک اس حکومت کی وجہ سے امن کی نعمت عظمیٰ حاصل رہے اس وقت تک وہ اس کے اس حق پر رد و قدح نہ کرے گا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ اس رائے کے دونوں حصے باہم متعلق ہیں۔ چونکہ غیر محکومانہ حالت ایسی پرآلام ہے اس لئے حکومت کے لئے غیر محدود اختیار روا رکھنا چاہیئے۔ اگر آپ حالت فطری کی نسبت اس رائے کو معرض بحث میں لاتے ہیں تو اس کے متعلق ہابس کا جواب پر زور ہے۔ اگرچہ نصف ہی صداقت سہی مگر پھر بھی صداقت کا ایک تکلیف دہ عنصر اس کے اندر موجود ہے۔ میں اسے خود اسی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں "تمام جگہوں میں جہاں انسان چھوٹے چھوٹے خاندان بنا کر رہا ہے وہاں ایک دوسرے کو لوٹنا اور غارت کرنا گویا ایک پیشہ ہو جاتا تھا، اور بجائے اس کے کہ اسے قانون فطرت کے خلاف سمجھا جائے جو لوگ غارتگری سے جتنا ہی زیادہ مال حاصل کرتے تھے وہ اتنے ہی زیادہ معزز سمجھے جاتے تھے"[1]۔ مگر آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا اس وجہ سے تھا کہ وہ لوگ وحشی ہوتے تھے ہابس کہتا ہے "کہ نہیں ایسا نہیں تھا" اس وقت چھوٹے چھوٹے خاندان جو کچھ کرتے تھے وہی اب شہر اور بادشاہتیں کرتی ہیں، یہ گویا بڑے خاندان ہیں اور (اپنی حفاظت کے لئے) وہ ہر طرح کے حیلے تراشتے ہیں کہ انھیں اپنے اوپر حملے کا یا حملہ آوروں کو مدد ملنے کا خوف و اندیشہ ہے اور اس بنا پر وہ اپنی مملکت کو بڑھاتے جاتے ہیں، اور جہاں تک ان سے ہو سکتا ہے علانیہ قوت سے یا بہ نظر احتیاط خفیہ حیل و تدابیر سے اپنے دشمنوں کو زیر کر لیں یا انھیں کمزور کر دیں، اور یہ سب کچھ وہ انصافاً کرتے ہیں، اور ان کاموں کے لئے ازمنۂ مابعد میں عزت کے ساتھ انکا نام لیا جاتا ہے"[2]۔ پھر کہتا ہے کہ ان لوگوں کے طرز زندگی پر نظر ڈالئے جو پہلے، ایک پرامن حکومت کے تحت میں رہتے آئے ہوں اور پھر خانہ جنگی کی ذلت میں

[1] "لیوایاتھن" باب ہفدہم۔

[2] "لیوایاتھن" باب ہفدہم۔

پھنس جائیں[1]۔ ہابس اپنے ہمعصروں کو خطاب کرکے کہتا ہے کہ اگر آپ کو آپ بھی شک ہو تو آپ اس امر پر خیال کیجئے کہ کسی ایسے نظم معاشرت میں بھی جہاں حکومت کا اثر ہے انسان کے افعال سے اپنے ہمجنسوں کی نسبت کیا خیال مترشح ہوتا ہے کوئی شخص جب سفر کو جاتا ہے تو وہ خود ہر طرح مسلح ہوتا ہے اور چاہتا ہے کہ ساتھیوں کی بھی کافی تعداد اس کے ساتھ ہو۔ وہ جب سونے جاتا ہے تو دروازے کو مقفل کر دیتا ہے وہ جب گھر میں موجود ہوتا ہے اس وقت بھی اپنے صندوقوں میں قفل لگائے رہتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس حالت میں کرتا ہے کہ وہ یہ جانتا ہے کہ اسے جو کچھ بھی ضرر پہنچے گا اس کے انتقام لینے کے لئے قوانین و سرکاری عہدہ دار مسلح کھڑے ہیں[2]۔

پس اس قسم کی مخلوق کے لئے کوئی معاہدہ، جو ایک پائدار سیاسی نظم و ترتیب مہیا کر سکے صرف یہی ہو سکتا ہے کہ کہیں نہ کہیں بادشاہ، مجلس منتخبات یا جمعیت عامہ کی ذات میں حکمرانی کی کوئی مطلق العنان، ناقابل انفکاک، ناقابل تقسیم اور غیر محدود قوت موجود ہو اور اگر اس میں واقعی حدبندی ہو تو صرف اتنی کہ افراد کو سزا کی مقاومت کرنے یا اس سے بچنے کا حق ہو یعنی اسے بقائے ذات کا حق حاصل ہو۔

پس اس طرح ہابس کا اصول مسلمہ (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں) اس عام اعتقاد کی نہایت ہی پرزور اور یکطرفہ شکل میں تائید کرتا ہے جو مغربی یورپ کی تقلیب عظیم کے ساتھ ہی ساتھ پیدا ہوا اور جسے سترھویں صدی میں تکمیل حاصل ہوئی کہ جدید سلطنت شاہی مطلق العنانی کی بنیاد پر مرتب ہوئی ہے۔ وہ اعتقاد یہ تھا کہ پائدار سیاسی نظم و ترتیب کے لئے سلطنت کے اندر کہیں نہ کہیں ایک ایسی طاقت کی ضرورت ہے جو ناقابل تقسیم اور بلا روک سب سے اعلیٰ ہو اور یہ مقصد بہترین طور سے اس طرح پر حاصل ہو سکتا ہے کہ یہ اختیار موروثی بادشاہ کی تفویض میں دیدیا جائے۔

مگر جیسا کہ میں تشریح کر چکا ہوں یہ اصول مسلمہ ابتداءً اساساً حکومتی مطلق العنانی کا اصول ہے اور شاہی مطلق العنانی پر اس کا اطلاق صرف بالمعنی اور واقعات ہمعصر

---

[1] "لیوایاتھن" باب سیزدہم۔

[2] "لیوایاتھن" باب ۱۳۔

کی تطبیق میں ہوتا ہے' اس کے ساتھ ہی' یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ بعد کے سیاسی خیال پر
اس کا اہم اثر زیادہ تر اس کی پہلی ہیئت کے اعتبار سے پڑا ہے یعنی یہ اصول
مسلمہ کہ ہر ایک منتظم سیاسی جماعت میں از روئے قانون غیر محدود اقتدار اعلےٰ
کہیں نہ کہیں مرکوز ہونا چاہیئے ہنوز مروجہ سیاسی نظریہ کا ایک وسیع القبول عنصر
بنا ہوا ہے۔ انگلستان کی کشمکش میں ہابس کے اصول مسلمہ کو شاہی کی تائید کی حیثیت
سے کچھ اثر نہیں حاصل ہوا۔ یہ اصول وہگوں کے احساس آزادی اور ٹوریوں کے
احساس وفاداری' دونوں سے بیگانہ تھا' ٹوریوں کے احساس سے اس وجہ سے
کہ وہ مسلوب الاختیار بادشاہ کے لئے کسی قسم کی ذمہ داری کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ دوسری
طرف اس اصول کا کلیسا کو بغیر چون وچرا مملکت کے ماتحت قرار دینا کسی کو بھی پسند
نہیں آیا۔ تاہم جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں خیالات کے عالم میں یہ اصول اس کا قائم مقام
تھا جو مغربی یورپ کے نظم سلطنت کو خالص شاہی کی طرف لئے جا رہی تھی۔

۴۔ لیکن جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اگرچہ شاہی کا یہ دور جسے سرسری طور پر
مطلق العنانہ دور کہہ سکتے ہیں' عام طور پر مغربی یورپ کی سلطنتوں کی ارتقا میں ایک
معتدل درجہ قرار پاتا ہے' لیکن انگلستان کے ارتقائی رفتار مختلف و مستثنیٰ تھی۔ شاہی
اور پارلیمنٹ دعاوی میں مدت سے جو تصادم برپا تھا وہ ۱۶۸۸ء میں اس قرارداد سے
دفعتہً ختم ہو گیا جس نے اسٹوارٹ کے خودکام خاندان کی علیحدگی کو قطعی کر دیا۔ اس سے
یہ حتمی طور پر قرار پا گیا کہ انگلستان کے بادشاہ کی طرف سے انگریزوں کی اطاعت
کا دعوی حتماً و قطعاً اس قاعدۂ قانون کے تابع ہے جس میں ترمیم صرف پارلیمنٹ
کر سکتی ہے' اس کا نفاذ وہ جج کر سکتے ہیں' جن کی برطرفی صرف پارلیمنٹ کی طرف
سے ہو سکتی ہے اور نیز یہ کہ حکومت کے اخراجات کے لئے قوم پر جو کچھ محصول لگانے
کی ضرورت ہو اس کا تعین صرف نمائندگان قوم ہی کر سکتے ہیں۔

اس طولانی جد و جہد کے اس اہم نتیجے کو جس عام سیاسی نظریئے نے حق
بجانب ثابت کیا وہ لاک کے "رسالۂ حکومت ملکی" میں ملتا ہے۔ جب اس کے
اصول کا مطالعہ کیا جائے تو اس امر کا یاد رکھنا نہایت اہم ہے کہ اس نے یہ رسالہ
ایک ایسی قوم کے لئے لکھا تھا جسے چار صدیوں کی مسلسل روایت نے یہ سمجھا دیا تھا

کہ انگریز جن قوانین کی اطاعت کے پابند ہیں ان کے وضع کرنے اور انگریز جن محصولوں کے ادا کرنے کے پابند ہیں ان کے وصول کرنے کے لئے دو ایوانوں کی ایک پارلیمنٹ کے (جو سلطنت انگلستان کے لئے واحد پارلیمنٹ ہے)، اتحاد عمل اور رضامندی کی ضرورت ہے اور وہ انگریز اسے عادتاً اپنا ایک امتیاز خاص سمجھتے تھے کیونکہ وہ فرانس کی اس حالت سے اچھی طرح واقف تھے جو اس سے بالکل مختلف تھی۔

ہابس کی طرح لاک بھی اس روایتی مقبول عام رائے سے ابتدا کرتا ہے کہ محکوم کی اطاعت کے لئے کسی حکومت کا جائز دعوی معمولی حالت میں کسی بنیادی معاہدے پر مبنی ہونا چاہیئے جس کے بموجب کسی سیاسی نظم معاشرت کے ارکان، حکومت کے صحیح فوائد سے مستفید ہونے کے لئے ان حقوق کے ایک حصے سے دست بردار ہو جائیں جو ابتداً آزاد انسانی مخلوق ہونے کے اعتبار سے انھیں حاصل تھے لیکن اس معاہدے کے شرائط کے متعلق لاک کا خیال اصولی طور پر ہابس کے خیال سے مختلف ہے۔ لاک کی رائے کے موافق افراد جس معاہدے کی رو سے ایک سیاسی نظم معاشرت قائم کرتے ہیں، اور نظم معاشرت کی کثرت رائے کے فیصلہ پر کاربند ہونے کا اتفاق کرتے ہیں، وہ معاہدہ چند معینہ اغراض کے لئے عمل میں آتا ہے اور اس طرح سے جو معاشرہ مرتب ہوتا ہے اس کی کثرت رائے جب کوئی حکومت قائم کرتی ہے تو یہ فرض کرنا چاہیئے کہ وہ اس حکومت کو صرف انھیں اغراض کے حصول کے لئے اختیار تفویض کرتی ہے، اور اگر اس اعتماد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے تو حکومت کی اطاعت کا فرض ساقط ہو جاتا ہے۔

بنیادی معاہدہ اور اس کے نتائج کے اس اساسی فرق کا تعلق اس رائے سے ہے کہ سیاسی نظم معاشرت میں داخل ہونے کے قبل انسان کی طبعی حالت کیا تھی، (اور اس موقع پر لاک کی رائے) ہابس کی رائے سے بہت مغائر ہے

عہ ۔ میں نے روایتی رائے کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کے متعلق مقابلہ کیجئے مسٹر ہوکر کی تصنیف قوانین کلیسائی نظم حکومت Laws of Ecclesiastical polity کتاب اول باب دہم۔

اور یہیں ہمیں یہ لحاظ کرنا چاہئے کہ فطرت کی اس حالت کے متعلق لاک کی رائے
اگرچہ بعض اہم اعتبارات سے اس زمانہ کی روایتی و عام مقبول رائے کے
خلاف تھی، پھر بھی ہابس نے جو تاریک تصویر کھینچی ہے اس کی نسبت یہ رائے
روایتی رائے سے زیادہ قریب تھی۔ جیساکہ میں کہہ چکا ہوں، روایتی رائے
یہ تھی کہ سیاسی نظم معاشرت سے علیحدہ چونکہ بنی نوع انسان دوسرے حیوانات
سے عقل کے عطیۂ وہبی کیوجہ سے ممتاز ہے اس لئے وہ قانون فطرت کی اطاعت
کرنے کا پابند رہا ہے اور ہمیشہ پابند رہے گا، اور خدا نے انسان کو جو عقل عطا فرمائی
ہے اس کے صحیح استعمال سے ہر شخص جان سکتا ہے کہ یہ قانون فطرت کیا ہے
وہ قانون فطرت جو بلا استثنا تمام انسانوں پر من حیث الانسان قابل اطلاق ہے
اور جو مختص انسانی معاشرتوں کے ایجابی قوانین کی بہ نسبت اپنے ماخذ اصلی
اور اپنی صحت کے لحاظ سے زیادہ بلند و برتر ہے، اس کا یہ تصور ازمنۂ وسطے
سے ازمنہ جدیدہ کے خیال کی طرف دست بدست منتقل ہوتا رہا ہے ازمنۂ وسطے
کے اصحاب فکر نے اسے رومانی اصول قانون سے اخذ کیا تھا، پہلے تو محض کلیسائی
روایات کے وسیلہ سے اور بعد کو سسرو اور قدیم رومانی شہنشاہی کے جلیل القدر
مقننوں کی تصانیف کے براہ راست مطالعہ سے انھوں نے واقفیت بہم
پہنچائی مگر اصلاح کے بعد جب وہ ناکمل مگر حقیقی انضباطی اثر درہم برہم ہوگیا
جو اصلاح کے قبل مذہب کیتھولک کو مغربی یورپ پر حاصل تھا تو پھر یہ ضرورت
عظیم محسوس ہوی کہ حقوق کے ایسے اصول منضبط ہونے چاہئیں جو کلیسائی
اقتدار سے آزاد ہوں اور جو عام طور پر قابل قبول بھی ہوں اور اس ضرورت
نے قانون فطرت کے تصورات میں زیادہ آب و تاب پیدا کی اور اس کے
ساتھ ہی معاشرۂ سیاسی سے قبل کی حالت فطرت کو بھی زیادہ
نمایاں منزلت عطا کی۔ جہاں تک بالغ اشخاص کا تعلق تھا اس قانون کے
زیادہ اہم قواعد سلبی تھے۔ اس کا خلاصہ یہ قاعدۂ کبری تھا کہ دوسروں کو کسی قسم کا
جسمانی ضرر پہنچانے سے مجتنب رہنا چاہئے اور متاع ارضی (جو ابتدا ءً سب
کے لئے عام تھیں) اسے دوسرے جس طرح استعمال کریں اس میں خلل انداز

نہ ہونا چاہیئے مگر ضرر رسانی سے مجتنب رہنے کے فرض سے یہ لازم آتا تھا، کہ اگر ضرر پہنچایا جائے تو اس کی تلافی بھی فرض ہونا چاہیئے۔ نیز یہ اہم ایجابی فرض موجود تھا کہ جو معاہدات آزادانہ طور پر منعقد ہوں ان کا ایفا کیا جائے والدین کو بچوں پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں انھیں بھی نہیں فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ اس کی سیاسی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ مطلق العنان بادشاہی کے بعض طرفداروں نے سترھویں صدی میں یہ سرفروشانہ کوشش کی کہ اس قسم کی بادشاہی کے لئے قانون فطرت کے مقبولہ خیال کے اندر کوئی بنیاد پیدا کرلیں اور وہ اس طرح کہ اس بادشاہی کو یہ قرار دیں کہ والدین کو اپنے بچوں پر جو فطری اقتدار حاصل ہے اس سے ترقی کرکے یہ بادشاہی قائم ہوئی ہے چنانچہ لاک کے بحث آرا دلائل میں یہ سب کچھ نظر آسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ سلطنت کے قدیمی انفرادی تخیل کے بموجب قانون فطرت ہی کے قواعد وہ قواعد تھے جن کا نافذ کرنا سلطنت کا اولین فرض تھا، مگر فطرت کی حالت میں افراد کو خود اپنے حقوق کی مدافعت کرنا اور اپنے نقصانات کا عوض لینا پڑتا تھا، اس لئے اس قسم کا عوض حاصل کرنے کے لئے خانگی لڑائی کو اگرچہ حالت فطرت کی معمولی کیفیت نہیں مگر ایک ناگزیر حادثہ تسلیم کرنا پڑتا تھا، جیسا کہ ہابس نے مسلمۂ عام کے خلاف دعویٰ کیا ہے۔

پس جب حالت فطری اور قانون فطری کی مقبولہ رائے یہ قرار پاگئی تو پھر فطری حقوق کے ان محولۂ بالا اصول پر حکومت کا اقتدار کیونکر مبنی کیا جاتا اس کا مقبولۂ عام جواب یہ تھا کہ دو طریقوں سے ایسا ہوسکتا تھا۔ یا تو اس کا ماخذ قوم اور محکوم کی رضامندی اولین پر قرار دیا جائے یا کسی یا ضابطہ جنگ کی فتح پر اس کی بنا رکھی جائے، کیونکہ یہ ظاہر تھا کہ جو فریق بد اشتداد تعدی کو دفع کررہے ہوں انھیں یہ فطری حق حاصل ہے کہ ان تعدی کرنے والوں کو مار ڈالیں، پس اس سے یہ بھی ظاہر تھا کہ جب انھیں قتل کردینے کی اجازت ہے تو انھیں یہ بھی اجازت ہونا چاہیئے کہ وہ قتل سے ہلکی سزا یعنی غلامی کی سزا دیدیں۔

۵ - یہاں تک لاک جائز حکومت کی ابتدا کے متعلق روایتی رائے کو قبول کرتا ہے، مگر اس نقطے پر پہنچکر وہ ایک اہم تغیر پیش کرتا ہے کیونکہ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اس نظریئے سے جس حد تک میں نے اسے اس وقت تک بیان کیا ہے نہایت ہی غیر محدود مطلق العنانی کے بجا ثابت کرنے کا کام لیا جاسکتا ہے جیساکہ عام طور پر دعویٰ کیا جاتا تھا اگر صرف اتنا ہی تسلیم کرلیا جائے کہ ہر شخص کو یہ فطری حق ہے کہ وہ اپنے کو غلامی میں دیدے تو بھی یہی نتیجہ نکل آتا ہے کیونکہ اس اصول کو تسلیم کرنے کے بعد کوئی قوم دو طرح سے غلام بنائی جاسکتی ہے، یعنی خواہ اس طرح سے کہ اس نے ابتداءً اپنی آزادانہ مرضی سے ایسا کیا ہو یا کہ ناواجب تعدی کے لئے اسے (غلام بناکر) واجب سزا دی گئی ہو اور فی الحقیقت گروٹیس نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "حقوق بین الاقوامی درجنگ وصلح" میں (جو ۱۶۲۵ء میں شایع ہوی) یہ دلیل پیش کی ہے کہ ان دونوں طریقوں میں سے کسی طریقہ سے بھی جائز طور پر دائمی مطلق العنانی قائم ہوسکتی ہے۔ دائمی اس وجہ سے کہ اس کے قول کے بموجب کسی قوم کی غلامی دائمی ہوتی ہے اس کے مختلف اجزا کا یکے بعد دیگرے شامل ہوتا رہنا اس قوم کے ایک ہی قوم رہنے میں مانع نہیں ہوتا[1]

اس موقع پر لاک کی رائے بہت ہی مختلف ہے۔ اس کی رائے کے موافق کسی شخص کو یہ حق نہیں حاصل ہے کہ وہ غلام ہونے پر رضامندی ظاہر کرے کیونکہ انسان کو خود اپنی زندگی پر بھی اختیار مطلق نہیں حاصل ہے، خودکشی قانون فطرت کی رو سے جائز نہیں ہے، اور اس لئے انسان معاہدہ کرکے اپنے کو کسی کا غلام نہیں بنا سکتا۔ نہ اپنے کو کسی کے اس اختیار

[1] - گروٹیس "قانون جنگ وامن" کتاب دوم باب پنجم فقرہ (۳۲) عام الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ فطری حقوق کے متعلق جدید خیال کا کام یہ تھا کہ رومانی مقننین نے جن اصول کا قانون شخصی قانون پر اطلاق کیا تھا انھیں اصول کا اطلاق قانون عامہ پر کیا جائے۔ گروٹیس کا مابہ الامتیاز کارنامہ زیادہ تر یہ ہے کہ اس نے اس کا اطلاق بین الاقوامی قانون پر کیا۔ لاک کی تصنیف کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے اسے آئینی قانون پر عاید کیا۔

مطلق کے تابع کرسکتا ہے کہ وہ جب چاہے اس کی جان لے لے[۱] نیز یہ بھی جائز نہیں ہو سکتا کہ اگلوں نے تعدی کی ہو تو پچھلے ہمیشہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے رہیں۔ در حقیقت فطری آزادی کی حالت کی نسبت یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسی شے ہے جس کا وجود محض کسی قدیم زمانے میں تھا، یہ ایک ایسی حالت ہے جس کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قبل اس کے کہ حکومت کو کسی شخص پر کوئی حق حاصل ہو سکے، اسے خود صراحتہً یا کنایتہً اپنی مرضی سے اس حالت سے ہو کر گزرنا ہے۔ جو شخص کسی ملک میں کوئی مِلک رکھتا ہو اور وہ عارضی باشندہ بھی جو ملک میں رہے اور اس کی زمین سے کام لے، انھیں کے متعلق یہ سمجھنا چاہیئے کہ جب تک وہ ملک کا مالک ہے یا زمین کو کام میں لاتا ہے، اس نے اس ملک کی حکومت کی اطاعت کرنے کی رضامندی دیدی ہے۔

جس معاہدے کی رو سے ملک کی حکومت ابتداءً قائم ہوی ہو، چونکہ اس کی کوئی بلاواسطہ شہادت موجود نہیں ہے کہ وہ معاہدہ کیا تھا اس لیئے ذہن میں اس کا تصور قائم کرتے وقت ہمیں یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ کوئی ایسا معاہدہ تھا کہ جو لوگ فطری آزادی و خود مختاری کی حالت میں رہتے تھے وہ عقلاً ایسا معاہدہ کرنے کے لیئے متحد ہو جائینگے، اور اگر ایسا ہی ہو تو جو حکومت نتیجۃً قائم ہوگی اسے خود رایانہ و غیر محدود اختیار نہیں حاصل ہو سکتا، کیونکہ یہ فرض نہیں کیا جاسکتا کہ لوگ زیادتی کی سزا دینے کے لیئے اپنی فطری آزادی اور اپنے فطری حق کو خیرباد کہدینگے بجز اس کے کہ اپنی جان، اپنی آزادی، اور اپنی جائداد کے لیئے جیسا استحکام وہ خود مہیا کرسکتے اس سے بہتر سامان کیا جائے تو البتہ وہ اپنی فطری آزادی سے دست بردار ہوں مختصر یہ کہ حکومت کا اختیار فطرتاً و عقلاً اس غرض و غایت سے محدود ہے جس کے لیئے وہ حکومت قائم کی جاتی ہے اور یہ غایت یہی ہے کہ حالت فطرت کے نقائص کا تدارک کیا جائے۔

یہ نقائص تین ہیں، انھیں لاک ہی کے الفاظ میں بیان کرتا ہوں، "(۱) اولاً ایک ایسے قائم شدہ، مقرر و معلوم قانون کی کمی جسے مرضئ عامہ نے قبول کرلیا ہو،

---

[۱] لاک "رسالۂ حکومت ملکی" کتاب دوم باب چہارم فقرہ ۲۳۔

اور یہ جائز رکھا ہو کہ وہی قانون حق و باطل کا معیار ہو اور ان کے درمیان جس قدر تنازعات و مناقشات برپا ہوں ان سب کے تصفیہ کا ذریعہ مشترک وہی ہو کیونکہ فطرت کا قانون اگرچہ تمام ذی عقل مخلوقات کے لئے واضح و قابل فہم ہے تاہم چونکہ لوگ اپنے مقصد کے لئے خودغرض ہوتے ہیں اور اس قانون کے مطالعہ نہ کرنے کی وجہ سے اس سے لاعلم بھی رہتے ہیں اس لئے ان میں یہ اہلیت نہیں رہتی کہ ان کے خاص واقعات پر اس قانون کا جو اطلاق ہو اس کی وہ پابندی کریں۔

ثانیاً۔ فطرت کی حالت میں کسی ایسے معلوم و بے غرض منصف کا فقدان ہوتا ہے، جسے یہ اقتدار حاصل ہو کہ وہ قائم شدہ قانون کے موافق تمام اختلافات کا تصفیہ کر سکے، کیونکہ اس حالت میں ہر شخص فطرت کے قانون کا فیصلہ کرنے والا اور اس کا نافذ کرنے والا دونوں ہوتا ہے اور چونکہ انسان خود اپنے طرفدار ہوتے ہیں اس لئے خود اپنے معاملہ میں جذبۂ ذاتی اور جوش انتقام انھیں بہت دور لے جا سکتا، اور ان میں زائد از ضرورت حرارت پیدا کر سکتا ہے، اس کے ساتھ دوسروں کے معاملات میں غفلت و بے توجہی انھیں ضرورت سے زیادہ لاپروا بنا سکتی ہے۔

ثالثاً۔ فطرت کی حالت میں اکثر اس قوت کی کمی ہوتی ہے، جو کسی صحیح سزا کی پشت پناہی و تائید کر سکے اور اسے مناسب طور پر عمل میں لا سکے، بہت کم ایسا ہوگا کہ جن لوگوں کو کسی ناانصافی سے صدمہ پہنچے گا جب انھیں موقع ملے گا تو وہ جبراً اس کی تلافی نہ کریں گے۔ پس جو لوگ سزا کو عمل میں لانا چاہتے ہیں بسا اوقات اس قسم کی مقاومت ان کے لئے سزا دہی کو خطرناک اور اکثر مہلک بنا دیتی ہے[1]۔

مختصر یہ کہ حالت فطری میں ان تین اعتبارات سے نقص ہے، (۱) قانون کی واضح تعریف، (۲) قانون کا بے لوث انطباق (۳) کامل موثر نفاذ۔ یہ نقائص بلاشبہ حالت فطری کی حالت کو غیر محفوظ و تکلیف دہ بنا دیتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہابس کے دعویٰ کے مطابق دائمی جنگ و مصیبت اس کا

---

[1] لاک بحسب بالا کتاب دوم باب نہم فقرہ ۱۲۴ - ۱۲۶۔

باعث نہیں ہیں) اور اس لئے یہ بالکل قرین عقل ہے کہ اگر حکومت ان نقائص کا کوئی انتظام کر سکے تو لوگ اپنے ان طبعی حقوق کی اس تجدید پر راضی ہو جائیں جو حکومت کے لئے درکار ہوں، مگر اس شرط کے سوا دیگر کسی بنا پر ان کا مطیع ہو جانا قرین قیاس نہیں ہوگا۔ اس لئے حکومت کے اقتدار کی نسبت یہ سمجھ لینا چاہئے کہ وہ اس شرط کے ساتھ محدود ہے کہ اس کا استعمال مسلمہ و معلومہ قوانین کے نفاذ میں ہوگا جنھیں بے لوث عادلوں نے نافذ کیا ہو۔ اور مزید شرط یہ بھی ہونا چاہئے کہ حکومت کے لئے یہ جائز نہ ہوگا کہ محکوم جب تک اصالتاً یا وکالتاً اپنی رضامندی نہ دے وہ اس کی ملک پر قبضہ کرے، کیونکہ ملک کی نسبت افراد کا حق حکومت سے یا دوسرے لوگوں کے ساتھ کسی قسم کے معاہدے سے حاصل نہیں ہوا ہے (اور لاک کے بیان میں یہ ایک اہم و طبعزاد بحث ہے) یہ استحقاق ہر شخص کے اس فطری حق سے ماخوذ ہے کہ جن مادی اشیا کے ساتھ اس نے اپنی محنت کو شامل کر دیا ہے وہ اس کی ہیں، بشرطیکہ اس طرح کسی شے کو اپنے لئے مخصوص کر لینے کے ساتھ دوسروں کے لئے بھی کافی و وافی بچ رہے ہے[1] متاع ارضی، جو فطری حالت میں ہے وہ طبعی حق کے اعتبار سے عام ہے، مگر اس حالت میں یہ بھی صاف عیاں ہے کہ انسان کی محنت خود اسی کی ہے، اور جب وہ اس موخر الذکر کو مقدم الذکر کے کسی جزو کے ساتھ شامل کر دیتا ہے تو از روئے استحقاق وہ شے اسی کی ہو جاتی ہے بشرطیکہ دوسروں کے مفاد میں کوئی خلل نہ پڑتا ہو۔ پس یہ استحقاق اس معاہدے سے آزاد اور اس سے مقدم ہے جس پر حکومت مبنی ہے۔ لہذا یہ فرض نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ذی فہم شخص اس حکومت کو جس کے قیام پر اس نے اتفاق کیا ہو، یہ حق دیدیتا ہے کہ وہ اس کی مرضی کے بغیر اس کی ملک پر قبضہ کرے۔ اگر حکومت ان شرائط کو پورا نہیں کرتی، اگر وہ نفاذ قانون کی ضرورت سے خود رایانہ تہدید سے کام لیتی ہے اور ایسے محصول لگاتی ہے

[1] حسب بالا، کتاب دوم باب پنجم فقرہ ۲۷۔

جس کی رضامندی نہ دی گئی ہو تو اس صورت میں وہ ان مقاصد کی خلاف ورزی کرتی ہے جن کے لیئے حکومت قائم کی گئی تھی، اور محکوم کو یہ حق حاصل ہوجاتا ہے کہ وہ اس معاہدے کو باطل قرار دیدے۔

دوسری طرف یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اگرچہ محکوم میں ابتداءً یہ حق ہوتا ہے کہ وہ جس قسم کی حکومت چاہیں اپنے لیئے پسند کرلیں مگر انھیں یہ حق نہیں ہوتا کہ جب وہ ایک مرتبہ ایک حکومت کو پسند کرلیں تو پھر جب تک کہ وہ اپنے مفوضہ شرائط کو پورا کرتی رہے اسے بدل دیں۔ لیکن جب کسی حکومت کا خاتمہ ہوجاتا ہے خواہ طبعی طور پر جیسے یہ کہ شاہی خاندان کا سلسلہ منقطع ہوجائے، خواہ اعتماد کی خلاف ورزی کرنے سے، دونوں صورتوں میں اعلیٰ تشریعی اختیارات قوم کی طرف عود کرجاتے ہیں کہ وہ اپنی خوشی اور مرضی سے جس طرح چاہے اسے قائم رکھے یا جسے چاہے عطا کرے۔ پس اس صورت میں قوم کی نسبت یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسے ناقابل انفکاک دوائی طور پر باطنی فرمانروائی حاصل ہے مگر صرف باطنی۔

ایک اور شرط کا نام لینا بھی ضروری ہے، قوم نے ابتداءً جس اعلیٰ حکومت کا تقرر کیا ہو اسے یہ حق نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اختیار کو دوسرے کی طرف منتقل کردے۔ اس قسم کے انتقال کو کسی قسم کا جواز حاصل نہ ہوگا۔ حکومت کا اعلیٰ طبقہ لازماً وہی طبقہ ہوتا ہے جو قانون بناتا ہے نہ کہ وہ گروہ جو قانون پر چلتا ہے۔ یعنی وہ حصۂ جماعت مقننہ ہے نہ کہ جماعت عاملہ؛ انگلستان میں اول الذکر بادشاہ اور دونوں ایوان پارلیمنٹ ہیں، اور ثانی الذکر بادشاہ بغیر ایوانوں کے ہے اس لئے اگر جماعت مقننہ ابتداءً جس طرح مقرر کی گئی تھی اس سے بدل جائے خواہ خود اس کی مرضی سے یہ تبدیلی واقع ہو یا کسی دوسری طرح سے، (دونوں حالتوں میں) اس کی اطاعت کا فرض ساقط ہوجاتا ہے۔ اور لاک یہ کہتا ہے کہ جب کوئی حکمران جو جماعت مقننہ کا صرف ایک جزو ہے مجلس کے وضع کردہ قوانین کو بدل دیتا یا اسے معلق کردیتا ہے اور ان کے بجائے اپنے خودرایانہ احکام کی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے تو جماعت مقننہ کی ہیئت میں تبدیلی ہوجاتی ہے۔

نیز نتیجہ کے اعتبار سے جماعت مقننہ اس وقت بھی بدل جاتی ہے جب حکمراں اسے مقررہ وقت پر جمع ہونے یا آزادانہ طور پر کام کرنے سے روکتا ہے۔ یا یہ کہ وہ قوم کی مرضی یا اس کے مشترک مفاد کے خلاف اپنے خودرایانہ اختیار سے انتخاب کنندگان یا طریق انتخاب میں تغیر کر دے۔ اور آخری امر یہ ہے کہ قوم کو کسی غیر ملکی طاقت کے زیر فرمان کر دے۔ جو حکمراں ایسے امور کا مرتکب ہوتا ہے، وہ اس دستور کو بدل دیتا ہے جس کی اطاعت پر اس کی قوم نے اتفاق کیا تھا، اور اس طرح اپنے اس حق کو زایل کر دیتا ہے کہ قوم اس کی اطاعت کرے اور وھگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ جیمز دوم نے یہی کیا یا ایسا ہی کرنا چاہا تھا۔

خطبۂ بست و پنجم

خیالات سیاسیہ۔ از لاک تا مانٹسکو

۱۔ میں نے اپنے آخری خطبے میں ہابس ولاک کی رایوں کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ ہابس نے عالم خیال آرائی میں اس تحریک کی نمایندگی کی ہے جو مغربی یورپ کو ازمنۂ وسطیٰ کے منقسم اقتدار اور نامکمل سیاسی نظم وارتباط سے زمانۂ جدید کی ان مملکت کی طرف لئے جارہی تھی جو شاہی بنیاد پر قائم ہوئی تھی۔ لاک کا اصول مسلمہ واقعات کی اس متشنیٰ رفتار کے ہم آہنگ ہے جس نے انگلستان میں مطلق العنان شاہی کے بجائے آئینی بادشاہی قائم کردی تھی۔ ہابس کی تحریر بغاوت عظمیٰ کے نازک زمانے کی ہے اور اس میں جائز حکومت کا ایک ایسا نظریہ مہیا کیا گیا ہے جو چارلس اور کرامویل دونوں کے لئے یکساں کارآمد ہوسکتا ہے مگر کسی قسم کی تقسیم اختیارات کا وہ منکر ہے۔ لاک کی کتاب ۱۶۸۸ء کے انقلابِ اعظم کے عین بعد ہی شایع ہوئی تھی اور اس میں وہ نظریہ دیا گیا ہے جس سے اس انقلاب کی تائید ہوتی تھی[۵۱]۔

اب ہمیں ان خیالات پر نظر ڈالنا چاہئے جو ان دونوں میں مشترک تھے۔ دونوں حالت فطرت کے تصور سے آغاز کرتے ہیں جس میں ہر بالغ شخص استحقاقاً آزاد تھا، قوت سے کام لیکر وہ جو چاہے کرے مگر ایک کو دوسرے پر حکمرانی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ کسی جائز حکومت کے طرز قیام کے لئے دونوں اس خیال پر متحد ہیں کہ یہ ایسی ہی لوگوں کے

[۵۱] یہ ضرور ہے کہ جس سیاسی عقیدے کو پیش نظر رکھکر انقلاب ہوا تھا، اس کے بجائے اس کتاب میں زیادہ تر وہ اصول مسلمہ درج کیا گیا ہے جسکی بنا پر دستوری نظریہ سازوں نے اس انقلاب کو بجا ٹھہرایا تھا۔

"ابتدائی معاہدے" سے ہوا ہے جو ابتداً آزاد تھے۔ میں اس میں یہ بھی اضافہ کرسکتا ہوں کہ دونوں اس امر کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ حکومتی اقتدار کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ فتح بھی ہے، اگرچہ ہابس کا دعوی یہ ہے کہ یہاں بھی فاتح و مفتوح کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہی ہوتا ہے، برخلاف ازیں لاک کا دعوی یہ ہے کہ جائز تسلط صرف منصفانہ جنگ ہی سے قائم ہو سکتا ہے اور وہ بھی صرف انھیں لوگوں پر جنھوں نے جنگ میں حصہ لیا ہو۔

آپ دیکھیں گے کہ اس تمام بحث میں سوال جو کچھ ہے وہ استحقاق کا سوال ہے۔ سوال یہ نہیں ہے کہ حکومت کیونکر وجود میں آئی بلکہ سوال یہ ہے کہ اسے جواز کیونکر حاصل ہوا۔ اس کی تشریح "معاہدے" ہی میں نظر آتی ہے۔ اب یہ خیال ہو سکتا ہے کہ حکومت کے حقوق اگر کسی قدیم معاہدے پر منحصر ہوں تو اس کے تعین کا مسئلہ مورخوں کا کام ہے، مگر ہابس اور لاک دونوں میں سے کوئی بھی واقعی تاریخی طرز استدلال سے کام نہیں لیتا بجز اس کے کہ اپنے نتائج کی تصدیق کے لئے وہ اسے ذیلی طریقے پر کام میں لاتے ہیں۔ ہابس تو درحقیقت اصولاً اس کی تکذیب کرتا ہے[1] اور لاک اگرچہ اس حد تک جانے کے لئے آمادہ نہیں ہے مگر عملاً وہ بھی ایسا ہی کرتا ہے، کیونکہ معاہدے کی خواہ کوئی صورت فرض کی جائے اس کا تعین وہ اسی طرح کرتا ہے کہ ان غایات پر غور کرنا چاہئے جو اس معاہدے کے موکد کرنے میں حالت فطرت کے معقول پسند اشخاص کو کیا خیال مدنظر ہو سکتا تھا۔

اس کے بعد دونوں اپنے مخالف یکدگر مسلمات کو ہر شکل کی حکومت پر عاید کرتے ہیں۔ ہابس کا مطلق العنان مقتدر اعلیٰ ایک ذات واحد یا متعدد اشخاص پر مشتمل ہو سکتا ہے، یا یہ بھی ممکن ہے کہ یہ اقتدار تمام قوم کو اجتماعاً حاصل ہو، لیکن اس کا میلان ملوکیت کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ اسی طرح لاک کا نظریہ بھی ہر شکل کی حکومت کو قابل قبول سمجھتا ہے، شرط صرف اتنی ہے کہ ان حکومتوں کا نفاذ اختیار اس کے شرایط کے موافق ہو۔ ابتدائی معاہدہ، عمومیت، عالیہ، شاہی یا کوئی مرکب صورت قائم کرسکتا ہے۔ جو طریقہ بھی پسند کرلیا جائے، اس کی اطاعت صرف اسی وقت تک واجب ہوگی جب تک کہ وہ اپنی شرائط

[1] دیکھئے "لیوایاتھن" باب ہستم کا آخری حصہ۔

اعتماد کو پورا کرتا رہے، لیکن جس طرح ہابس بادشاہی کو مرجح قرار دیتا ہے، اسی طرح لاک اس کے برعکس اُس حکومت کو قابلِ ترجیح سمجھتا ہے جس میں تشریعی اختیار، عاملانہ اختیار سے جدا ہو، اور تمام تر یا زیادہ تر ایسے متعدد و مختلف اشخاص کے ہاتھوں میں ہو جو ایک جماعت کی حیثیت سے قانون وضع کریں اور اس کے بعد بہ حیثیت افراد کے اس کی اطاعت کریں اور یہ صورت اس وجہ سے قابل ترجیح ہے کہ یہ قانون سازوں کو انسانی کمزوری کے اُس تقاضے سے بچاتی ہے جو قانون سازی کی اُس شکل میں اپنا کرشمہ دکھاتی ہے جب انھیں لوگوں کو جو قانون بناتے ہیں، یہ اختیار بھی ہوتا ہے کہ وہ ان قوانین کو جاری بھی کریں اور اس طرح اپنی ذات کو اپنے بنائے ہوئے قوانین کی اطاعت سے آزاد کرلیں اور قانون کو توضیع وتنقید دونوں پہلوؤں سے اپنے اغراض ذاتی کے مفید مطلب بنالیں[1]۔"

اور جب یہ تفریق عمل میں آجاتی ہے تو مجلس مقننہ کو فطرتاً و لازماً جماعت عاملانہ پر فوقیت حاصل ہوجاتی ہے کیونکہ جو گروہ قوانین کو عمل میں لاتا ہے اسے بالضرور اس گروہ کے تابع ہونا چاہئے جو قوانین وضع کرتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ انگلستان کی طرح جہاں کہیں حکومت عاملانہ کا سرگروہ اعلیٰ مجلس مقننہ کا شریک ہوتا ہے اور اس لئے قانون سازی کے لئے کوئی دوسری شخصیت اس سے بالاتر نہیں ہوتی تو ایک قابل قبول مفہوم میں اسے بالاتر یا مقتدر اعلیٰ کہہ سکتے ہیں اور روایتی طور پر تو اسے واقعی مقتدر اعلیٰ کہا ہی جاتا ہے، اگر یہ امر بدستور صحیح رہتا ہے کہ وہ حکومت کے حقیقی بالاتر یا مقتدر اعلیٰ حصے کا محض ایک جزو ہوتا ہے، اور اس کے لئے اطاعت شعاری و وفاداری کا جو حلف لیا جاتا ہے وہ بہ حیثیت اعلیٰ واضع قوانین کے نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ متفق ہوکر اس نے جو قانون بنایا ہے وہ اس کا عامل اعلیٰ ہے[2]۔ ہابس کی یہ دلیل کہ انگلستان میں کئی صدیوں سے صرف بادشاہ مقتدر اعلیٰ کہلاتا رہا ہے اسے لاک نے اس طرح رد کیا ہے کہ جہاں مجلسِ مقننہ جماعت عاملانہ سے ممیز ہے وہاں

---

[1] لاک حسب بالا باب دوازدہم فقرہ ۱۴۳۔

[2] لاک، باب ۱۳۔

اس مجلس کو فایق ہونا چاہئے اور انگلستان میں صدیوں سے بادشاہ مجلس مقننہ کا صرف ایک شریک کار رہتا آیا ہے۔

اس سے یہ استدلال کیا گیا کہ جب بادشاہ پارلیمنٹ کے مقررہ قوانین کو بدل دیتا یا معطل کر دیتا ہے یا قوم کی مرضی کے بغیر اور اس کے مشترکہ مفاد کے خلاف دار العوام کے انتخاب یا طرز انتخاب میں تغیر و تبدل کر دیتا ہے یا پارلیمنٹ کو اس کے وقت مقررہ پر منعقد ہونے یا آزادی کے ساتھ کام کرنے سے روک دیتا ہے تو ان سب صورتوں میں دراصل قایم شدہ جماعت مقننہ کو بدل دیتا ہے۔ اسی طرح جن قوانین کے عمل میں لانے کے لئے اس کا تقرر ہوتا ہے جب وہ جماعت عاملہ کے صدر خلیل کی حیثیت سے ان قوانین کے برعکس خود غرضی سے کام لینے لگتا ہے، یا جبکہ وہ نمایندوں کو رشوت دینے اور ان سے اپنے حسب مطلب کام لینے کے لئے قومی قوت ملکی خزانے اور سرکاری عہدوں سے کام لینے لگتا ہے تو وہ اپنے اعتماد کے خلاف عمل کرتا ہے، ان دونوں صورتوں میں رعایا کی اطاعت کا جو حق اسے حاصل ہے وہ سلب ہو جاتا ہے اور وہ جائز طور پر اس کے بجائے دوسرا بادشاہ مقرر کر سکتی ہے [1]

لیکن ہابس کی اس قوی ترین دلیل کا لاک اس طرح جواب دیتا ہے کہ اگر اس سیاسی معاہدے میں جس پر حکومت کی بنا ہو اس قسم کے شرائط داخل کر دے جائیں تو پھر طوائف الملوکی پیدا ہو جاتی ہے لاک نے اسے کسی حد تک تسلیم کیا ہے، طوائف الملوکی ضرور پیدا ہوتی ہے کیونکہ جو حکومت اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرتی ہو اس کی مقاومت کرنے کے متعلق محکوم کے حق کا تعلق باضابطہ تنظیم سیاسی سے نہیں ہے بلکہ اس سے مقاومت کے اُس حق کا اعادہ ہوتا ہے جس سے حالت فطری میں انسان کو اپنے نقصان رساں کے خلاف مقاومت کا حق تھا۔ لاک اسے پوری طرح تسلیم کرتا ہے، اور نہایت لطیف شاعرانہ زور کے ساتھ اس دلیل کو اپنے مخالفین ہی کے اوپر پلٹ دیتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہی تو وجہ ہے کہ اس حکومت کا جرم کس قدر سخت ہو جاتا ہے جو اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرے اور اس کی پاداش میں طوائف الملوکی کے مصائب نازل ہوں [2]

[1] حسب بالا باب نوزدہم۔
[2] حسب بالا باب نوزدہم۔

مگر ہمیں اس خطرے کے متعلق بہت مبالغہ آمیزی سے کام نہ لینا چاہئے۔ یہ آسان نہیں ہے کہ کوئی قوم انقلاب کے مشکلات وخطرات اور اس کے لابدی مصائب والآم کو برداشت کرنے کے لئے آمادہ ہوجائے۔ قائم شدہ حکومت جب اپنے اعتماد کی خلاف ورزی کرنے میں نہایت ہی شدت وابرام سے کام لے اسی وقت یہ ممکن ہے کہ قوم انقلاب پر آمادہ ہوجائے اور درحقیقت وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ عام طور پر یہ تسلیم کئے جانے سے کہ حکومت کا اعتماد خود رایانہ اختیار نہیں ہے بلکہ شرائط سے جکڑا ہوا ہے، بغاوت و طوائف الملوکی کا خطرہ بڑھنے کے بجائے درحقیقت گھٹ جاتا ہے کیونکہ اس سے ظلم وستم کا اندیشہ کم ہوجاتا ہے اور تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ نظریات کے سوچنے والے جوچاہیں کہیں مگر حقیقت میں ظلم وستم ہی سے انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

۲- جدید یورپ کے سیاسی خیالات کے ارتقا کا قدم بقدم پتا چلاتے ہوئے جب ہم سترھویں صدی سے گزر کر اٹھارھویں صدی میں پہنچتے ہیں تو اس کے آغاز میں طالبعلم کی خاص توجہ کا مرکز انگلستان ہوتا ہے مگر وسط صدی تک یہ مرکز فرانس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی فرانسیسی جو اس خیال کے اجزا کی جستجو کررہا ہو جس نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب عظیم تک نوبت پہنچائی تو اس کے لئے بھی سترھویں صدی کے کسی فرانسیسی مصنف کی بہ نسبت ہابس ولاک زیادہ اہم ہوں گے، اور اسی طرح جو انگریز جدید انگلستان کے حالات ماقبل میں خاص دلچسپی رکھتے ہوئے، سیاسی خیال کا مطالعہ کریں گے میرے خیال میں انھیں بھی اٹھارھویں صدی کے وسط میں اپنی خاص توجہ عارضی طور پر انگلستان سے فرانس کی طرف منعطف کرنا پڑیگی کیونکہ اس صدی کے آخری نصف حصے میں انگریزوں کے سیاسی خیالات میں سب سے زیادہ دلچسپ اجزاء کا پتا فرانسیسی خیالات ہی میں ملے گا۔ یہ اثرات یا تو اثباتی طرز کے تھے اور ان سے براہ راست جوش پیدا ہوتا تھا یا شدت مخالفت کی وجہ سے وہ بالواسطہ موجب اشتعال ہوتے تھے [۱]

اس صدی کے پہلے نصف حصے میں انگلستان میں خیالات کی رفتار کچھ سست

---

[۱] اس آخرالذکر صنف کی مثال میں برک کے تحریرات پیش کی جاسکتی ہیں جو اس زمانہ کے انگریز ارباب قلم میں سب سے بڑا تھا۔

ہی تھی، لیکن ایک غور کرنے والے طالبعلم کے لئے اس میں وہی دلچسپی ہے جو اکثر جمود کے اُس زمانے میں ہوتی ہے جو ذہنی قوت و حرکت کے زمانوں کے درمیان واقع ہوتا ہے اس میں یہ پتا چل سکتا ہے کہ خیالات کی قدیم شکل ہٹ رہی ہے اور اُن کے لئے نئی صورتیں پیدا کرنے کی کوشش کا آغاز ہو رہا ہے۔

حکومت کے چشمۂ اختیار اور اس کی تجدید کے متعلق اساسی معاہدہ معاشری کی نسبت لاک کا خیال وسعت کے ساتھ مقبول تھا مگر زیادہ تر اسے محض رسماً قبول کیا گیا تھا، اس پر اصولی اتفاق رائے نہیں تھا۔ اس پر جہاں تک خیال آرائی ہوئی اس کا عام رجحان ایک عملی سوال کو تاریخی مسئلے سے جدا کر دینے کی طرف تھا، سوال یہ تھا کہ اس عہد اور اس زمانے میں جو حکومت موجود ہے اس کے فرائض و اختیارات کا تعین کس طرح کیا جائے؟ تاریخی مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے اسلاف نے کن شرائط کے ساتھ حکومت کی اطاعت پر رضامندی تاریخی یا قبل تاریخی ظاہر کی تھی؟۔ یہ خیال روز بروز زیادہ راسخ ہوتا جاتا تھا کہ اول الذکر مسئلے کو موخر الذکر مسئلے کی تحقیقات کے نتیجہ پر مبنی نہ ہونا چاہئے، اور یہ خیال صرف انھیں لوگوں کا نہیں تھا جن میں انقلاب کا میلان پایا جاتا تھا کہ فرض کیا جائے کہ انگریزوں کے اسلاف سے یہ محال شدید سرزد ہوا ہو کہ وہ اپنی رضامندی کے بغیر اپنے اوپر محصول عائد ہونے دیتے اور اس طرح ان سے یہ نہایت نتیجہ خیز نوبت سرزد ہوتی کہ وہ اپنے اوپر محصول لگانے کی اجازت دیدیتے تھے تو کیا یہ کوئی دلیل اس امر کی ہو سکتی ہے کہ اگر ہم بر وقت ان کی ناقابل برداشت حماقت کے نتائج کو برداشت کرتے رہیں؟ (مثلاً کہتا ہوں کہ) فلسفہ اخلاق کے ایک فہمیدہ پروفیسر فرانسس ہچیسن نے (جنھوں نے گلاسکو میں سنہ ۱۷۳۰ء سے ۱۷۴۶ء تک درس دیا تھا) یہ جواب دیا ہے کہ "نہیں، ہم ایسے غیر معقول معاہدے کی پابندی سے آزاد ہیں اور ہم نظم سلطنت کے ایک نئے نمونے کے لئے اصرار کر سکتے ہیں"۔ ؎۱ اس شرط کے ساتھ لاک کے آراو خیال کے قدیم مسلمات کے بجائے مقبول ہو گئے تھے، مگر ان سے کسی کو گہری دلچسپی نہیں تھی، دوسری طرف بادشاہوں کے مسلمہ حقوق ربانی کا وعظ جو لاک کے دلائل کا ہدف بنا تھا، اگرچہ منبر ولایر سے جاری رہا مگر روز مرہ کی زندگی میں اس کا کوئی زبردست اثر باقی نہیں رہا تھا چنانچہ بولنگبروک نے اسے ایک دقیانوسی محال قرار دیا ہے جو اس قدر طفلانہ طرز کا ہے کہ اس کی

؎۱ ہچیسن، نظام فلسفۂ اخلاق (Sytem of Moral Philosophy) کتاب سوم باب پنجم فقرہ ۴۔

تردید کی بھی ضرورت نہیں، اور مسٹر لیزلی اسٹفن نے جس زمانے کو عہد والپول کا لقب دیا ہے اس کا خاص سیاسی صاحب فکر بھی بولنگبروک تھا۔

فلسفۂ سیاسی کی تاریخ میں بولنگبروک کو کسی جگہ کا سزاوار قرار دیا جانا ذرا دشوار ہے مگر سیاسی خیالات یا تصورات اور فلسفۂ سیاسیہ بالکل ایک ہی شے نہیں ہیں اور انگریزوں کے سیاسی تخیلات کی تاریخ میں اس سے روگردانی ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ نہ صرف والپول (۱۷۲۵–۱۷۴۱) کے پارلیمنٹی فریق مخالف کا (جو برابر بڑھتا جا رہا تھا)، "رہبرِ فلسفی و رفیق"[1] تھا اور اس کے تخیلات نے نہ صرف انگلستان کے اسوقت کے دستور پر قابلِ قدر روشنی ڈالی بلکہ اس کی سیاسی زندگی کے ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ خیالات زندہ رہے اور انگریزی سیاسیات کی روش پر ان کا بہت معقول اثر پڑا۔ ہم ان خیالات کے اثر کو ہیوم کے زیادہ باشکوہ اور واضح تر تصورات میں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے سیاسی فریقوں پر جو مقالہ لکھا ہے (Dissertation on Parties) اور جس میں اس نے والپول کے ساتھ اپنی مدت دراز کی مخالفت کا خلاصہ درج کیا ہے، اس میں وہ ابتدائی ہانووری بادشاہوں کے تحت میں انگلستان کے پارلیمنٹی فریقوں کی جو مخصوص حالت تھی اس کی طرف توجہ دلانے میں وہ ہیوم سے سبقت لے گیا ہے وھگ محض اپنی کامیابی ہی کے زور سے درباری فریق بن گئے تھے، اور اس کامیابی کی وجہ سے ٹوریوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں رہا تھا کہ وہ حکمراں بادشاہ کے فریق مخالف بنجائیں، اس طرح حالات گرد و پیش کی رو میں پڑ کر ہر فریق نے یہ دیکھا کہ وہ اپنے ابتدائی اصول ہی سے ٹکرا رہا ہے۔ فریق جب اس حالت میں آجاتے ہیں تو وہ محض گروہ بندی کی پستی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں بولنگبروک نے انھیں خوب ذہن نشین کیا ہے۔ غالباً ایک حد تک اسی اثر کے باعث سے یہ ہوا کہ آنے والی نسل میں سیاسی فریقوں کی طرف سے بہت ہی سخت بدظنی پیدا ہو گی، حالانکہ یہ امرِ واقعہ ہے کہ پارلیمنٹی حکومت کے لئے فریق ہی مسلمہ آلہ ہیں میں نہیں کہہ سکتا کہ اس سے قبل، جبکہ زوال والپول کے تقریباً تیس سال کے بعد، برک نے "موجودہ خلفشار پر خیال آرائی" (Thoughts on the present Discontent) کے نام سے ہنگامہ برپا کیا تھا

[1] یوپ، "انسان" (Essay on Man) قطعۂ چہارم

انگریزی ادب میں پارلیمنٹی فریقوں کے اتحادِ عمل کے متعلق کوئی زبردست مدافعت کی گئی تھی یا نہیں،

اب یہ سوال ہے کہ بولنگبروک کا سیاسی منتہائے خیال کیا تھا۔ یہ منتہائے خیال کچھ مبہم اور سطحی سا تھا، اور میں اس پر نظر صرف اس وجہ سے ڈالتا ہوں کہ مغربی یورپ کے ارتقائے سیاسیہ میں انگلستان کی دستوری تاریخ کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ آزادی کے تحفظ کی غرض سے۔ بولنگبروک یہ چاہتا تھا کہ "دستور مملکت میں توازن قائم رہے" اور اس مقصد کے لئے اس کی خواہش تھی کہ ایک حقیقی "ملکی فریق" بناکر (جس میں ٹوری اور دھگ گروہوں کے امتیازات مٹا دیئے جائیں) اس خرابی کا خاتمہ کر دے جس سے پارلیمنٹ کی آزادی خطرے میں پڑی ہوئی تھی لیکن ہیوم پر اس کے خالی الذہن اور دور رس تصور کی وجہ سے جوامر صاف عیاں ہوگیا بولنگبروک کی نظر اس حد تک نہیں پہنچی، وہ یہ کہ فی الحقیقت یہی خرابی یا کم از کم یہ کہ مناصب و وظائف کی وجہ سے ارکان (دار العوام) پر بادشاہ کا جو اثر پڑتا تھا، اسی کی وجہ سے اٹھارھویں صدی میں بادشاہ اور دار العوام کے درمیان توازن قائم تھا۔ یہ اثر اگر برباد ہوجاتا تو پھر جدید دستور مملکت کا لابدی میلان یہی ہوتا کہ اختیار بادشاہ کے ہاتھ سے نکل کر پارلیمنٹ کے مقرر کردہ وزراء کے ہاتھ میں آجائے چنانچہ مابعد کی تاریخ نے اسے ثابت کر دکھایا۔ بولنگبروک اسے نہیں دیکھتا، وہ اپنے "محبِ وطن بادشاہ کے خیال" (Idea of a Patriot King) کو شرح و بسط سے بیان کرتا ہے جس کا کام وہ یہ سمجھتا ہے کہ ایسا بادشاہ خرابیوں کو دور کر دے گا، اور صاحبِ تاج و تخت ہونے کے سوا کارفرمائی بھی وہی کرے گا، گروہ بندی کی مضرتوں کا خاتمہ کر دے گا اور اس کے ساتھ ہی نظامِ سلطنت کے توازن کو بھی قائم رکھے گا۔

یہ خیال حقیقتاً ناقابلِ عمل تھا مگر اس نے عملی اثرات پیدا کئے۔ جیسا کہ رسالۂ سہ ماہی "(کوارٹرلی ریویو) میں کسی نے لکھا ہے کہ "جس انقلاب عظیم نے قلم اور راچسٹر کے ٹوری اصول کو جانسن اور پٹ کے ٹوری اصول سے بدل دیا، اس کے پیدا کرنے میں اس تخیل نے کچھ کم مدد نہیں کی"[1] اس کے بجائے کہ بادشاہ اپنے حقوقِ ربانی کی بنا پر

[1] کوارٹرلی ریویو Quarterly Review جلد ۱۵۱، ۱۸۸۱ء صفحہ ۳۴۳

اطاعت کا خواستگار ہوتا، ان لوگوں نے ایک ایسے بادشاہ کو اپنا قبلۂ وفاداخلاص بنایا جو اس بنا پر اطاعت کا طالب تھا کہ وہ اپنی حب الوطنی کی وجہ سے فریقوں سے بالاتر ہے اور اس کی تمام تر توجہ ہمیشہ ملک کے اصلی مفاد کی طرف منعطف رہتی ہے، اور اسی بنا پر اس نے اس قسم کی اطاعت حاصل بھی کر لی تھی۔ جارج سوم نے اپنے ابتدائی عہد میں بلا شک وشبہ اس قسم کا تخیل قائم کیا تھا، اور اگرچہ خرابیوں کے رفع کرنے کا خیال بہت جلد ہوا ہو گیا جارج سوم اور پٹ اصغر نے ۱۷۸۳ء میں وھگوں کو جس تدبیر سے پامال کیا اس میں ایک جزو اس کا بھی تھا کہ انھوں نے اس مبہم مگر پرزور جذبے کی طرف رجوع کیا جو جارج سوم کے تخیل کی تائید میں ہنوز قوم کے اندر موجود تھا۔

میں بولنگبروک کے اثر کا پتا لگانے میں اس دور سے آگے نکل گیا جس میں وہ موجود تھا اور جس میں اس نے یہ تصنیف لکھی تھی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس دور کا خیال بہ حیثیت مجموعی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "شاندار انقلاب" کی معرکہ آرائی کے بعد اور شاید ان کے نتائج سے کسی قدر بددلی کے باعث ضعف وکلال کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس زور کے ساتھ جس مقصد کی تلاش تھی وہ حاصل ہو گیا تھا۔ قانون کی حکومت قائم ہو گئی تھی اور وضع قوانین واجرائے محاصل کے معاملے میں بادشاہ قطعی طور پر پارلیمنٹ کے زیر اقتدار آ گیا تھا۔ دستور سلطنت کا توازن معقول حد تک محفوظ ہو گیا تھا مگر اپنے جس متوازن دستور پر انگریزوں کو فخر تھا اس میں اس یقین سے کسی قدر کمی پیدا ہو گئی تھی کہ پارلیمنٹ درحقیقت عدیدی فرقہ بندیوں کا نشیمن ہے اور بادشاہ نے رشوت کے زور سے ان میں عارضی وناپائدار ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔

اس کے بعد ۱۷۴۸ء میں مونٹسکیو کی کتاب "روح القوانین" (Esprit des Lois) شایع ہوئی اور انگریزوں نے دفعۃً یہ دیکھا کہ ان کا دستور سلطنت نمونۂ کمال بن گیا ہے، اور تعلیم یافتہ یورپ کی قدردانی کے لئے منظر بلند پر رکھ دیا گیا ہے۔ گویا اس دستور کی ترکیب آزادی کے حصول کے لئے ان عمومی جمہوریتوں سے بڑھی ہوئی تھی جن کی شہرت قدیم زمانے سے قائم ہے۔ مونٹسکیو نے انگریزی دستور کا اس خوبی، جامعیت اور تحسین کے ساتھ جب تجزیہ کیا تو اس سے نہ صرف غیر ملکی مبصروں کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی بلکہ خود انگریز اس پر زیادہ فخر کرنے اور اس کے خصوصیات کو

ایک نئی نظر سے دیکھنے لگے ہیں[1]

۳۔ جب اس صدی کے عین وسط کے قریب انقلاب فرانس سے پہلے کے خیالات کی ترقی شروع ہوگئی تھی اس وقت ہم انگریز مصنفوں کو چھوڑ کر فرانسیسی مصنفوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو انگریزی اور فرانسیسی انقلابوں کے درمیانی زمانے میں نظریے اور واقعے کے تعلق میں جو فرق ہوگیا تھا، اسے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ ہابس اور لاک دونوں میں سے کسی نے بھی سیاسی واقعات پر عملی اثر نہیں ڈالا۔ بغاوت کے بعد جو رجعت قہقری ہوئی اس کی ہابس نے اپنی کتاب میں پیش بندی تو ضرور کر دی تھی مگر اس کے اثر کو اس رجعت کا باعث قرار دینا دشوار ہے۔ لاک کی تصنیف نے ایک ایسے انقلاب کو حق بجانب ثابت کیا جو ختم ہوچکا تھا۔ فرانسیسی مصنفوں نے ایک ایسے انقلاب کے لئے راستہ تیار کیا جو آیندہ پیش آنے والا تھا۔ سیاسی خیالات کی کوئی فرانسیسی تاریخ کھوئے اور میں اس کے لئے ژانے (Janet) کی تاریخ سیاسیات (Histoire de la Politique) کی سفارش کرسکتا ہوں، یہ کتاب اگرچہ شدید غلطیوں سے پاک نہیں ہے مگر پھر بھی ایک گراں بہا کتاب ہے۔ بہرحال اس کتاب کو کھولئے اور آپ یہ دیکھیں گے کہ مون ٹسکیو کی "روح القوانین" کو روسو کے "معاہدۂ معاشری" کے ساتھ یکجا کرکے یہ قرار دیدیا گیا ہے کہ یہی دونوں کتابیں انقلابی تحریک کا علمی منبع و ماخذ ہیں ژانے مون ٹسکیو کی کتاب کو بلاشک وشبہ اٹھارھویں صدی کی سب سے بڑی تصنیف خیال کرتا ہے

یہ صحیح ہے کہ جو انگریز مون ٹسکیو کی کتاب کو اب پڑھتا ہے اسے یہ سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے کہ جس تحریک کا منتہائے خیال ایک ایسے سیاسی نظم کا پیدا کرنا ہو جو فطری حق کے قدیم غیر متغیر اور ہمہ گیر اصول پر مبنی ہو، اس میں یہ کتاب کیا مدد دے سکتی ہے

[1] اس خیال کی جس مظاہر سے انگریز سب سے زیادہ مانوس ہیں وہ بلیکسٹن کے شروح (کتاب اول باب دوم) میں پایا جاتا ہے ان مشہور شرحوں کی پہلی جلد ۱۷۶۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ بلیکسٹن اپنے کام کے لحاظ سے کسی سیاسی نظریہ کی نہیں بلکہ انگلستان کے قوانین کی توضیح و تشریح کر رہا تھا مگر تعلیم یافتہ ناظرین کے مذاق کو پورا کرنے اور اس کے تشریحات کو جیسی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی وہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ قانونی جزئیات کا بیان سیاسی نظریات کے سانچے میں ڈھالا جائے اور اس کا مواد زیادہ تر مون ٹسکیو کی تصنیف سے لیا گیا تھا، البتہ اس زمانہ کے طرز کے موافق اس کا اعتراف نہیں کیا گیا تھا۔

کیونکہ انگریزوں کے نزدیک مون ٹسکیو کی جدت و دلچسپی زیادہ تر یہ ہے کہ وہ پہلا شخص ہے جس نے جدید اصول قانون وسیاسیات میں تاریخی طرز کی عظیم الشان باقاعدگی شامل کی اور انگریزوں کے خیال کے بموجب تاریخی طرز اور روسو کی استدلالی اشکل اور سیاسی ترکیب کے ساتھ اس کے مفروضہ ہمہ گیر اصول میں ایسا ہی بیر ہے جیسا آگ اور پانی میں۔ اس لئے مجھے اس میں تعجب نہیں کہ مین، مون ٹسکیو کے اثر کو روسو کے اثر کے مخالف اور اس میں توازن پیدا کرنے والا خیال کرتا ہے[1] میرے خیال میں یہ مغالطہ انگیز رائے ہے، اور ژانے کی رائے اس سے بہت زیادہ صحیح ہے، لیکن مجھے مین کی غلطی پر کوئی حیرت نہیں ہے کیونکہ درحقیقت مون ٹسکیو کا اساسی مسلمہ یہ ہے کہ قوانین اور اشکال حکومت کے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ مجرد و ہمہ گیر طرز پر نہیں ہو سکتا بلکہ صرف تاریخی اور تناسبی طرز پر ہو سکتا ہے۔ اس کا پہلا دعوی یہ ہے کہ خاص خاص قوانین و ادارات سیاسیہ کے اچھے یا برے قرار دینے کے متعلق یہ ضرور ہے کہ ان پر اس لحاظ سے غور کیا جائے کہ جس نظم معاشرے میں وہ قائم ہیں اس کی حکومت کی شکل کیا ہے، ہو سکتا ہے کہ قانون بادشاہی یا اعیانیت کے لئے کارآمد و مناسب ہو مگر عومیت کے لئے برا ہو اور اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ دوسرا دعوی اس کا یہ بھی تھا کہ ہم کو اشکال حکومت کی خوبی پر مجرداً خیال نہیں کرنا چاہئے بلکہ بنی نوع انسان کے جن مخصوص حصوں میں حکومت کی مختلف شکلیں، واقعاً قائم ہوں ان کی متغایر نوعیت و فطرت، عادات وخصائل، اور حالات گردوپیش سب کو پیش نظر رکھکر ان پر غور کرنا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق یہ سوال کہ اس میں عمومی حکومت ہونا چاہئے یا نہیں، اس کا جواب مون ٹسکیو کی رائے کے موافق ہم اسوقت تک نہیں دے سکتے جبتک کہ ہمیں اس قوم کی اندرونی و بیرونی کیفیت کا علم نہ ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی اخلاقی حالت اتنی کمزور ہو کہ وہ جمہوری ادارات کا بار نہ اٹھا سکے یا وہاں کی آب وہوا اتنی گرم ہو کہ وہ انجسام کار ہیں مطلق العنانی ہی کے غار میں جا گرے۔

حکومت کے ساتھ قوانین کے تعلق اور داخلی وخارجی حالات کے ساتھ حکومت کے تعلق باہمی کی نسبت ان دونوں خارجی مقالات کی توضیح وتشریح میں بہت ہی وسیع علمیت،

---

[1] قانون قدیم (Ancient Law) باب چہارم

نہایت ہی جدت و دقیق النظری اور اس سے بھی زیادہ تدبیر و تلمیح سے کام لیا گیا ہے، اور یہ سمجھنا آسان ہے کہ کیوں اس کتاب کو ایسی درخشاں علمی کامیابی حاصل ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کتاب انقلابی تحریک کا منبع کیسے ہوسکتی تھی۔ اس کی توجیہ یہ کی جاتی ہے کہ مون ٹسکیو کا تاریخی غیر جانبدارانہ جذبہ وسیع نہیں ہے، اور ایک قسم کی حکومت کو دوسری قسم کی حکومت پر ترجیح دینے میں اس نے اجتناب سے کام نہیں لیا ہے۔ اس نے اپنا کام یہ رکھا ہے کہ وہ یہ ظاہر کردے کہ جمہوریت، بادشاہی اور مطلق العنانی، حکومت کی جو یہ تین شکلیں ہیں (جنھیں وہ ان کی نوعیت فطری اور اصول کے لحاظ سے اساسی طور پر ایک دوسرے سے ممیز تسلیم کرتا ہے) وہ مختلف قوموں کی حالت کے لئے موزوں ہیں اور ان کے قائم رہنے کے لئے ہر ایک کے واسطے جدا جدا قوانین کی ضرورت ہے مگر اس بنا پر مون ٹسکیو، ان بتوں کے اصول کی بابت غیر جانبدار نہیں رہتا، بلکہ اس کے برعکس وہ ان اصول کو جس طرح پیش کرتا ہے اس میں ایسا تغیر پایا جاتا ہے جیسا روشنی شفق اور تاریکی کے درمیان ہے۔

جمہوریت کا اصول "سیاسی نکوکاری" ہے یعنی ذاتی اغراض کی کیسی ہی قربانی کیوں نہ کرنا پڑے لوگ خدمات عامہ کے انجام دینے پر کمربستہ رہیں، اور حب الوطنی و مفاد عام کا جوش ان میں موجود رہے، یہی وہ کمانی ہے جس کے بل پر یہ حکومت چلتی ہے اور جب حکومتِ جمہوری واقعی سرسبز رہتی ہے تو یہی کمانی اس کے موثر عمل کو قائم رکھتی ہے اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ وصف اعیانی جمہوریت کی بہ نسبت عمومی جمہوریت کے ساتھ زیادہ مختص ہے۔ ان میں سے اول الذکر ثانی الذکر کے جس قدر قریب پہنچتی جاتی ہے اسی قدر وہ زیادہ مکمل ہوتی جاتی ہے۔[1] اس وصف کی اس کیفیت کے ساتھ بادشاہی میں حاجت نہیں ہے، اور بادشاہی سے آپ کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس سے مراد مون ٹسکیو کے زمانے کی مغربی یورپ کی بادشاہی ہے جس کی سب سے زیادہ شاندار مثال فرانس میں پائی جاتی تھی جمہوریت میں جس سیاسی وصف کی ضرورت ہے اس کی حاجت بادشاہی میں نہیں ہے اور یہ خوش قسمتی ہے کیونکہ یہ یقینی ہے کہ بادشاہی اس قسم کے

[1] ۔ اعیانیت اور عمومیت کے فرق کو اس طرح محض ثانوی قرار دینا مون ٹسکیو کے خصوصیات میں سے ہے۔

وصف کی پرواخت نہیں کرتی اور اس لئے اگر اسے اس کی ضرورت پڑے تو وہ کسی بڑے پیمانے پر اس کا مطالبہ نہیں کر سکتی۔ بادشاہی جس بل بوتے پر کام کرتی ہے وہ "اعزاز کا جذبہ" ہے یعنی ان ذی امتیاز طبقات (خاص کر امرا اور قانون پیشہ اشخاص کے سرگروہوں) کا احساس عزت جو بادشاہ اور عام رعایا کے مابین درمیانی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسی اعزاز کا احساس بادشاہی کی قوت کا ذریعہ ہے کیونکہ جب تک بادشاہ ان لوگوں کے روایتی امتیازات و قواعد کا لحاظ رکھتا ہے اس وقت تک ذی امتیاز طبقات نہایت انہماک و تندہی کے ساتھ اطاعت پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی اگر بادشاہ ان امتیازات کو نظر انداز کر دینا چاہتا ہے تو یہ لوگ مقاومت کا بھی منبع بن جاتے ہیں جسے حسب دل خواہ گھٹانے بڑھانے پر انھیں قدرت ہوتی ہے۔ میں اسے حسب دل خواہ گھٹنے بڑھنے والی مقاومت اس وجہ سے کہتا ہوں کہ بادشاہ جس نقطے پر بھی جم جائے وہیں وہ اس مقاومت کو توڑ سکتا ہے مگر عملی حیثیت سے یہ ایک عملی روک ہے اور جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں مون ٹسکیو کی رائے میں یہ مغربی یورپ کی بادشاہی اور مشرقی مطلق العنانی کے درمیان ایک اساسی فرق ہے، کیونکہ مشرق میں سب یکساں غلام ہوتے ہیں اور حکومت جس قوت کے بھروسے پر کام کرتی ہے وہ محض خوف و ہراس کا جذبہ ہے۔

اب آپ دیکھتے ہیں کہ مون ٹسکیو کی تاریخی بے لوثی کہاں آکر ختم ہوی یہ صحیح ہے کہ وہ اہل ملک کے سامنے عملی نہتائے خیال کے طور پر عمومیت کی سفارش نہیں کرتا بلکہ اس کا عملی منشا زیادہ تر یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرانسیسی بادشاہی کے مطلق العنانی کے غار میں گر جانے کا جو خطرناک میلان پیدا ہو گیا تھا اس سے وہ بادشاہی کو بچائے، اور اس مقصد کے حصول کی توقع وہ اس طرح کرتا ہے کہ بادشاہ اور رعایا دونوں پر امرا کی عزت اور اہل قانون کے احساس جماعتی کے لحاظ کرنے پر زور دے کیونکہ اس سے دونوں فائدے حاصل ہو سکتے تھے۔ ایک طرف تو بادشاہ کو حکومت کے کام کے لئے اس سے بہتر آدمی ملتے تھے جیسے محض غلاموں میں سے میسر آسکتے تھے اور دوسری طرف بادشاہ کی اندھا دھند حرص و ہوس پر ایک طرح کی لوچدار مگر حقیقی روک قائم رکھتے تھے لیکن اگرچہ مون ٹسکیو نے عمومی جمہوریت کی سفارش نہیں کی ہے تاہم اس نے اپنے تاریخی معلومات کے ذخائر اور اپنی خوش بیانی کی تمام قوت کو اس کوشش میں صرف کر دیا ہے کہ حکومت کی اس شکل کی نسبت جس میں حب الوطنی اور جذبہ مفاد عامہ کی ضرورت اور پرداخت

دونوں ملی ہوی ہیں، اس کے لئے معقول دلائل قدر دانی کی اشاعت کرے۔ یہ خیال کہ "سیاسی نکوکاری"، میں جمہوریتیں سب سے مقدم ہیں بلکہ یوں کہئے کہ انھوں نے اس کا ٹھیکہ لے لیا ہے اسی کو فرانس کے انقلابی خیالات کا خاص تاریخی عنصر قرار دے سکتے ہیں، اور ممکن ہے کہ انقلابی جوش کی آگ کے بھڑکانے میں اس نے بھی اتنا ہی کام دیا ہے جتنا کہ فطری آزادی ومساوات اور قوم کے ناقابلِ انفکاک وناقابل تقسیم اقتدارِ اعلیٰ کے خیالات نے کیا تھا۔

۴۔ لیکن "۱۷۸۹ء کے خیالات"، میں مونٹسکیو نے صرف اتنا ہی اضافہ نہیں کیا ہے اور نہ یہی وہ شئے ہے جس نے مدت دراز کے بعد اس دستور سازی میں سب سے زیادہ اثر دکھایا ہو جس کی پہلی تحریک ۱۷۸۹ء کے انقلاب سے پیدا ہوی۔ مدت دراز کے بعد یونانی رومانی عالم کی عمومی جمہوریت نے جدید عمومی حکومت کیلئے نمونہ مہیا نہیں کیا بلکہ اُس نظام سلطنت نے یہ نمونہ مہیا کیا جسے مونٹسکیو نے قدر افزائی کے لئے سب سے الگ کر لیا تھا، یعنی یہ وہ انگریزی دستور تھا جو ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بموجب قرار پاگیا تھا۔

برطانوی دستور سیاسی کو مونٹسکیو نے جس طرح بیان کیا ہے اس کی اہمیت کا باعث یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ عمومی جمہوریتوں کا گرویدہ تھا پھر بھی اس نے صاف طور پر یہ دیکھ لیا کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ عمومی دستور ہی سب سے زیادہ آزادی لئے ہوئے ہو یعنی یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کی ترتیب اس طرح پر ہو کہ اس سے افراد کی معقول آزادی کو بیش از بیش تحفظ حاصل ہو سکے۔ درحقیقت وہ تاریخ کے مطالعے سے یہ جانتا تھا کہ افراد پر ناواجب سختی کرنے میں عمومی کثرت بھی ایسی ہی ظالمانہ ہو سکتی ہے جیسا کسی مطلق العنان بادشاہ کا ہونا ممکن ہے۔ دوسری جانب وہ یہ بھی معلوم کر لیتا ہے کہ ایک نادر ونمایاں حد تک انگریزی آئینی بادشاہی کے پیچیدہ انتظامات کا مقصود سیاسی آزادی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر ہم اس کا امتحان کریں تو ہم دیکھیں گے کہ" اس دستور میں آزادی ایسی ہی صاف نظر آرہی ہے جس طرح کہ آئینے میں چہرہ [1]

[1] روح القوانین (Esprit des Lois) کتاب یازدہم باب پنجم

مون ٹسکیو کی رائے میں وہ بنیادی اصول جو ایسی حکومت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے جو آزادی کے بروئے کار لانے کے لئے موزوں ہو، وہ یہ ہے کہ حکومت کے اساسی اختیارات کی تفریق کر دیجائے، اور انھیں متوازن طریقے پر مختلف شاخوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کا تقرر مختلف صورتوں سے عمل میں آئے خواہ وہ جماعات ہوں یا افراد تاکہ حکومت کی کسی شاخ میں اگر ظلم و زیادتی کا میلان پیدا ہو تو کل تنظیم کے فطری عمل سے دوسری شاخیں اس ظلم و زیادتی کو روک دیں۔ پس تشریعی اختیار کو عاملانہ اختیار سے جدا کرنے کی تائید میں وہ لاک کی پیروی کرتا ہے۔ جماعت مقننہ کو صرف عام قوانین بنانے کا اختیار ہونا چاہیئے، نظم و نسق کے کسی خاص کام کے حکم دینے کا اختیار اسے نہ ہونا چاہیئے یہ البتہ مفید ہو سکتا ہے کہ وہ انتقاد و نکتہ چینی سے حکامِ عاملانہ پر نگرانی رکھے۔ جماعت مقننہ کی ناواجب مداخلت کے روکنے کی غرض سے قوانین کے لئے حکومت عاملانہ کے سرگروہ کی منظوری ہونا چاہیئے مگر اسے خود قوانین بنانے کا مجاز نہ ہونا چاہیئے۔

مگر وہ اس سے اور آگے بڑھتا ہے اور ایک ایسے نکتے پر توجہ دلاتا ہے جدھر لاک کا خیال نہیں گیا تھا، وہ یہ کہ عدالتی اختیارات بھی ان دونوں سے علیحدہ ہونا چاہیں۔ اگر جج واضع قوانین بھی ہوگا تو اس صورت میں اس کا ہمہ تن صرف قائم شدہ قوانین کی تعبیر ہی کی طرف متوجہ رہنا مشکل ہوگا۔ اگر عاملانہ اور عدالتی اختیار ایک ہی شخص کے ہاتھ میں ہوں گے تو اس مجتمعہ اختیار سے علم افراد کے خلاف ظالمانہ کام لینے کا خطرہ بہت بڑھ جائے گا۔ علاوہ ازیں مون ٹسکیو یہ بھی کہتا ہے کہ مجرموں کو سزا دینے کا "خطرناک اختیار" کسی مستقل حاکم کے تفویض نہ ہونا چاہیئے جیسا کہ انگلستان میں ہے بلکہ یہ اختیار جوری کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے جن کا تقرر عام قوم سے وقتاً فوقتاً ہوتا رہے، اور وہ اس طمانیت و ضمانت پر بھی زور دیتا ہے جو انگلستان میں قانون "احضار ملزم" سے حاصل ہے جس کے ذریعے سے مقدمہ کے قبل حکام عاملانہ کا شہریوں کو قید کر دینے کا اختیار بہت سختی سے محدود ہو گیا ہے۔

انگلستان کی طرح توضیع قانون اور اجرائے محصول ایک ایسی جمعیت کو تفویض ہونا چاہیئے جس کا انتخاب آزاد شہریوں کی تمام جماعت سے ہوا ہو جنھیں مقامی حلقوں میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ لیکن اس کے بعد خود اس مجلس پر بھی امرا کی ایک جماعت کے

ذریعہ سے روک ہونا چاہئے تاکہ متمول و ممتاز لوگوں کی تعداد قلیل پر ظلم نہ ہو سکے۔

اس قسم کے دستور سلطنت سے جس میں باہمی انسدادی اختیارات کا متوازن نظم قائم ہو، یہ ہو سکتا ہے کہ ہم موثر طور پر سیاسی آزادی حاصل کر لیں، یعنی یہ کہ نہ تو کوئی شخص کسی ایسے فعل پر مجبور کیا جائے جسے قانونی طور پر کرنے کا وہ پابند نہیں ہے یا کسی ایسے فعل سے روکا جائے جس کا وہ از روئے قانون مجاز ہے[1]۔

حکومت کے ان تین اساسی اختیارات کی تفریق کا اصول انقلابی لائحۂ عمل کا ایک ممیز و اہم عنصر بن گیا تھا۔ چنانچہ نومبر ۱۷۸۹ء کے مشہور اعلان حقوق میں ہم دیکھتے ہیں کہ پر زور طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ "وہ ہر اس معاشرے کا جس میں تفریق اختیارات قطعی طور پر معین نہیں ہے درحقیقت کوئی دستور نہیں ہے"۔ دوسرے فقرے میں اس ضرورت پر زور دیا گیا ہے کہ عام شہریوں کو گرفتار کرنے اور انہیں قید کرنے کا جو اختیار حکام عاملانہ کے ہاتھ میں ہے اسے سختی کے ساتھ محدود ہونا چاہئے۔ یہ مونٹسکیو کے خیالات ہیں، اور "روح القوانین" کی اشاعت کی بعد والی صدی میں جو دساتیر مرتب ہوئے ان میں ان خیالات کی اہمیت کسی دوسرے عنصر سے کم نہیں ہے۔ مونٹسکیو کے ان خیالات کی تائید برطانی دستور کی مثال سے ہوتی تھی یا یوں کہئے کہ مانٹسکیو نے برتانی دستور کی جس طرح توضیح و تشریح کی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی تھی۔

تاہم خیالات کی اس تحریک میں جس کا لب لباب "اس اعلان حقوق" میں ہے، (جس کا اقتباس دیا جا چکا ہے) مونٹسکیو کا اثر روسو کے اثر کی بہ نسبت محض ثانوی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر آپ مختصر قراردادوں کی صورت میں روسو کے معاہدۂ معاشری کے بنیادی اصول دیکھنا چاہتے ہوں تو آپ کو صرف اتنا ہی کرنا ہے کہ آپ اس اعلان کے ابتدائی فقروں کو یکے بعد دیگرے پڑھ لیجئے۔

---

[1] "روح قوانین" Esprit des Lois کتاب یازدہم باب چہاردہم

خطبہ بست و ششم

خیالات سیاسیہ۔ روسو کا اثر

مونٹسکیو پر جس دوسرے نقطۂ خیال سے نظر ڈالنا چاہیئے، اس کی نسبت میں نے اپنے آخری خطبے میں توجہ دلائی ہے۔ ژانے اور مین نے اسے جن مختلف حیثیتوں میں پیش کیا ہے ان سے اس دو گونگی کے عجیب و غریب تضاد کا اظہار ہوتا ہے۔

ژانے نے جس باب سے مونٹسکیو کا ذکر شروع کیا ہے، وہاں اس نے اس سلسلۂ انقلابات کا ذکر کیا ہے جو ۱۷۸۹ء سے فرانس میں پیش آتے رہے ہیں اور یہ کہا ہے کہ "جب ہم اپنے خیالات کو ان کتابوں "روح قوانین"، "معاہدۂ معاشری" کی طرف پھیرتے ہیں جو ان تغیرات کا مبدا اول رہی ہیں تو پھر ہم ان انقلابات کو اپنے دلوں سے کیونکر بھلا سکتے ہیں"۔ غالباً فرانسیسی انقلاب کے اسباب اور اس کے نتائج کو ژانے نے اپنے اس فقرے میں سیاسی خیالات و ادب کے اثر کی طرف ضرورت سے زیادہ اور سیاسی واقعات کی طرف ضرورت سے کم منسوب کیا ہے۔ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایسا کیا ہے لیکن اگر ہم اپنے کو خیالات ہی کے اثر یعنی انقلابی تحریک کے اعلیٰ مبدا تک محدود رکھیں تو ایک ایسے مختصر بیان میں جس قدر صداقت ہو سکتی ہے، ژانے کا بیان اسی قدر صادق ہے اور رائج الوقت فرانسیسی رائے کا اس سے بالیقین اظہار ہوتا ہے۔ برخلاف ازیں مین اپنی تصنیف "قدیم قانون" کے چوتھے دلچسپ باب میں اس سے بالکل ہی مغایر اور بظاہر متضاد رائے کا اظہار کرتا ہے۔ مونٹسکیو اور روسو کو وقوع پذیری انقلاب کا معاون خیال کرنا تو کجا وہ انھیں اس کا قطعی مخالف تصور کرتا ہے۔ پہلے تو اس نے یہ بیان کیا ہے کہ

؎ تاریخ سیاسیہ (Hisloire de la Politique) جلد دوم کتاب چہارم باب پنجم۔

فرانسیسی تاریخ میں مقننوں نے کس قدر اہم حصہ لیا، قانون داں اشخاص کے شریک کار ہونے کی وجہ سے امرا اور کلیسا کے خلاف کشمکش میں فرانسیسی بادشاہوں کو کس قدر عظیم الشان فواید حاصل ہوسکے اور جاگیری طبقۂ اعیان کے پہلو بہ پہلو ایک ذی امتیاز طبقہ ہونے کی حیثیت سے اہل قانون کو (جو تمام فرانس کی بڑی بڑی نشو یافتہ بلدیات میں پھیلے ہوئے تھے) کس قدر اہم حیثیت حاصل تھی اس کے بعد آگے چلکر مین یہ دکھاتا ہے کہ ان اہالی قانون نے کیونکر اپنے تفکری آرا اور اپنے ذہنی میلان کو اپنے پیشے کے اغراض و مفاد اور اپنے ان عادات و خصائل سے تطبیق دی جسے میں "قانونِ فطرت" کی پرجوش پاکبازانہ محبت سے تعبیر کرنا چاہتا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ فی الواقع "یورپ کے تمام ممالک سے بڑھکر ایک بے ربط و بے ترتیب اصول قانون کا طوق لعنت "فرانس" کے گلے میں پڑگیا تھا"[1] مطلب یہ ہے کہ قوم کے سیاسی و معاشری اتحاد کے باوجود مقامی قوانین کے اختلاف والتباس نے اسے پریشان کر دیا تھا، اور اہلِ قانون کو "اصول قانون کے ان کمالات کا بہت کچھ احساس تھا جو سادگی و اتحاد سے پیدا ہوتے ہیں"، مگر یہ اہل قانون یہ بھی یقین رکھتے تھے یا ایسا ظاہر کرتے تھے کہ فرانسیسی قانون پر جو بلائیں واقعاً نازل ہو رہی ہیں وہ ناقابل استیصال ہیں اور عملی طور پر یہ لوگ ان خرابیوں کی اصلاح کی اکثر اسی شدت سے مخالفت کرتے تھے جس کا اظہار بہت سے نسبتاً کم تعلیم یافتہ اہالی ملک کی طرف سے نہیں ہوتا تھا۔ یہ لوگ قانون فطرت کے پرجوش مداح بن گئے تھے۔ فطرت کا قانون تمام صوبجاتی و بلدی حدود سے تجاوز کر گیا تھا، یہ قانون امیروں اور شہریوں اور کسانوں کے درمیان کسی فرق و امتیاز کو جائز نہیں رکھتا تھا، یہ قانون صفائی، سادگی اور نظم کو سب سے زیادہ بلند جگہ دیتا تھا مگر یہ اپنے پیروؤں کو کسی مخصوص ترقی کا پابند نہیں کرتا تھا اور خود براہ راست کسی مقدس یا نفع بخش اصلاح کی دھمکی بھی نہیں دیتا تھا[2]۔

یہ سمجھ لینا آسان ہے کہ اگر کسی وقت میں سیاسی تغیر کے لئے کوئی زوردار و وسیع مطالبہ اس قدر قوت پکڑے کہ قانون داں اصحاب کی خودغرضانہ تنگدلی پر غالب آجائے تو اس وقت میں قانون فطرت کی یہ پرجوش قدر دانی کیونکر انقلابی تحریک کی ممد ومعاون

---

[1] مین، قانونِ قدیم Ancient Law صفحہ ۸۰ (طبع سوم)

ہو جائیگی۔ پھر آگے چلکر مین یہ بیان کرتا ہے کہ روسو نے انقلابی جوش کے اس شعلہ کو کس طرح بھڑکایا، مگر مونٹسکیو کے خیالات کے متعلق وہ کہتا ہے کہ ان خیالات نے اس سے بالکل ہی مخالف جانب عمل کیا اگرچہ یہ عمل فی الجملہ بے اثر سا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ "مونٹسکیو اس تاریخی طرز استدلال پر کاربند ہوا جس کے سامنے قانون فطرت کو ایک لمحے کے لئے بھی کبھی قدم جمانے کا موقع نہیں ملا۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ مونٹسکیو انقلابی تحریک کو اس طرف بڑھنے سے روک نہ سکا کہ وہ انسان کے پیدائشی حق کو عملی صورت میں لا سکے۔ مین اس کی وجہ یہ قرار دیتا ہے کہ اس کی (مونٹسکیو کی) تصنیف کو وہ اتنا موقع نہیں ملا کہ وہ لوگوں کے خیالات پر اثر ڈال سکے"، کیونکہ جن مخالف اصول کی نسبت یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس تصنیف سے اس کا تباہ ہو جانا لازمی ہے وہ دفعتہً خلوت سے جلوت میں آگیا اور بزم خاص سے نکل کر کوچہ و برزن میں پھیل گیا"۔ اس کے اس جلوۂ عام و شیوع تام کا باعث روسو ہوا"۔ "یہ وہ عجیب و غریب شخص ہے جو علم سے معرا، اوصاف نیک سے بہرا اور مضبوطی اخلاق سے بیگانہ محض تھا، مگر با ایں ہمہ اس نے اپنے نمایاں تخیل کی قوت اور بنی نوع کے لئے اپنی سچی محبت کی مدد سے صفحۂ تاریخ پر اپنا ایسا نقش جما دیا ہے کہ اب وہ محو نہیں ہو سکتا، اس کے ان محاسن کی وجہ سے اس کے بہت سے معایب سے ہمیشہ درگزر ہوتی رہے گی"۔ [1]

اسناد کے اس تصادم میں مجھے اس میں شک نہیں ہے کہ طرفین کے بیانات میں صداقت موجود ہے۔ جیسا کہ ژانے نے کہا ہے "روح قوانین" نے بالیقین انقلابی تحریک میں مدد دی۔ اس کے ساتھ ہی اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ مین کے خیال کے مطابق مونٹسکیو کے تخیلات روسو کے اس اساسی مفروضہ کے حقیقتاً مخالف ہیں کہ "فطری حق" کے ایسے قواعد موجود ہیں جو ناقابل تغیر ہیں جن کا نفاذ بلا استثنیٰ ہر جگہ ہو سکتا ہے اور انسان کو حکومت کی جائز بنیاد صرف اسی حق فطرت میں مل سکتی ہے۔

ایک تخیل کی حیثیت سے قانون فطرت کی پاکیزہ الفت کو، ایسی مجسم

---

[1] مین "قانون قدیم" Ancient Law ص ۸۶ و ۸۷

صورت میں لانے کے عملی جوش سے بدل دینا، اور اہل قانون کو اس سے جتنا واسطہ تھا یعنی محض مدنی تعلقات سے بڑھا کر اسے سیاسی آئینی تعلقات تک وسیع کر دینا۔ یہ کام فرانس میں روسو اور اس کے متبعین نے انجام دیا۔ اس زمانہ کی انقلابی "بہشتہائے ارضی" کی بنیاد "قانون فطرت" کے انھیں مدتہائے دراز کے باوقعت مقبولۂ مسلمات پر قائم تھی کہ "تمام انسان فطرتاً آزاد ہیں" "اور تمام انسان فطرتاً مساوی ہیں"۔ اس وقت جو کچھ ہوا وہ صرف اتنا ہی تھا کہ اس کے متعلق اعتقاد کی ایک جدید و عجیب سرگرمی پیدا ہو گئی، اور نہایت ہی حیرت افزا طریق پر سیاسی انہدام و تغیر کے بجا ثابت کرنے کے لئے انھیں بطور مسلمات کے بالکل ہی نئے طریق پر استعمال کیا گیا۔

۲ - یہ ایک معمولی سی مشہور عام بات ہے کہ فرانس میں مطلق العنان بادشاہی نے انقلاب کا راستہ تیار کیا مگر محض بادشاہی کی مطلق العنانی ہی اس کا باعث نہیں ہوی بلکہ وہ طریق بھی اس کا باعث ہوا جس پر یہ مطلق العنانی جاگیریت سے ترقی کر کے پیدا ہوئی تھی۔ بادشاہی چونکہ اپنے اس ارادے پر جمی ہوئی تھی کہ تمام اختیارات کو اپنے ہی ہاتھ میں مجتمع کر لے، اس لئے اس نے یہ اصول اختیار کیا کہ پرانے جاگیری معاشرے میں جو عناصر اسے روکنے کی قابلیت رکھتے ہوں ان سے معاملت کر لے چنانچہ امرا کے سیاسی اور تمام اہم معاشری فرائض کو سلب کر کے اس نے انھیں زیادہ تر بے مصرف بنا دیا، اور اس سیاسی معدومیت پر ان کے خندہ پیشانی سے راضی ہو جانے کے لئے ان کے مالی امتیازات اس حد تک رہنے دئے کہ وہ اس قدر بار گراں ہو جائیں جن کا برداشت (ملک کے لئے) کرنا دشوار ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس غرض سے کہ وہ بادشاہ کی رقابت یا مخالفت کی روش کو زیادہ موثر طور پر اختیار نہ کر سکیں اور اس کے لئے جتنا اثر درکار ہے وہ اثر پیدا نہ کر سکیں، بادشاہ نے سربرآوردہ امرا کو ان معاشری فرائض سے جو بالطبع بڑے بڑے زمینداروں پر عائد ہو جاتے ہیں، اس طرح علحدہ کر دیا تھا کہ ان کا وسیع و شاندار دربار بنا لیا تھا جس پر بادشاہ کی نوازشوں کی بارش خزانہ کے چمکدار سکون کی صورت میں ہوتی رہتی تھی لیکن یہ زرپاشی اتنی فراواں نہیں ہوتی تھی کہ درباری شان و شوکت کے لئے جن اخراجات کی ضرورت ہوتی ہے وہ تمام اس سے مہیا ہو جائیں

سیاسی و انتظامی حیثیت سے لوئی چہار دہم کا طریق کار مختلف اعتبارات سے کامیاب رہا
اس کے عہد حکومت میں فرانس نے جو شان و شکوہ پیدا کی تھی، ورسائی کی طمطراق سے
اس کا اظہار بھی مناسب طور پر ہوتا تھا اور اس میں اضافہ بھی ہوتا تھا۔ امراء کو اس طمطراق
میں جو حصہ ملتا تھا اس سے وہ بہ حیثیت مجموعی پوری طرح قانع تھے اور اس مرکزی نظم و نسق
سے قوم کو عام طور پر بہت سے فوائد حاصل ہوگئے، کچھ تو خلاف قانون شخصی ظلم و ستم سے
امن حاصل ہوا، کچھ جدید قسم کے ضابطوں کی اشاعت ہوئی اور بھی اسی قسم کی باتیں عمل میں
آئیں مگر مالی اعتبار سے یہ نظم و نسق مہلک حد تک کمزور تھا اور اس مالی کمزوری نے شورانگیز
معاشری عدم مساوات و تباہی کو اور بھی مضبوط اور المضاعف کر دیا تھا اور یہ عدم
مساوات و تباہی بعض خصوص میں اس وجہ سے اور بھی زیادہ نظر آتی تھی کہ اس کی بنیاد
قدامت اور قانون پر تھی، اور رسم و رواج اور تاریخ نے اس کو گویا مقدس بنا دیا تھا۔

اب ہمیں چاہئے کہ تفصیلی طور پر ان دونوں لازم و ملزوم کیفیات کی جانچ کریں۔
وہ دونوں واقعات یہ ہیں کہ ایک تو حکومتی مالیات کا از سر تا پا مضر طریقہ تھا اور دوسرے
بے سرو پا معاشری عدم مساوات و ظلم و ستم تھے۔ ہمیں پیچھے ہٹ کر اس مہلک وقت کی
طرف جانا پڑے گا جب فرانس نے جاگیری حالت سے نکلکر جدید ترقی کی طرف قدم بڑھائے
اور انگلستان کی ہم مثل رفتار ترقی سے قطعی طور پر الگ ہوگیا۔ ۱۴۳۹ء میں چارلس ہفتم
نے اسٹیٹس جنرل کی مرضی کے بغیر محصول دائمی Taille perpetuelle عاید کر دیا
حالانکہ جاگیری نظام میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ مثل دوسرے جاگیری امرا کے بادشاہ
بھی اپنے معمولی اخراجات کا سامان اپنے علاقوں کی آمدنی سے کرتا تھا اور غیر معمولی اخراجات
کا انتظام منظور شدہ رقوم سے ہوتا تھا جس میں مختلف طبقات بالطبع بحصۂ مناسب
شریک ہوتے تھے، مگر جس وقت سے کہ چارلس ہفتم کے تحت میں وہ شرمناک معاملت
طے ہوئی جس کے بموجب امرا نے رئی اختیار کے نکل جانے کو روا رکھکر آئینی آزادی کو خیرباد
کہدیا، یعنی وہ اس امر کے روادار ہوگئے کہ قوم پر بغیر اس کی مرضی کے محصول لگایا جائے
صرف اتنا ہو کہ خود امرا اس محصول سے مستثنی رہیں[1] اس وقت سے وہ عدم مساوات

[1] توکول، حکومت قدیم و انقلاب Ancience Regime et la Revolution & کتاب دوم باب دہم صفحہ ۱۶۹

قایم ہوگئی جو سیولی، رشلیو اور کولبرٹ کے ایسے روشن خیال وزرا کی انتہائی کوششوں سے بھی مستقلاً کم نہ ہوسکی تھی۔ یہی محصول (جس سے جاگیری زمانہ میں امرا اپنے فوجی خدمات کی پابندی کے عوض میں مستثنیٰ تھے) اب باقاعدہ شاہی محصول ہوگیا۔

ٹوکوک نے ان تمام خرابیوں کو بیان کیا ہے جو اس طرح پر محصول لگانے سے پیدا ہوتی ہیں کہ "جن لوگوں میں محصول کے ادا کرنے کی سب سے زیادہ قابلیت ہو ان پر محصول نہ لگایا جائے بلکہ ان لوگوں پر محصول لگایا جائے جن میں اس کے مقاومت کی بہت ہی کم قدرت ہو"[1]۔ جیسا کہ میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں ان خرابیوں کے انسداد کی مسلسل کوششیں کی گئیں مگر حکومت کے لئے روپیہ کا ہونا ضروری تھا، اور جب نئے بلا واسطہ محصول جاری ہوئے جو برائے نام سب لوگوں پر مساوی طور پر عائد ہوتے تھے تب بھی یہ مضرت رساں طریقہ جاری رہا کہ دولتمند و طاقتور اشخاص کے حق میں انھیں گھٹا کر انھیں راضی رکھا جائے۔ پادری جواب منتظم ہوگئے تھے اور جنھوں نے اپنی مجلسیں قائم کرلی تھیں انھوں نے تو قطعی بریت حاصل کرلی، اور امرا نے اپنی خانگی حیثیت میں قدرے کم مرتب طور پر بریت حاصل کی۔ ماسوا اس کے شاہی بیگار (یعنی کم اجرت پر جبری مزدوری) جو ابتداءً سڑکوں کے لئے مخصوص تھی اور پھر بتدریج دوسرے شاہی کاموں کے لئے بھی وسیع کردیگئی، وہ بدستور قائم نہ رہی بلکہ حکومت کے ضروریات کی وجہ سے اس میں اور بھی توسیع ہوگئی، لیکن "امرا" اور ان کے رشتہ دار اس سے بھی مستثنیٰ رہے۔

انقلاب کے قبل جو نسل گزری ہے اس کے دوران میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ حکومت پدرانہ طریق پر کام کرنے کی یوماً فیوماً زیادہ کوشش کر رہی تھی مگر روپیہ کی کمی اور اس مضرت رساں طریق محصول کی وجہ سے ایسا کرنے سے معذور تھی[2] پس اس طرح ایک حاجتمند، مالی اعتبار سے تغیر پذیر، قانونی وغیر قانونی طور پر آزار دہ حکومت

---

[1] حسب بالا کتاب دوم باب دہم صفحہ ۱۷۱۔

[2] دیکھو ٹوکوک، حکومت قدیمہ کتاب ۲، باب ۱۰ جس میں اور بہت سے محاصل کا جو حکومت کی طرف سے نہایت شرمناک طور پر جاری ہوئے، ذکر کیا گیا ہے۔

ہماری نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور اس کے دوش بدوش ایک ایسا جاگیر دار طبقۂ امرا اور جاگیر دار طبقۂ قسیس بھی تھا جو قانونی یا غیر قانونی طور پر محصولوں سے مستثنیٰ تھا۔

مگر ان مستثنیات کے ساتھ ہمیں آزاردہ حقوق امتیازی کا بھی اضافہ کر لینا چاہئے فرانس میں جاگیریت کے زوال کی (جس کی وجہ سے وہ انقلاب کے لئے موزوں ترین ملک بن گیا) خصوصیت خاص یہ تھی کہ یہاں (جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں) اٹھارھویں صدی میں امرا حکومت میں شریک نہیں رہے تھے حالانکہ جاگیریت کا وصف خاص یہی ہے کہ وہ حکومت اور ملک ارضی کو درجہ بدرجہ ایک دوسرے میں مدغم کر دیتی ہے اس طرح ادھر تو امرا حکومت کے شریک نہ رہے اور ادھر محاصل و مستثنیات کا ایک پورا نظام قائم رہا جس کا ابتدائی تعلق ان امرا سے بہ حیثیت منتظمان ملکی کے تھا اور جس کے باعث ان محاصل و مستثنیات کو بجا قرار دیا جا سکتا تھا، مگر اب اس سے ان افراد کے منافع کے علاوہ ملک کو کوئی فائدہ نہ ہوا تھا، اور اب ان کی حیثیت ملک کے طبقۂ اولیٰ سے زیادہ نہ رہی تھی۔ امرا کے تمام مخصوص حقوق میں سے سیاسی حصہ مفقود ہو گیا تھا، صرف مالی حصہ باقی رہ گیا تھا اور اس میں بسا اوقات بہت اضافہ ہو جاتا تھا، [1] اس طرح جاگیریت ایک سیاسی تنظیم ہونے کے بجائے ایک خالص مدنی تنظیم بن کر پریشاں کن ہو گئی اور اس کا ان کسانوں پر خاص طور پر اثر پڑا جو صاحب جائداد ہو گئے تھے [2] غریب کسان صرف یہی نہیں دیکھتا تھا کہ امرا محصولوں سے مستثنیٰ تھے اور وہ خود محصولوں کے بار سے شکستہ ہا محنت کرنے اور فوجی خدمت انجام دینے کے لئے مجبور کیا جاتا تھا، بلکہ وہ اپنے کو اس امر پر بھی مجبور پاتا تھا کہ وہ انھیں امرا کو ان کی ذاتی حیثیت میں متعدد اقسام کے تکلیف دہ محصول ادا کرے۔ اگر کسان صاحب جائداد

---

[1] بحسب سابق کتاب دوم باب اول صفحہ ۶۰ و ۶۲۔

[2] کسان صاحب جائداد بہت کثیر تعداد میں تھے، اگرچہ امرا اور پادریوں میں سے ہر ایک کے پاس فرانس کی اراضی کا تقریباً پانچواں حصہ تھا انقلاب کے وقت موخر الذکر کی تمام جائدادوں کے اور مقدم الذکر کی جائدادوں کے ایک بڑے حصہ کے فروخت کر دینے کے باوجود بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ ان صاحب جائداد کسانوں کی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہو۔

نہ ہوتا تو اسے ان میں سے بہت سے محصولوں کا احساس نہ ہوتا۔ اگر یہی امرائے علاقہ اس پر حکمراں ہوتے تو یہ محصول وغیرہ اسے حکومت کے طبعی لوازم معلوم ہوتے مگر حالت یہ تھی کہ یہ محصول وقت ناوقت تکلیف پہنچا رہے تھے اور دوسری طرف رسم و رواج کی وجہ سے امرا پر اخراجات کا جو بار پڑ رہا تھا، اس کے باعث یہ دشوار ہو گیا تھا کہ وہ ان محصولوں کو ترک کر دیں۔ ان سب پر ہمیں انصاف و معدلت کے انتظام کے قدیم جاگیری حق کا بھی اضافہ کر لینا چاہئے۔ یہ حق اگرچہ بہت کچھ محدود ہو گیا تھا اور حالت زوال میں تھا پھر بھی اس خرابی میں حقیقی اہمیت باقی تھی اور حاجتمند امرا اکثر اسے مالی نفع کا ذریعہ بنا لیتے تھے۔ ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ متمول اور جلیل القدر اصحاب جائداد تو غیر حاضر رہا کرتے تھے اور چھوٹے چھوٹے صاحب جائداد غریب، سب سے الگ اور بے مصرف تھے، اس لئے بصورت دیگر ان کے حقوق اور بھی زیادہ آزاردہ ہو جاتے تھے

پس روسو جس آزادی و مساوات کا وعظ کہتا تھا اس کے جذبات کے نشو و نما کے لئے اس صورت حالات نے غیر معمولی طور پر موزوں و مناسب زمین مہیا کر دی تھی

۲۔ باخبر اشخاص عام طور پر روسو کی تصنیف پر جس طرح سے نظر کرتے ہیں اس کی دو حیثیتیں خاص ہیں اور ضرورت ہے کہ ان دونوں پر بحث کیجائے تاکہ اس کے جملہ غیر معمولی اثر پر بتمام و کمال احاطہ ہو سکے۔ ایک تو یہ کہ (۱) وہ نام نہاد "متمدن ہستی،، کے تصنع اور خفت عقل کے مقابلہ میں اسے "فطرت،، کا گویا پیامبر سمجھا جاتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ (۲) اسے قوم کے ناقابل انفکاک اقتدار اعلی کا ہادی و بشیر خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اصول مسلمہ، معاہدۂ معاشری کے قدیم اصول مسلمہ کو جدید و حیرت انگیز طور پر پیش کرنے سے قائم ہوا، مگر میرا خیال ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کے سمجھنے میں مین کو غلط فہمی ہوئی۔

وہ اس خیال کو روسو کی طرف منسوب کرتا ہے کہ "محض حالت کے بے امداد غور و فکر سے ایک کامل معاشری نظم ظہور پذیر ہو سکتا ہے"۔ فطری حالت سے مین کی مراد اس ابتدائی حالت سے ہے جو مدنی نظم معاشرت کے بننے سے قبل تھی اور اس میں شک نہیں کہ ہابس و لاک کا مقصود بھی یہی ہو گا۔ وہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ روسو کے خیال میں وہ نظم معاشرت میں ایسی تبدیلی جو اسے اس دنیا سے زیادہ مشابہ کر دے

جس پر محض "فطری انسان" حکمراں تھا وہ اس قابل اور سزاوار ہے کہ ظاہرا جو کچھ بھی اس کی قیمت دینا پڑے مگر اسے عمل میں لایا جائے"۔ ہر ایک قانون و ادارہ جو ان تصوری حالات کے تحت میں اس خیالی ہستی کے مطابق نہ ہو اس پر اس اعتبار سے لعنت بھیجنا چاہئے کہ وہ مکمل حالت سے ہٹ گیا ہے[1]۔

کتاب معاہدۂ معاشری میں روسو نے اپنے اس خیال کو ذرا زیادہ وسعت دی ہے، لیکن یہ غلطی (بشرطیکہ میں اس مغالطہ آمیز لفظ کا استعمال کر سکوں) "بہت ہی وطبعی"، اور بہت ہی مکمل غلطی ہے۔ یہ کہنا کہ روسو کی وہ رائے نہیں ہے جو میں اس کی جانب منسوب کرتا ہے، بالکل کمزور ہے، روسو کی اس قسم کی کوئی رائے ہی نہیں ہے۔

روسو کی تصنیف نے عوام کے دلوں پر اس وقت اپنا قبضہ جمایا ہے جبکہ (فرانسیسی تاریخ نویسوں کی تقریباً متفقہ رائے کے بموجب) وہ انتقادی و سالبی مسلک جس کا سرگروہ والٹیر تھا، تعلیم یافتہ دنیا کو بہت زوروں کے ساتھ زیر و زبر کر رہا تھا ایک پر شکوہ ولا ابالی اعیانی سوسائٹی کے پیدا کرنے میں، (جس کا مرکز دربار تھا)، اس سالبی مسلک نے ان سیاسی حالات سے گویا اتحاد عمل کیا اور ان کی معاونت کی جو بادشاہ کی بالارادہ حکمت علی کی بنا پر پیدا ہو گئے تھے۔

جس متمول و خوش خلق معاشرے سے بادشاہی نے تقریباً اس تمام مستقل و شریفانہ فرائض کو نکال لیا ہو جو سیاسی اختیارات کی ذمہ داریوں سے عمل میں آ سکتے ہیں یعنی جہاں اپنے بنی نوع کے لئے وسیع و اہم معاشری خدمات کی انجام دہی کا موقع باقی نہ رہا ہو، اس قسم کے معاشرے کے لئے ہنوز یہ امکان رہتا ہے کہ پر زور مذہبی اعتقادات کے ذریعہ سے (جنھیں پر فکر رائے اور بلیغ موضحین کی وقعت و امتیاز کی تائید حاصل ہو)، اسے محض لا ابالیانہ حالت میں پڑ جانے سے بچایا جائے، جیسا کہ سترھویں صدی کی بادشاہی کے جلیل القدر ایام میں ہو چکا تھا، مگر جب والٹیر کی فقید المثال علمی قابلیت نے اعلیٰ تعلیم یافتہ اشخاص کے دلوں سے کیتھولک قدامت پسندی کو ہوا کر دیا، جب دیوان خانوں اور مجمعہائے ضیافت کے خوش مقال اشخاص

---

[1] قدیم قانون، Ancient Law باب چہارم صفحہ ۸۸-۸۹۔

میں اس قسم کی باتیں ہونے لگیں، اور د بالفاظ بار گلے ،، د گویا وہریت قانوناً قائم ہوگئی اور مذہب کے ساتھ محض رواداراتہ برتاؤ کیا جانے لگا،، جب فلسفہ نے انگلستان سے حصول علم کی تحریک پاکر ڈیکارٹ کو چھوڑا اور لاک کو قبول کرلیا اور لاک کی تعلیم کو مابعد الطبیعیات میں مادیت وحسیت اور اخلاقیات میں عریاں حظ نفس کی جانب ترقی دی تو پھر عیش پرستی و تصنع کے راستہ میں جو کچھ رکاوٹ تھی وہ بالکل اٹھ گئی۔ عله
ٹین کہتا ہے کہ "جاگیری طبقۂ اعیان، دیوانخانہ کی بزم"، بنگیا یعنی وہ بزم عشرت میں بیحد وغایت محو ہوگیا، دوسرے اغراض وفرائض کو عیش وعشرت کے تابع کردیا، اور نہ صرف معاملات عامہ سے اس کے ہر طرح گھریلو مربیانہ تعلقات زایل ہوگئے بلکہ خانگی حب والفت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ البتہ ذہنی اغراض باقی رہے، ان بزمہائے عشرت نے نوع انسان کو تعلیم دینے میں ویدیرو، ڈالامبرٹ، اوران کے رفقا کی تیزی وہمدردی تحسین وتعریف کے ساتھ کی مگر سنجیدہ مسائل کے ساتھ انکی جو دلچسپی تھی وہ اس شرط کے ساتھ تھی کہ یہ سنجیدہ مسائل لطف اندوزی کا ایک ذریعہ اور مکالمات کی وسعت وگوناگونگی کا ایک وسیلہ بن جائیں۔ یہ ارباب بزم اگر کسی شے پر اعتقاد رکھتے تھے تو بنی نوع انسان کی ترقی، علوم وفنون کی ترقی اور بقول اہل جرمنی دو جملہ روشن خیالی،، پر اعتقاد رکھتے تھے مگر اعلی سوسائٹی کا کام صرف فقرہ بازیوں اور خوش گپیوں کے دوران میں اس ترقی کے مسئلہ پر بھی گفتگو کرلینے تک محدود تھا اور گراں خرچ شان وشوکت کے انتہائی تصنعات کے دوران میں قوم کی فاضل دولت ان مسائل پر گفتگو کرنے میں خرچ کیجاتی تھی۔
روسو نے تمدن کی مصنوعی زندگی پر فطری زندگی کی فوقیت کا وعظ کہکر جس معاشرے کو برانگیختہ کیا اور ایک نمایاں حد تک اس میں پرجوش تحریک پیدا کردی وہ اسی قسم کا معاشرہ تھا۔
جس پہلی تصنیف کی وجہ سے اس کی طرف نظریں اٹھیں وہ ایک انعامی مضمون تھا جسے نہ صرف ڈیژون کی اکاڈمی دمجلس علما، میں ۱۰ انعام حاصل ہوا

عله "ابتداء فرانس حالیہ،، یا حکومت قبل از انقلاب Oregmies De la France
کتاب ۲، باب ۱۔ Contaflorand & Ancien Regmis

بلکہ دار الصدر میں بھی اس کے لئے شور تحسین بھی بلند ہوا، سوال یہ تھا کہ آیا (از منۂ وسطی کے بعد) علوم و فنون کی بحالی سے عادات و اطوار میں پاکیزگی پیدا ہوئی ہے یا خرابی آگئی ہے مگر روسو تو کسی اور ہی ہوا میں اڑ رہا تھا اور اس نے خود کہا ہے کہ فن کے اوپر فطرت کی فوقیت کے نغمہ نے اس پر وجدانی کیفیت طاری کر دی تھی، پس اس کی نظر قدیم طرز معاشرت کی بحالی سے گزر کر علوم و فنون کے ابتدائی قیام تک پہنچی اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ بدوی سرشت، جس میں مسرت آمیز جہالت، ظاہر و باطن کی یکسانی اور سادہ خوبیاں موجود تھیں اسے ان اوصاف سے جو علم کے تبع میں آئے اور اس لاحاصل سامانِ عشرت سے جو فنون کی ترقی کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے نفع کے بجائے نقصان ہوا وہ اوصاف جو علم کے ساتھ ساتھ آئے، وہ شک و شبہ دغا و فریب، غرور و نخوت، شاندار ابلہ فریبی، اور لاحاصل تفکرات تھے۔ اس دعویٰ کی تائید مختلف طریقوں سے مسلسل مضامین کے ذریعہ سے کی گئی گو ان میں ہمیں کامل یکسانی رائے کے قائم کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے لیکن اس میں بھی شبہ نہیں کہ ان میں لب و لہجہ اور جذبات کا اتحاد نظر آتا ہے۔

میرے اس موجودہ کام کے حدود کے اندر یہ داخل نہیں ہے کہ میں روسو کی تصنیف کے اس پہلو پر کچھ اور زیادہ گفتگو کروں، مگر مختصر یہ ہے کہ وہ بلاشک و شبہ اس ”شریف النفس غیر متمدن انسان“ کا قدردان تھا جس کا وجود معاشرہ سیاسی کی تنظیم سے قبل ہوگا، اور یہ خیال کرنا ایک طبعی امر ہے کہ ”معاہدۂ معاشری“ میں اس کا مقصود یہی تھا کہ جہاں تک ممکن ہو فطرت کی اس حالت کی نقل کیجائے اور اس کا خیال یہ تھا کہ معاشری معاہدہ کے ذریعۂ سے یہ کام کامل طور پر ہو سکتا تھا مگر میں یہی کہتا ہوں کہ یہ بالکل غلطی تھی۔ یہ غلطی اس امر واقعی سے لاحق ہوی کہ لفظ ”فطری“ میں قدیم زمانے سے یہ خیال بہت استحکام سے خلط ملط ہو گیا تھا کہ ”ابتداءً کیا تھا“ اور ”کیا ہونا چاہیئے“، گو روسو کے سیاسی تخیلات سے یہی امر ایک بڑی حد تک ناپدید ہو گیا ہے لیکن اس کی تحریریں باقی رہ گیا ہے۔ سیاسی ترکیب و تنظیم میں روسو کا عملی مقصد یہ تھا کہ ایک ایسا دستور مرتب کیا جائے جس کے ذریعہ سے عدل و انصاف حاصل ہو سکے اور اس کا خیال ہے کہ عدل و انصاف صرف اس دستور میں حاصل ہو سکتا ہے

جس کی بنا ایسے حق پر ہو جسے وہ بھی دوسروں کے مانند "فطری حق"، کہتا تھا یعنی یہ وہ اصول تھا جس کی عظمت و دعاوی کو (بقول مین) انقلاب سے قبل کے مقننین بھی نہ صرف فرانس میں بلکہ عام طور پر تمام براعظم یورپ میں غیر مشروط تعریف و توصیف کے ساتھ قبول کرتے تھے۔

مگر "قانونِ فطری"، کا جو تصور مقننین کے ذہن میں تھا اس میں کبھی بھی زیادہ نمو و اہمیت اس مفہوم کو نہیں دی گئی تھی کہ اس کا اطلاق سیاسی معاشروں کی تکوین کے قبل انسان کی مفروضہ ابتدائی حالت کے قواعد پر ہوتا ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ سمجھا جاتا تھا کہ کسی خاص سیاسی معاشرے کے جو قوانین اس معاشرے کے ارکان پر عائد ہوتے ہیں ان کے مقابلہ میں جو قوانین انسان پر بحیثیت انسان ہمہ گیر طور پر عائد ہوتے ہیں اس سے مراد وہی قوانین ہیں اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کے ساتھ کسی خاص مملکت کے قوانین کی تغیر پذیر نوعیت کے مقابلے میں قانونِ فطرت کے دوام اور عدم تغیر کا وہ تصور بھی شامل کر دیا گیا تھا جو حیوان عاقل ہونے کی حیثیت سے انسان پر منطبق ہوتا تھا اور جو مجرد استدلال سے منکشف ہو سکتا تھا۔

یہ ایک معمولی سی بات تھی کہ سیاسی و معاشرتی تنظیم کو حق فطری کے ہمنوا ہونا چاہئے اور "قانونِ فطری"، سے مراد چند خارجی و ناقابل تغیر اصول سے ہے، چنانچہ اس پر مونٹسکیو تک نے علی الاعلان کوئی جرح و قدح نہیں کی ہے۔ "قانونِ فطری" کے اس تصور کو روسو نے قائم رکھا اور اس کے سیاسی مباحث میں اسے اساسی حیثیت حاصل ہے۔ میرے نزدیک اس حد تک مین بلا شک و شبہ غلط فہمی سے محفوظ ہے۔

مین سے غلطی اس فرض کرنے میں سرزد ہوئی ہے کہ روسو یہ سمجھتا ہے کہ "قانون فطری" کا مکمل حصول انسان کی ابتدائی حالت میں ہوتا ہے۔ ابتدائی حالت سے مقصود وہ حیثیت حالت ہے جسے اس نے اپنے "مکالمۂ عدم مساوات"[1] میں "حقیقی حالتِ فطرت"، کے الفاظ سے ظاہر کیا ہے۔ اس موقع پر روسو کے الفاظ صاف واضح و ناقابل اشتباہ ہیں، "ابتدائی انسان"، "حقیقی حالت فطرت"، میں "حق فطری"، کے بموجب زندگی

[1] Discours Sur l'origine de l'inegal parun les bounues

نہیں بسر کرتا، کیونکہ وہ نفس وحق،، کو ہرے سے سمجھ ہی نہیں سکتا بقول روسو،، میرے اور تیرے کا اسے ادنے تصور بھی نہیں ہوتا، انصاف کا کوئی واقعی خیال اس کے ذہن میں نہیں ہوتا، نیک و بد کا کوئی تخیل اسے نہیں ہوتا جب تک کہ ان اصطلاحات کو ان اوصاف کے مفہوم میں نہ استعمال کریں جو خود اس کے تحفظ کے باعث ہوں،، یہ بیان تقریباً ہابس کے بیان کے موافق ہے مگر روسو کا خیال یہ ہے کہ ہابس نے اس معاملہ میں غلطی کی ہے کہ اس نے ابتدائی انسان کی جانب ان جذبات کو منسوب کیا ہے جو منجر بہ تصادم ہوتے ہیں حالانکہ فطرت کی حالت میں یہ تصادم اس میں پایا ہی نہ جائیگا۔ روسو کا انسان نسبتاً زیادہ منفرد و خود کفیل مخلوق ہے، ،، اسے نہ اپنے ہمجنسوں کی ضرورت ہے اور نہ انھیں نقصان پہنچانے کی خواہش ہے،، اور اس لئے اگرچہ وہ ،، معقول طور پر ان تمام چیزوں پر اپنا حق سمجھتا ہے جن کی ضرورت ہوتی ہے، مگر اس کی اپنی حفاظت ذات کے اس حاوی جذبہ سے دوسروں کے لئے بہت ہی کم خطرہ تھا، علاوہ ازیں ہر شخص کی اپنی ذات میں بھی جذبۂ ترحم کی وجہ سے اعتدال پیدا ہو جاتا ہے، اور اس ابتدائی حالت میں یہی جذبہ ،، قوانین عادات و اطوار اور نکوکاری،، کا قائم مقام ہوتا ہے۔

پس اگر ابتدائی حالت فطری شاید خوشگوار ترین نہ بھی ہوتا ہم کم از کم اتنا تو ضرور تھا کہ عدم مساوات سے وہ سب سے زیادہ مبرا تھی مگر یہ یقینی ہے کہ ایسی حالت نہیں تھی جس میں ،، قانون فطرت،، کا حصول عملی ہو سکے، اور اگرچہ بعد کی حالت میں جو بہ حیثیت مجموعی سب سے زیادہ خوشگوار تھی ،، اور جس کا ذکر روسو نے آگے چلکر کیا ہے، اور جس میں ایک حد تک کیفیت معاشری کا آغاز ہو گیا تھا، اس حالت میں روسو نے جائے سکونت یعنی مٹی اور شاخوں کے جھونپڑوں میں ایک طرح کی ملکیت کو فرض کیا ہے، مگر اس نے یہ خیال رکھا ہے کہ اس ملکیت کے لحاظ کے متعلق وہ یہ ظاہر کر دے کہ اس ملکیت کی بنا حق تملیک کے احساس پر اس درجہ نہیں تھی جس درجہ اس احساس پر تھی کہ اپنے ہمسایہ کے جھونپڑے پر قبضہ کر لینے کی کوشش کرنا عاقبت اندیشی کے خلاف تھا۔ وہ کہتا ہے کہ چونکہ اسی نئی حالت میں، رشتہ داروں کی محبت صناعی و فنون لطیفہ اور رقص و سرود سے معاشری زندگی کی

ترقی ہو رہی تھی اس لئے لحاظ باہمی کی خواہش نے "نقصان" کا احساس بھی پیدا کر دیا، مگر "انصاف کے اولین قواعد" اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوئے جبتک کہ ملکیت تسلیم نہیں کر لی گئی اور ملکیت اس وقت تک عالم وجود میں نہیں آئی جب تک کہ فلزات و زراعت کے مہلک فنون نے وہ انقلاب عظیم نہ پیدا کر دیا جس نے اس دوسری یعنی خوشگوار ترین حالت کو (جبکہ خاندانوں میں خانگی و معاشری کیفیت تو پیدا ہو گئی تھی مگر وہ اپنی اپنی جگہ پر آزاد تھے) برباد کر دیا۔

پس یہ ہویدا ہے کہ ایک ایسا سیاسی نظم ترتیب دینے میں جس کی بنا "حق فطری" پر ہو روسو کو حقیقی حالت فطرت کی نقل کرنے تک کا خیال نہیں تھا چہ جائے کہ وہ اس کے کامل حصول عملی کا خیال قائم کرتا۔ وہ حالت تو ہمیشہ کے لئے جا چکی تھی اس کے نزدیک ہابس کے فرض کردہ انسان کے خلاف فطری انسان کو خود مختاری کا نفع حاصل تھا، اصلی حالت فطرت میں اسے نہ تو دوسروں کی ضرورت تھی اور نہ اس میں انھیں نقصان پہنچانے کا میلان تھا مگر موجودہ الوقت معاشرے کو اس طرح بدل دینے کی خواہش جس سے وہ تا حد امکان آزادی کی اس اصلی حالت سے مشابہ ہو جائے، روسو کے دل سے اتنی ہی بعید تھی جتنی کسی دوسرے شخص کے دل سے بعید ہو سکتی ہے۔ اس آزادی کو تو آدمی کھو چکا، اس کا بہترین قائم مقام مرضی عامہ پر انحصار کامل ہے اور اس مرضی عامہ میں خود اس کی مرضی محض ایک جزو حقیر ہے۔ درحقیقت میں کا یہ خیال کہ روسو کے نزدیک فطری کیفیت ہی پر غور و فکر سے کسی مکمل نظم معاشری کا اندازہ ہو سکتا ہے روسو کے واقعی خیال سے اس قدر بعید ہے کہ روسو نے صاف کہدیا ہے کہ کوئی معاشرہ مکمل ہو نہیں سکتا اور یہ صرف اس وجہ سے کہ فی نفسہ معاشرہ فطری نہیں۔ "وہ جو شئے فطرت میں نہیں ہے اس کے ساتھ دقتیں لگی ہوئی ہیں اور معاشرۂ مدنی تو اس خصوص میں سب سے بڑھا ہوا ہے"[ع]

یہ اگرچہ بہ ظاہر اجتماع ضدین معلوم ہو مگر میرا تو یہ خیال ہے کہ روسو فطری

ع۔ "معاہدۂ معاشری" کتاب ۳ باب ۱۵ ؎

معاشری انسان کے درمیان جس درجہ فرق قرار دیتا ہے اس کے اعتبار سے وہ تمام دوسرے مصنفین کی بہ نسبت ہابس سے زیادہ مماثلت رکھتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہابس اور روسو کے اختلافِ عظیم کے باوجود ان دونوں کے معاہدات معاشری میں ہم مماثلت پاتے ہیں۔ ہابس کی طرح روسو کا بھی یہی خیال تھا کہ انسان ابتدائی حالت میں بالکلیہ ایک دوسرے سے آزاد تھے، فرق صرف یہ ہے کہ روسو کے نزدیک انسان ایک دوسرے سے برسرِ جنگ نہیں تھے۔ انسان کو ایک دوسرے کی امداد کی ضرورت نہیں تھی تو انھیں ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی بھی ضرورت نہیں تھی مگر اس کا دعوی یہ ہے کہ رفتار تمدن کے نہایت ہی اولین مدارج میں اس خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا لیکن "جس ساعت سے کہ انسان کو ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہوئی یعنی جس وقت سے کہ ایک انسان کو اس میں اپنا نفع نظر آنے لگا کہ وہ دو شخصوں کے سامان ضروریات اپنے قبضہ میں کر لے اسی وقت سے قدیم حالت کی مساوات و خوشوقتی زائل ہو گئی اور انسان بہ عجیل تمام اس حالت جنگ میں منتزل ہونے لگا جس کا نقشہ ہابس نے کھینچا ہے۔ لیکن روسو کے نزدیک انسان کو اس حالت سے نکال کر پھر ابتدائی آزادی کی حالت میں پہنچانا ممکن نہیں اس کے نزدیک انسان کو غلامی سے بچانے کا صرف ایک ہی چارۂ کار ہے کہ ایک ایسا معاہدہ کیا جائے جو اسے بالکلیہ دوسروں پر منحصر کر دے، یہ انحصار اگرچہ متبادل و مساوی ہوتا ہے مگر پھر بھی مکمل ہوتا ہے۔ روسو کے سیاسی نظم میں انسان جس جماعت کا رکن ہوتا ہے اس کی مرضی کے مقابلہ میں اپنی مرضی سے وہ ویسی ہی مکمل و غیر مشروط طور پر دست بردار ہو جاتا ہے جیسا کہ ہابس کے نظم سیاسی میں ہوتا ہے مگر فرق اتنا ہے کہ روسو کے نظم میں معاہدہ کو شکست کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا ہے۔ تصور میں تو بہر نوع یہ فطری شخص فنا ہو جاتا ہے تاکہ وہ ایک مدنی شخص یا شہری کی حیثیت سے دوبارہ جنم لے سکے اور ایک مجموعہ شخصی کا رکن یا جزو بن سکے۔

۴۔ پس جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں خیال کی رفتار جو انجام کار انقلابی اصول پر ختم ہوئی، وہ محض اس عمل مسلسل کی آخری منزل ہے جو ہمیں تاریخ جدیدہ کے آغاز سے بہت پیچھے لیجاتی ہے۔ یہ ایک ایسی کوشش ہے جس سے مقصود یہ ہے کہ

حکومت کے ہیئت و اختیارات کا تعین انصافِ مجرد کے اصولوں پر کیا جائے اور یہ صاف عیاں ہے کہ ان اصولوں کے مبدا و ماخذ کا پتہ چلانے کے لئے ذرا پیچھے ہٹ کر اس قانونِ فطرت تک جانا چاہئے جس کا تصور اور جس کا نفاذ رومانی اہلِ قانون نے زمانۂ مابعد کے یونانی فلسفہ کے زیر اثر قائم کیا تھا۔ اس ارتقا کے عمل تسلسل کو میں اب مختصر طور پر بیان کروں گا۔ انقلابی اصول کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی بنا دو یا تین نہایت ہی سادے اصولوں پر ہے۔ وہ اصول یہ ہیں کہ (۱) انسان از روئے فطرت آزاد و مساوی ہیں، (۲) حکومت کے حقوق کی بنا کسی ایسے معاہدے پر ہے جس میں یہ مساوی و خود مختار اشخاص آزادانہ طور پر شریک ہوئے ہوں۔ (۳) ایسا معاہدہ جو افراد کے لئے منصفانہ اور معاشری اتحاد کے لئے کافی ہو، وہ وہی ہے جس میں ہر فرد اس جماعت کا ایک جزو لاینجزی ہو جاتا ہے جسے خود اندرونی دستور سیاسی و وضع قوانین کے شخص کرنے کا غیر منفک حق باقی رہتا ہے اور وہ مقتدر اعلیٰ جماعت قوم بن جاتی ہے۔ روسو نے آزادی کا جو منشور بنی نوع انسان کے نام جاری کیا اس کے تین مباحث ہی ہیں اور ان تینوں کے تاریخی آغاز و ابتدا کو ہم مختصراً اس طرح بیان کر سکتے ہیں۔ (۱) مبحث اول کا تعلق رومانی مقنین کے قانونِ فطرت سے ہے اور ان کے ذہن میں اس کا مقصود صرف مدنی تعلقات کا ایک اتم و اکمل ضابطہ تھا، یہ کام بعد کے ازمنہ وسطیٰ و زمانۂ جدیدہ کے اہلِ فکر کا تھا کہ انہوں نے اسے دستوری و بین الاقوامی تعلقات پر عائد کیا۔ (۲) دوسرا مبحث ایک نتیجہ کے طور پر اسی قانونِ فطرت سے تعلق رکھتا ہے بلکہ اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ معاشرۂ سیاسی سے قبل فطری حالت کے اندر یہی ایک قانون برقرار تھا اس مبحث کی نسبت بالعموم یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ جدید خیالات کا ثمر ہے معاہدے کے متعلق مختلف طریقوں سے خیال آرائی کی گئی ہے، اس کی تاویل ہابس کی طرح امن و امان اور مطلق العنانی کے مفید مطلب بھی کی جا سکتی ہے اور لاک کی طرح آزادی و دستوری حکومت کے حسب دلخواہ بھی اس کی تاویل ہو سکتی ہے۔ (۳) تیسرے مبحث کا تعلق روسو کی ذات سے ہے اور اس نے ہابس و لاک کی روشن ہائے خیال کو باہم ملا کر اپنا یہ

طبعزاد نتیجہ پیدا کر لیا ہے۔

روسو اس امر میں لاک سے متفق ہے کہ اساسی معاشری معاہدے کی غرض وغایت یہ ہونا چاہئے کہ جو لوگ اس میں شامل ہوں ان میں سے ہر ایک کی ذات و جائداد کے لئے بہتر تحفظ کا سامان ہو، لیکن یہیں سے دونوں میں فرق پیدا ہوتا ہے، لاک کا دعوی یہ ہے کہ اس سے لازماً حکومتی اقتدار پر تحدیدات عاید ہو جاتے ہیں، اور وہ بالتخصیص اس امر کو حکومت کے لئے خلاف قانون قرار دیتا ہے کہ وہ محکوم پر بغیر اس کی رضامندی کے محصول لگائے، برخلاف ازیں روسو کا دعوی یہ ہے کہ یہ نتیجہ جس معاہدے سے حاصل ہو سکتا ہے وہ صرف وہی معاہدہ ہے جس میں افراد اپنے تمام حقوق سے قوم کے حق میں کلیتہً دست بردار ہو جائیں اور معاشری اتحاد سے جو حاکمانہ مرضی پیدا ہوتی ہے اس کے سامنے اپنی مرضی کو بالکلیہ پست کر دیں ہابس اسی انتہائی حد تک پہنچا ہوا ہے، لیکن ایک طرف ہابس کا خیال یہ ہے کہ حاکمانہ مرضی اس حکومت کی مرضی کا ہی دوسرا نام ہے جس کی اطاعت کا افراد نے معاہدہ کیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ وہ کیسی حکومت ہے، ایک شخص کی حکومت ہے، چند افراد کی حکومت ہے یا کل قوم کی حکومت ہے، دوسری طرف روسو کا دعوی یہ ہے کہ یہ مرضی کل قوم کی مرضی ہونا چاہئے یعنی صحیح معنی میں مرضی عام ہونا چاہئے۔ معاشری اتحاد سے جو "کل" یا مجموعہ بنا ہے اصلاً و دائماً و لازماً وہی "صاحب اقتدار اعلی" ہے۔ حکومت کے جو مختلف اختیارات تشریعی و عاملانہ وغیرہ عام طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں وہ اقتدار اعلی کے اجزا نہیں ہیں بلکہ اس کی فروع ہیں اور صاحب اقتدار کو ہمیشہ اور غیر منفک طور پر تشریعی اختیار اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہئے۔ حکومت کی جو مختلف شکلیں بادشاہی، عدیدی وغیرہ کہلاتی ہیں وہ ازروئے قانون اس سے زیادہ نہیں ہو سکتیں کہ وہ حکومت عاملانہ کی شکلیں ہوں، اور ان کا کام یہ ہونا چاہئے کہ وہ ذی اقتدار اعلی قوم کی مرضی کو عمل میں لائیں حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی ایک خیال کسی ایک اصول کی نسبت یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فی نفسہ سنہ ۱۷۸۹ کے انقلاب عظیم کا ذہنی مبدا و ماخذ تھا تو وہ قوم کے دائمی و غیر منفک اقتدار اعلی کا ہی اصول تھا۔

چونکہ معاشری اتحاد کے شرائط سب کے لئے ایک ہی ہوں گے اس لئے

کوئی بھی اسے دوسروں کے لئے موجب تکلیف بنانا نہیں چاہے گا، لہذا لاک کے برخلاف روسو ارکان مجموعہ پر مجموعہ کی مطلق العنان طاقت پر کوئی روک نہیں قائم کرتا، اس میں صرف ایک استثنیٰ کرتا ہے اور یہ بہت ہی اہم روک ہے کہ عام مرضی کا اظہار ایسے عام قوانین میں ہونا چاہئے جو تمام شہریوں پر یکساں اثر کریں، اس مرضی عام کی تشریعی اہلیت پر سابق انفرادی حقوق کی بنا پر کوئی تحدید نہیں قائم ہوتی ملت کے حق میں افراد کی دست برداری حقوق غیر محدود و کامل ہوتی ہے مگر یہ اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اور تمام لوگ بھی اپنے حقوق سے دست بردار ہو جائیں، اس لئے صاحب اقتدار اعلیٰ مجموعہ کی مرضی صحیح معنی میں مرضی عام ہونی چاہئے۔ ؏۱

۵۔ اس رائے کے بالمقابل رائے کا پیش کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک خیال تو یہ ہے کہ صرف یہی ایسا اصول ہے جو منصفانہ حکومت کے قیام کے لئے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ یہ اطمینان ہو کہ قوانین تمام قوم کی عام مرضی سے بنائے جائیں گے اور ہر ایک فرد اس میں مساوی اجزا کے طور پر شامل ہو اور نیز یہ کہ اس عام مرضی کا اظہار ہمیشہ عام قوانین کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس کے بالمقابل رائے وہ ہے جس کا اثر ۱۷۸۹ء میں شاید ہی کچھ محسوس ہوتا ہو مگر اٹھارھویں صدی کے سیاسی خیالات کی تاریخ میں اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ بعد کو اس کا اثر بالواسطہ بہت زیادہ پڑا۔ اس سے میری مراد حامیان حکومت فطری یا "اقتصادیوں" سے ہے، یہی لوگ ایڈم اسمتھ کے دلیل راہ اور طبعی آزادی یا عدم مداخلت کے طریق کے واضع اول تھے، مجھے اس وقت پیداوار اور محصول کے متعلق ان کے

؏۱۔ یہ ملاحظہ ہو کہ اصول معاہدۂ معاشری کی اس آخری شکل میں معاہدے کے تاریخی واقعہ ہونے کے تمام سوالات لاطائل ہو گئے ہیں۔ معاہدے کو ایک خیالی تصور میں بدل دیا گیا ہے، اور دراصل ان تعلقات کو بیان کرتا ہے جو ایک صحیح النظم مملکت میں ہونا چاہئے یعنی ایک طرف تو وہ تعلقات ہیں جو افراد اور مجموعی قوم میں ہوتے ہیں اور دوسری طرف وہ تعلقات ہیں جو اس قوم اور اس کے اعضائے حکومت میں ہوتے ہیں۔ یہ خیال رکھنا چاہئے کہ اگر ہم ۱۶۸۸ء کے دو بنیادی اصول اور ۱۷۸۹ء کے بنیادی اصول کا با اختصار مقابلہ کرنا چاہیں تو اس کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہے کہ لاک کی "حکومت ملکی" Civil Government باب نہم دہم فقرہ ۱۲۹۵۔ اور روسو کے معاہدۂ معاشری کتاب اول باب ششم کا مطالعہ کریں۔

خاص نظریات سے کوئی سروکار نہیں ہے بلکہ فطری آزادی و عام بہبود کے حصول کے لئے جس سیاسی نظم کی ضرورت ہے محض اس کے متعلق ان کی رائے سے بحث ہے۔ اگرچہ فطری مساوات کی ہمنوائی کے ساتھ معاشرے کو از سر نو ترتیب دینے کی عام تحریک میں اس زمانہ کے فرانسیسی خیالات میں اس خیال کو بھی شرکت حاصل تھی تاہم یہ خیال روسو کے خیال سے عجیب وغریب طور پر مخالف ہے حالانکہ مقصود اس کا بھی یہی تھا کہ ایک ایسا معاشری نظم قائم کیا جائے جس سے افراد کے فطری حقوق بھی حاصل ہوں اور قوم کے لئے بیش از بیش مفاد بھی میسر آئے۔ روسو کے طریق کے لوگوں کا دعوی یہ تھا کہ قوم کے اقتدار اعلی کو قائم کر کے حکومت کی ہئیت و ترکیب کی بنیاد کو بدل دیا جائے، اس کے برخلاف اقتصادیوں کے خیال میں اہم نقطہ یہ تھا کہ اس سے بحث نہیں ہے کہ حکومت کی ترکیب کس طرح پر ہو بلکہ سوال یہ ہے کہ حکومت کو کرنا کیا چاہئے۔ روسو اور اس کے متبعین کے ذہن میں تو قانون سازی کی حدود وسعت کے محدود کرنے کی ضرورت کا خیال تک نہیں تھا، اس کے برخلاف حامیان حکومت فطری کا دعوی یہ تھا کہ حکومت کا فرض اولیں یہ ہے کہ وہ اپنے دماغ سے یہ خیال نکال ڈالے کہ قوانین کا بنانا بھی اس کا کام ہے۔ اس کا جو کچھ کام ہے وہ یہ کہ فطرت کے بتا دے، دائمی اور غیر متغیر قوانین کی تحقیق کرے اور انھیں مداخلت سے محفوظ رکھے، ہر شخص کی اس فطری آزادی کو محفوظ رکھے کہ جب تک کہ وہ دوسروں کو کوئی گزند نہ پہنچائے وہ خود جس طریق پر بہتر سمجھے کام کرے، یعنی حکومت ہر طرح کے صنعتی امتیازات، قیود و امتناعات کو منسوخ کر دے، اور ہر شخص کی محنت کے ثمر کی حفاظت کرے۔ ان کا خیال بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سادہ کام ایک مطلق العنان بادشاہ بہترین طریق پر انجام دے سکتا ہے۔ کم از کم اتنا ضرور تھا کہ وہ بیشتر اس امر پر رضامند تھے کہ مطلق العنان بادشاہی کو علی حالہا چھوڑ دیا جائے۔ درحقیقت وہ اس تقسیم اختیارات کے مخالف تھے جسے مونٹسکیو انگریزی دستور میں قابل مدح قرار دیتا تھا کیونکہ ان کے نزدیک اس سے حکومت کے کام میں پیچیدگی و کمزوری پیدا ہو جانے کا احتمال تھا۔ ع۱

ع۱ - فی الجملہ ایک ہی غایت المرام یعنی افراد کو ظلم و زیادتی سے محفوظ رکھنے کی سعی میں طرز عمل کا

مگر مطلق العنانی کے خلاف اس زور کا سیل رواں تھا کہ ۱۷۸۹ء کے قبل فرانس میں اس مسلک کے پیروں کا کچھ ایسا دائمی اثر پیدا نہیں ہو سکا حامیان حکومت فطری جن امور پر زور دیرہے تھے ان کا بیشتر حصہ مفید و ضروری تھا، مثلاً یہ کہ صنعتی کاموں پر سے قید و بندش کا اٹھا لینا، بیگار سے چھٹکارا دینا، اجاروں کا موقوف کر دینا اور اگر ان کا اجرا مناسب غور و فکر کے ساتھ ہوتا، مربیانہ حکومت کے طویل دور کی وجہ سے جو توقعات و عادات پیدا ہو گئے تھے ان پر کافی لحاظ کیا جاتا اور اس دور حکومت کے تعلق سے جن کاموں میں جائز طور پر سرمایہ لگا دیا گیا تھا ان کے مناسب معاوضہ کا خیال رکھا جاتا تو اس قسم کے اصلاحات سے فرانس کے زیر بار مالیات میں نظم و ترتیب کا پیدا ہو جانا ممکن تھا مگر اس طریق خیال کے سب سے زیادہ ممتاز رکن تیورگو نے اپنی صدر مستوفیت کے مختصر دور (۱۷۷۴ء-۱۷۷۶ء) میں جو کوشش کی اس میں ضروری احتیاط کی نمایاں کمی تھی، اس نے اپنے اصلاحات پر ایک متقشف کی سی بے رو رعایت سختی کے ساتھ زور دیا جس سے عام رائے اس سے برگشتہ ہو گئی اور پارلمان سے اس کا تصادم ہو گیا اور چونکہ شاہی اقتدار پر روایتی آئینی روک صرف اسی پارلمان ہی کی تھی اس لئے اسے آزادی کے ترقی پذیر احساس عامہ کی زبردست تائید حاصل تھی جب تیورگو کا زوال ہوا تو یہ عیاں ہو گیا کہ حقیقی تغیر کی طرف اس تحریک کی سر براہی طبیعئین کے ہاتھ سے نکل گئی ہے

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ یہ اساسی اختلاف ہمارے لئے اس وجہ سے اور بھی زیادہ دلچسپ ہو جاتا ہے کہ یہ اس وقت کے اصول جدت پسندی میں ہنوز باقی ہے۔ مدنی اور دستوری آزادی بہت ہی مختلف چیزیں ہیں، اول الذکر سے حکومت کو واسطہ نہیں ہوتا اور ثانی الذکر خود حکومت پر اقتدار پیدا کر لیتی ہے۔ انتخاب کنندوں کی جماعت کی کثرت کے عملی لحاظ سے یہ دونوں متحد ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ کثرت حکومت کو اس امر سے روک دیگی کہ وہ ناپسندیدہ طور پر ان کے کاموں میں مداخلت کرے مگر قلت کے لحاظ سے وہ دونوں متحد نہیں ہو سکتیں، مثلاً یہ کہ کوئی شخص جو یہ چاہتا ہو کہ وہ اتوار کو ایک شراب کا ایک جام پی لیا کرے اور ناٹک دیکھنے جایا کرے وہ اس ملک کی بہ نسبت جس میں ہمہ گیر حق رائے دہی رائج ہو اور جہاں کثرت آراء سے اس کام سے روک دے، خود کو اس مطلق العنان حکومت کے تحت میں زیادہ آزاد سمجھے گا جہاں

اور اب روسو کے زیر اثر قومی بہبود کی تلاش میں حکومت کے فرائض کے محدود کرنے کے بجائے حکومت کی ہیئت و ترکیب کو نئے سانچے میں ڈھالنے کا کام آئندہ کے انقلاب میں بے روک ٹوک جاری ہوجائے گا۔

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ - اسے ان لطف اندوزیوں کا موقع مل سکے -

خطبۂ بست و ہفتم

ارتقائے نظم سلطنتِ انگلشیہ از ۱۶۸۸ء

۱۔ مغربی یورپ کے نظم سیاسی میں آخری عظیم الشان تغیر پیدا کرنے یعنی اس طرز حکومت کے قائم کرنے میں جسے ہم دستوری بادشاہی کا لقب دیتے ہیں فرانس و انگلستان نے سب سے بڑھکر حصہ لیا مگر دونوں کے طریقے اصولاً ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہ وہی طرز حکومت ہے جو اس وقت روس کے سوا تقریباً تمام یورپ میں رائج ہے، فرانس اگرچہ بادی النظر میں اس سے مستثنیٰ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقتاً وہ بھی اس کے اندر داخل ہے۔ بے شک یہ صحیح ہے کہ فرانس کی حکومت جمہوری ہے، شاہی نہیں ہے لیکن یہ کہنا اگرچہ اجتماع ضدین ہے مگر ہے یہی کہ مغربی یورپ کی دستوری بادشاہیاں بھی معمولی مفہوم میں حقیقتاً ملوکی نہیں ہیں یعنی ان بادشاہیوں کے لئے دائمی موروثی بادشاہوں کا ہونا لازمی نہیں ہے۔ یہ تو میں نہیں کہتا کہ تمام صورتوں میں مگر بہت سی صورتوں میں، موروثی بادشاہ جن فرائض کو انجام دیتا ہے اگر وہ کسی رئیس جمہوریہ کی جانب منتقل کر دئے جائیں جس کا انتخاب چند معینہ برسوں کے لئے ہوا ہو، تو اس سے جو نتیجہ پیدا ہو گا وہ بالیقین اس قدر اساسی و اصولی نہ ہو گا کہ ہم اس کی نسبت یہ سمجھیں کہ یہ واقعی حکومت کی کوئی مختلف صورت ہے۔

آپ یہ ملحوظ رکھیں کہ مغربی یورپ کے نظم سیاسی کا یہی عام تغیر ہے جس کی میں تخصیص و توجیہ کرنا چاہتا ہوں نہ کہ اس خاص واقعۂ عجیبہ کی جسے ہم انقلاب فرانس کہتے ہیں۔ فرانس کے قبل از انقلاب خیالات کی تحریک کے متعلق مجھے خاص طور پر توجہ دلانا پڑی ہے مگر اس میں میں نے ہمیشہ یہ مد نظر رکھا ہے کہ اس کی وجہ سے

مغربی یورپ میں جو عام تغیر واقع ہوا اسے بیان کروں نہ کہ فرانس کے ایک خاص سلسلۂ واقعات کو لے بیٹھوں۔ اگر میری کوشش یہ ہوتی کہ انقلاب فرانس کے مخصوص واقعے کی تشریح کروں تو میں ان دوسرے اسباب کو نمایاں کرکے دکھاتا جن کے نظر انداز کردینے میں میں حق بجانب تھا کیونکہ وہ جو خرابی سب سے زیادہ صریحی، بے قیل وقال طور پر فرانسیسی انقلاب کے پیدا کرنے کا باعث ہوی وہ فرانسیسی حکومت کا دیوالیہ ہونا تھا۔ جو کہ واقع ہوگئی تھی اس سے تنہا عہدہ برا ہونے سے مایوس ہوکر ساہوکار نیکر نے یہ عزم کرلیا کہ اپنی تقویت کے لئے طبقات مجتمع کو طلب کرے،[عله] اور اگر ہم اس سے آگے بڑھیں، اوراس کے دیوالیہ ہونے کے اسباب کی تحقیق کریں تو ہمیں صرف اتنا حوالہ دیدینے پر قانع نہ ہونا چاہئے کہ مالیات کا "نظم" بیخ وبن سے ناقص تھا اور محصولوں میں عدم مساوات تھی (جس کا ذکر میں آخری خطبہ میں کرچکا ہوں)، کیونکہ یہ عدم مساوات اگرچہ ایک حد تک افلاس کا سبب ضروری تھی مگر یہی واحد سبب نہیں تھی۔ بقول سیلی، یہ افلاس جنگ کی وجہ سے پیدا ہوا تھا اور اگر ہم اپنی تحقیقات کو اور آگے بڑھائیں تو ہم اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اس کا سبب لوئی چہاردہم کی حرص وہوس تھی، یعنی یہ نتیجہ تھا ان یورپی جنگوں کا جنھیں لوئی نے بھڑکایا تھا، اوراس وقت کا جو اس کی حکمت عملی سے یورپ کے اندر فرانس کو حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے فرانس اس قابل نہ رہا تھا کہ وہ عدم مداخلت کی روش اختیار کرسکتا، اور یہی ایک روش تھی جس سے اس کا مالی بار ہلکا ہوسکتا تھا۔ مگر خیالات کے اس دلپذیر سلسلہ کو میں تاریخ فرانس کے مطالعہ کرنے والے کے لئے چھوڑتا ہوں ہمیں اس وقت جس امر سے غرض ہے وہ نظم سیاسی کا وہ عام طرز ہے جو یورپ کے سیاسی ارتقا کے مختلف مدارج میں رائج ہوتا رہا ہے اور نیز ان اسباب سے غرض ہے جن کی وجہ سے ایک مروجہ طرز دوسرے طرز کے قالب میں ڈھلتا رہا ہے اور اس نقطۂ نظر سے فرانس کے افلاس اور اس کے اسباب کی دلچسپی

عله یہ الفاظ پروفیسر سیلی کے ہیں جنھوں نے کیمبرج ہی میں ایک مرتبہ اپنے سلسلۂ خطبات میں پرزور طور پر اس کی تشریح کی تھی۔

گھٹ جاتی ہے۔

میں نے اس وقت اس کا ذکر اس وجہ سے کیا ہے کہ میں یہ چاہتا ہوں کہ اس خطبہ میں انگریزی تاریخ کے واقعات پر خاص توجہ کروں، اور میرے ایسا کرنے کی وجہ موجہ یہ ہے کہ جب ہم حکومت کے اس شغل کی توجیہ کی کوشش کرتے ہیں جو انیسویں صدی کے ربع ثالث کے آخر تک تقریباً تمام مغربی یورپ میں رائج ہوگئی تھی، تو اسکی توضیح و تشریح کے لئے فرانس کی صورت حالات کے بہ نسبت انگلستان کی صورتِ حالات بالیقین زیادہ واضح نظر آتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ انگلستان کی صورتِ حالات اس کا اہم ترین عنصر ہے، اگر میرا ایسا خیال ہوتا تو میں نے اٹھارھویں صدی کے سیاسی خیالات کے ارتقا پر توجہ کرنے کے لئے آپ پر اس قدر زور نہ دیا ہوتا۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ انقلابی خیالات وحسیات یعنی آزادی، مساوات اور قوم کے اقتدار اعلیٰ کی تحریک کا جو سیل فرانس سے اٹھ کر قرب وجوار کے ممالک میں پھیلا (جہاں لوئی چہاردہم کے شاندار زمانہ سے تمام تعلیم یافتہ طبقہ فرانسیسی ادبیات کا مطالعہ کرنے اور جدید خیالات، جدید علوم و فنون اور جدید طرز ماند و بود کے منبع و ماخذ کے طور پر فرانس ہی پر نظر ڈالنے کا عادی ہوگیا تھا) وہ سیل عام ارتقا کے سبب کے طور پر اپنی اہمیت میں حقیقتاً کسی سے دوسرے درجہ پر نہیں تھا، مگر اس کے ساتھ ہی اسباب و علل میں فرانس کا یہ حصہ نسبتاً زیادہ تاریک ہے اور اس کی مقدار کا قطعی یقین بھی زیادہ مشکل ہے۔ انگلستان کا حصہ نسبتاً زیادہ واضح اور زیادہ قطعی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان قرب جوار کے ممالک پر فرانسیسی خیالات کا کتنا ہی اثر کیوں نہ پڑا ہو مگر انھوں نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ فرانسیسی دل و دماغ کی تعمیری جدت طرازی سے جو خاص خاص دساتیر ظہور پذیر ہوے تھے (اور جن میں انقلابی تغیر کے سریع التکرار خطرات بھی شامل تھے)، ان میں سے کسی دستور کی نقل کرتے، ۱۷۹۱ء کا دستور ۱۷۹۳ء انقلابی و ۱۸۰۳ء انقلابی کے دساتیر اور پھر ۱۸۴۸ء، ۱۸۵۲ء اور ۱۸۷۵ء کے دساتیر، ان میں سے کسی دستور کی بھی کسی نے نقل نہ کی۔ انھوں نے جس دستور کی نقل کی وہ ملائم و لائح طور پر انگریزی دستور ہے، اور اسی کی نقل خود فرانس میں ۱۸۱۴ء و ۱۸۳۰ء میں کی گئی۔

۲- پس اب میں انگریزی دستور کی طرف پلٹتا ہوں، ابتداءً میں یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس دستور کی نقل کرنے والوں کو ہمیشہ یہ علم نہیں ہوا کہ یہ کیا تھا اور مختلف مدارج میں اس کی شکلیں کیسی مختلف رہی ہیں۔ انھوں نے تغیر کے اس سلسلۂ عمل پر پوری طرح قابو نہیں پایا جو ۱۶۸۸ء کے انقلاب اور انیسویں صدی کے دور تعمیر دساتیر کے مابین اس دستور میں جاری رہا ہے۔ یہ نامکمل استقصا بہت حال کے زمانہ تک قائم رہا اور اس وقت تک بعض بعض اطراف میں چلا جا رہا ہے۔ درحقیقت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس استقصائے ناقص کی دو شکلیں ہیں۔ بعض وقت تو انیسویں صدی کا دستور ناید از ضرورت اس دستور کے مشابہ کر دیا جاتا ہے جو حقیقتاً اٹھارھویں صدی میں موجود تھا، اور کبھی اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔

پہلے بیان کی توضیح کے طور پر میں اس طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں کہ بلنچلی نے اس موضوع پر جس طرح بحث کی ہے، اس پر نظر کرتے وقت ہمیں دل میں یہ خیال رکھنا چاہئے کہ بہ حیثیت مدبر کے بلنچلی نہایت وسیع المعلومات شخص ہے، اس کے مقاصد جدت پسندانہ ہیں، اگرچہ اس کی فکر غائر و عمیق نہیں ہے مگر سرسری و سطحی بھی نہیں ہے۔ اس کتاب میں آپ کو جدید جرمانی نقطۂ نظر سے ایک موثر بیان اس تحریک کا ملیگا جس کے وسیلے سے مغربی یورپ کی سلطنتوں میں آئینی بادشاہی، طرز رائج الوقت بنگئی ہے۔ بلنچلی کی رائے کے موافق بعض "نتائج" ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے حاصل ہوئے تھے، مطلق العنان بادشاہی متروک کر دی گئی، اور اس کے بجائے دستوری یا مشروط بادشاہی قائم ہو گئی، اور یہ ایسے اصول پر مبنی تھی جن کا سمجھنا (بقول بلنچلی) خاندان ہانوور کے بادشاہوں کے لئے مشکل ہو گیا مگر "حالات اس قدر قوی تھے، کہ وہ ان کے تسلیم کرنے سے انکار بھی نہیں کر سکتے تھے، اور خود ہمارے اس زمانے میں انگلستان میں "شاہی خاندان" بلا بیش و کم آئینی بن گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی "بادشاہی کے احترام و اختیار میں کسی طرح کا زوال ابھی نہیں آیا ہے"۔ (دو اختیار میں زوال، نہ آنے کے الفاظ پر نظر رکھنا چاہئے) [1]

---

[1] حسب بالا۔ صفحہ ۳۷۳-۳۷۴۔

اس کے بعد وہ مختصراً یہ بیان کرتا ہے کہ کیونکر ایک ایسا نظام سلطنت جو بیشتر انگریزی دستور کے مشابہ تھا انیسویں صدی میں، (باستثنائے فرانس) رومانی الاصل سلطنتوں (یعنی بلجیم، ہالینڈ) میں اور نیز اسکینڈینوی و ٹیوٹنی ممالک میں قائم ہوگیا۔ میں نے یہ الفاظ کہ "بیشتر انگریزی دستور کے مشابہ تھا" اس وجہ سے استعمال کئے ہیں کہ ہر جگہ اعلیٰ تشریعی اختیار، بادشاہ، مجلس نمائندگان اور مجلس سینات یا مجلس خاص کے قبضے میں ہیں اور عاملانہ اختیار بادشاہ اور ذمہ دار وزرا کے ہاتھوں میں ہیں۔

مگر یہ آخری فقرہ ہمیں اس نازک سوال کی طرف لیجاتا ہے کہ بادشاہ اور اس کے ذمہ دار وزرا کے درمیان اس عاملانہ اختیار کی تقسیم کیونکر ہے اور یہی وہ موقع ہے جہاں بلنچلی کو وہ غلط فہمی واقع ہوی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں، کیونکہ یہیں سے وہ دستوری بادشاہی کے متعلق "صحیح" و "غلط" خیالات کا باہم مقابلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوا ہے، اور یہ صاف عیاں ہے کہ اس مقابلہ میں "صحیح خیال" سے اس کی مراد کسی دوسری بادشاہی کی طرح انگریزی دستوری بادشاہی بھی مراد ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ یہ فرض کرنا وہ "آئینی بادشاہی" کے متعلق ایک غلط خیال ہے کہ اصلی اختیار بادشاہ کے ہاتھوں سے نکل کر وزرا کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے تو اس کا مقصود یہ ہے کہ کسی اور بادشاہی کی طرح انگریزی بادشاہی کے متعلق بھی یہ ایک غلط خیال ہے۔ جب وہ یہ کہتا ہے کہ دستوری بادشاہی کا اصول اس خیال سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا کہ "بادشاہ قومی نمایندگان یا اپنے وزرا کے ماتحت ہوگیا ہے، اور وہ لوگ اسے خود اس کی مرضی کے خلاف کسی رائے کے اظہار پر مجبور کر سکتے ہیں"[1] اور یہ کہ "وہ آئینی بادشاہی حکومت کے مرکز ثقل کو ایوان یا وزرا کی طرف منتقل نہیں کر دیتی"[1] نیز یہ کہ "وضع قانون میں بھی آئینی بادشاہ کی شرکت ہوتی ہے اور یہ شرکت علی العموم قانون کے نفسِ مطلب کے لحاظ سے قطعی ہے"[2]۔ اور یہ کہ "حکومت مکمل" یعنی مقررکردہ

[1] حسب بالا صفحہ ۴۰۵۔

[2] ایضاً صفحہ ۴۰۶۔

[3] ایضاً صفحہ ۴۰۸۔

قانون کے حدود کے اندر حکمرانی کا تمام فرض حقیقتاً نہ کہ رسماً و باوشاہ کے اندر مرکوز ہوتا ہے،،[1] تو بظاہر وہ یہی یقین کرتا ہے کہ یہ اقوال جس طرح براعظم کے دستوروں کے لئے درست ہیں اسی طرح انگریزی بادشاہی کے لئے بھی درست ہیں۔ درحقیقت اُن حدود کی وسعت سے واقف ہے جو شاہی اختیارات پر مختلف ممالک میں عائد کئے گئے ہیں اور وہ اسے تسلیم کرتا ہے کہ انگریزی دستور ،، شاہی حقوق پر اس سے بہت زیادہ قیود عائد کرتا ہے جن کا تحمل براعظم کے اکثر بادشاہوں سے ہو سکتا ہو،،[2] مگر وہ اسے محض حدود وسعت میں ایک فرق سمجھتا ہے، وہ یہ نہیں سمجھتا کہ یہ فرق اتنی دور تک پہنچا ہے کہ جن مسلمات کو اوپر بیان کیا گیا ہے وہ انگلستان کے لئے ناقابلِ اطلاق ہو جاتے ہیں۔

بہرحال بلنچلی نے جب اپنی کتاب ۱۸۵۲ء میں شایع کی (اور اس سے بڑھکر جب اس نے ۱۸۷۰ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن شایع کیا)، تو اس وقت اس نے ان بیانات کو انگریزی نظم سلطنت کے متعلق جس حد تک صحیح سمجھا اس کی نسبت میرا خیال ہے کہ کوئی معقول تعلیم یافتہ انگریز اس کے غلط ہونے میں شک نہ کرے گا۔ (بلنچلی کو میں نے درحقیقت اس مخصوص خیال کے نمائندے کے طور پر پیش کیا ہے جو جرمنی میں وسعت کے ساتھ پھیلا ہوا ہے) اور یقیناً اس کا مقصود (کلاً نہیں مگر) جزاً یہی تھا مگر ،، صحیح و غلط خیالات ،، کی نسبت جہاں اس نے گفتگو کی ہے وہاں اس نے امر واقعی کے مسئلہ کو کسی قدر اس مسئلہ سے کہ کیا ہونا چاہئے اور کسی قدر محض ایک سوال لفظی سے ملا دیا ہے اور چونکہ اس قسم کے مسائل پر بحث کرنے میں عام طور پر ان دونوں قسموں کے التباس واقع ہو جاتے ہیں اس لئے میں ان مباحث کو صاف کر دینے میں دو ایک منٹ صرف کر دوں گا۔

بلنچلی ایک دلیل یہ دیتا ہے کہ اگر حکومت کے رسمی سرگروہ کا اختیار اس حد تک گھٹا دیا جائے جس حد تک کہ ،، غلط خیالات ،، والے اسے گھٹانا چاہتے ہیں تو

---

[1] حسب بالا صفحہ ۴۰۸ ۔

[2] حسب بالا صفحہ ۴۰۷ ۔

پھر اس رسمی سرگروہ کو بادشاہ نہیں کہنا چاہئے لیکن یہ محض لفظی قیل وقال ہے، اہم حکومت کی اس شکل کو (بالفاظ سینسن) "تاجدار جمہوریت" کہتے ہیں، نام سے کچھ نہیں ہوتا، عملی سوال یہ ہے کہ آیا یہ صورت مفید ہے یا نہیں۔ لیکن اس کے بعد بھی اس میں شک نہیں رہتا کہ بلنچلی یہ حجت لانا چاہتا ہے کہ یہ مفید نہیں ہے، بلکہ اگر قانون کے مقرر کردہ حدود کے اندر اور وزرا کے اتحاد عمل کی ضرورت کی شرط کے ساتھ بادشاہ کو اپنی مرضی پر چلنے اور اپنے خیالات کو عمل میں لانے کا موقع دیا جائے تو ہمیں اس سے بہتر صورت حکومت کی حاصل ہوگی۔ یہ بھی وہی مسئلہ ہے کہ ہونا کیا چاہئے مگر اسے اس مسئلہ سے ملانا نہ چاہئے کہ واقعاً انگلستان یا کسی اور ملک میں صورت حال کیا ہے۔ اس کے ساتھ یہی خلط مبحث اس وقت بھی بہت ہی عام طور پر پیش آتا ہے جب ہم کسی دستور کے کسی ایسے مسئلے پر غور کرتے ہیں جس کا انحصار کلیتہً یا قطعاً قانون پر نہیں ہوتا بلکہ زیادہ تر رسم ورواج یا اس عام رائے پر منحصر ہوتا ہے کہ حکومت کے کسی رکن کو کیا کرنا چاہئے اور اگر وہ کوئی دوسری روش اختیار کرنا چاہئے تو اس کی باقاعدہ مخالفت کو کس قدر قبول عام حاصل ہوگا اور یہی صورت اس تقسیم اختیار کی ہے جو بادشاہ اور اس کے وزرا کے درمیان ہے۔

فی الحقیقت آئینی بادشاہی کی انگریزی وجرمانی انواع میں بہت وسیع فرق ہے مگر یہ فرق زیادہ تر قانونی فرق نہیں ہے، دونوں صورتوں میں یکساں طور پر یہ ضروری ہے کہ بادشاہ کے ہر ایک سرکاری فعل میں کسی ذمہ دار وزیر کی شرکت ہو اور اس کے ساتھ ہی جرمنی سے زیادہ انگلستان میں اس کی کوئی قانونی ضرورت نہیں ہے کہ وزیر اعظم ایوان نمائندگان کے فرقہ کثیر کا مسلمہ سرگروہ ہو۔ فرق صرف یہ ہے کہ اگر اس وقت (۱۸۹۹ء میں) ملکہ انگلستان، لارڈ سالسبری کو صرف اس بنا پر برطرف کردے کہ ملکہ کو اس کی حکمت عملی سے اتفاق نہیں ہے (جس طرح کہ شہنشاہ ولیم نے بسمارک کو برطرف کردیا) تو ملکہ کے اس فعل پر تقریباً ہمہ گیر ناپسندیدگی کا اظہار ہوگا جس کی عملی صورت یہ ہوگی کہ دار العوام کی بہت بڑی کثرت رائے سے رقوم کی منظوری سے انکار کردیا جائے گا اور اس لئے اس کا خاتمہ بہت عاجلانہ وقاطعانہ طور پر بادشاہ کی دولت واطاعت پر ہوگا۔ انگلستان میں بلا شک وشبہہ یہی ہوگا اور اس لئے انگلستان کی بابت

یہ کہنا لغو معلوم ہوتا ہے کہ جس وزیر اعظم کو دار العوام کی کثرت رائے کا اعتماد حاصل ہو اسے برطرف کر دینے کا یہ عملی عدم امکان دستوری بادشاہی فرائض کی بابت کسی "غلط خیال" پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہے تو اس کی نسبت صاف طور پر یہ سمجھا جائیگا کہ وہ ان سہولتوں اور امیدوں کی نسبت خیال ظاہر کر رہا ہے جو ہونا چاہئیں یا نہ کہ وہ ان امور کو واقعاً رائج سمجھتا ہے۔

لیکن اگر صورتِ معاملات اس کے برعکس ہو (جیسی کہ بلاشک و شبہہ بلنچلی کی تحریر کے وقت جرمنی میں تھی)، اگر اس معاملہ میں رائے منقسم ہو کہ نظامِ سلطنت کی رو سے بادشاہ کے لئے جو اختیار چھوڑ دیا گیا ہے معمولاً اس کی مناسب وسعت کیا ہونا چاہئے تو اس صورت میں کسی مصنف کی ذاتی رائے کے اظہار سے کہ کیا ہونا چاہئے عام رائے کی ترمیم پر بہت اہم اثر پڑے گا۔ اس وقت اس توقع ہیں کہ اپنی رائے کو مروجہ خیال کی حیثیت سے قائم کرنے میں مدد ملے یہ کہنے کی بہت ہی قوی ترغیب ہوگی کہ دستوری بادشاہی کا صحیح خیال ایسا اور ایسا ہونا چاہئے۔

جیسا کہ پہلے کہہ چکا ہوں میرا خیال یہ ہے کہ ۱۶۸۸ء کے بعد کی تاریخ انگلستان کے بعض انگریزی مورخین پر بھی اس رغبت کا اثر پڑا ہے جس نے بلنچلی کو مغلوب کر لیا مگر اس رغبت میں پڑکر وہ مخالف جانب چل نکلتے ہیں۔ وہ مبہم طور پر یہ یقین ظاہر کرتے ہیں یا کم از کم یہ چاہتے ہیں کہ ان کی کتابوں کے پڑھنے والے اس کا یقین کر لیں کہ ملکہ وکٹوریہ کے دور میں انگریزی دستور کا جو انداز ہے یہ طریقہ انقلاب ۱۶۸۸ء کے زمانہ سے قائم ہو چکا ہے یا کم از کم اس زمانہ سے قائم ہے جب سے ولیم سوم کے دور میں شاہی حق امحا کا استعمال بند ہوا ہے۔ (ملکہ وکٹوریہ کے اس عہد دستور سے مراد یہ ہے کہ حکمراں باقاعدہ طور پر اور بالعموم اس فریق کے سرگروہ کو وزیر اعظم تسلیم کر لیتا ہے جسے دار العوام میں کثرت رائے حاصل ہوتی ہے، اور اسے اپنے رفقا کے انتخاب کا مجاز قرار دیتا ہے اور اس طرح کے مرتب شدہ کابینہ کے لئے یہ جائز رکھتا ہے کہ اکثر اہم امور میں حکمراں کے فعل کا تعین کرے)، اس خیال کو میں کلیتہً غلط سمجھتا ہوں، ملاک کے رسالہ میں جس قسم کی دستوری بادشاہی کے قایم کرنے کی سعی کی گئی ہے اس مفہوم میں دستوری بادشاہی (یعنی ایسی بادشاہی جس میں قانون کو بے چون و چرا

غلبہ حاصل ہوا اور قانون میں ترمیم صرف "بادشاہ امرا اور عوام" کے ذریعہ سے ہو سکے)
ایسی بادشاہی کے حصول کی ۱۶۸۸ء میں کوشش بھی کی گئی اور وہ قائم بھی ہو گئی لیکن عاملانہ
اختیار یعنی ان حدود کے اندر حکومتی اختیار کو بادشاہ کے ہاتھوں سے نکال کر وزرا کی
جماعت کے ہاتھوں میں دیدینا (جن کا سرگروہ عملاً پارلیمنٹی کثرت رائے سے منتخب ہوتا
ہو)، اس کی کوشش نہیں کی گئی تھی اور کچھ زمانہ بعد تک اس کا کوئی شائبہ بھی کہیں
نظر نہیں آتا۔ شاہی اختیار کے زوال پذیر ہونے کی نمایاں علامت جارج دوم کی وسط حکومت
تک نظر نہیں آتی اور اس کے بعد پھر بادشاہ کے واقعی اختیارات جارج سوم کے تحت میں
دوبارہ قائم ہو گئے۔

۳۔ اٹھارھویں صدی میں ملکہ وکٹوریہ کے عہد کے نظم سلطنت کے صرف
تخم نظر آ سکتے ہیں اور اس نے اپنی موجودہ صورت زیادہ تر پہلے قانون اصلاح کے
بعد سے اختیار کی ہے۔ اٹھارھویں صدی کی مسلمہ رائے یہی تھی کہ وزیر اعظم
و دیگر وزرا کا انتخاب بادشاہ کرتا ہے۔ بیشک ان میں سے کسی نہ کسی کو
دار العوام میں کثرت رائے کا قائم رکھنا ضروری ہوتا تھا مگر اس کی نسبت یہ سمجھا
جاتا تھا کہ بادشاہ جس کام کے لئے انھیں مقرر کرتا ہے یہ بھی اسی کام کا ایک جزو ہے۔
یہ کہ اگر وہ اس کام سے عہدہ برآ نہ ہو سکیں تو انھیں علیحدہ ہو جانا چاہئے، یہ امر فی نفسہ
شاہی اختیار پر اس سے زیادہ روک کا کام نہیں دیتا تھا کہ ایک غایت درجہ کے
مطلق العنان بادشاہ کے تحت میں (جو اپنی فوجوں کے ذریعہ سے معرکہ سر کرنا چاہتا ہو)
اس سپہ سالار کو علیحدہ ہو جانا چاہئے جو فوجی انضباط قائم نہ رکھ سکتا ہو۔

مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ جس وزیر کو کثرت رائے کا تیار کرنا اور اسے قائم رکھنا
ہو، اس کو بہر نوع دار العوام پر انحصار کرنا پڑے گا اور آخر نتیجہ یہ ہوگا کہ عملاً دار العوام
ہی اس کا انتخاب کرے گا۔ آیا ایسا نہیں تھا، بلکہ خود اس امر واقعہ سے کہ وہ بادشاہ
کا وزیر ہوتا تھا اسے کثرت رائے حاصل کرنے میں بہت بڑی مدد مل جاتی تھی۔ یہاں
میں یہ خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ اگر ۱۶۸۸ء کے اثرات کو بہت بڑھا کر بیان کیا
جاتا ہے تو ۱۶۶۰ء میں جو تغیر ہوا، اسے بقول سیلی[۱] بہت گھٹا کر دکھایا جاتا ہے۔ انگلستان کے

---

[۱]۔ مقابلہ کیجئے سیلی کی تعریب السیاسیات Seely Intorduction and Pot Science صفحہ ۲۵۰

بادشاہ اٹھارھویں صدی میں جس طرح پر پارلیمنٹ سے برتاؤ کرتے تھے اس کا آغاز شاہی کی بحالی یا اس کے عین بعد کے زمانہ سے ہوتا ہے۔ بحالی کے بعد ہی سے شاہی اثر حکومت کا ایک اہم جزو ہو گیا، اور لفظ اثر میں ترغیب دہی کے وہ تمام ذرائع داخل ہیں جن سے بادشاہ کسی قدر شاہی وجاہت کی وجہ سے اور کسی قدر اپنی دولت و سرپرستی کی وجہ سے کام لے سکتا تھا۔[1] وجہ یہ ہے کہ پارلیمنٹ کے استقلال کی تاریخ رجعت شاہی کے وقت سے شروع ہوتی ہے اور جیسا کہ سیلی نے کہا ہے "جب پارلیمنٹ مستقل ہو گئی تو بادشاہ کو اس کا عوض یوں مل گیا کہ پارلیمنٹ بھی اس کے دسترس کے اندر اور اس طرح اس کے زیر اثر آ گئی۔"[2]

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ: اس خطبے کے بابت مسٹر سجک نے یہ حاشیہ لکھ دیا تھا اور کچھ حصہ سیلی سے اخذ کیا ہے، "اشاعت کی صورت میں اس پر غور سے نظر ڈالنا چاہیئے"۔ اور جو شخص دونوں کتابوں کا مقابلہ کر کے دیکھے گا اس پر یہ واضح ہو جائے گا کہ یہاں سے آگے اس خطبہ کا بیشتر حصہ فی الواقع سیلی کی "تقریب علم سیاسیات" سے لیا گیا ہے (خطبات سوم و چہارم سلسلۂ دوم)، تاہم دونوں مصنفوں میں کسی نہج سے کامل اتفاق نہیں ہے۔ نہ صرف ٹکڑوں ہی کا اقتباس کیا ہے بلکہ بعض حصوں میں بعینہٖ عبارت کو ترک کر کے خیالات و الفاظ لئے گئے ہیں۔ سر جان سیلی کی یہ کتاب ان کے بعد ۱۸۹۶ء میں شایع ہوئی اور مسٹر سجک ہی نے اسے اشاعت کے لئے مرتب کیا تھا اور میرا یقین یہ ہے کہ جب وہ اس کتاب کو مرتب کر رہے تھے اس زمانہ میں یہ موجودہ خطبہ اسی صورت میں تیار ہوا جس صورت میں وہ فی الجملہ اس وقت موجود ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اگر وہ خود ان خطبات کو کتاب کی صورت میں شایع کرتے تو اس میں کس حد تک تغیر کرتے۔ یہ خیال دلا دینا بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ مسٹر سجک جس وقت سر جان سیلی کے ان خطبات کو مرتب کر رہے تھے تو یہ خطبات ان کے لئے نئے نہیں تھے وہ انہیں مسودات کی صورت میں پہلے ہی پڑھ چکے تھے، اور ان کے کاغذات میں ان خطبات کے زیادہ وسیع تعلیقات موجود ہیں جن پر بظاہر سیلی سے گفتگو کرنا مقصود تھا، ان اشارات میں اتفاق و اختلاف دونوں محلات کو ظاہر کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران میں سیلی (سجک کے) ان خطبات یا ان میں سے بعض خطبات کو پڑھ رہے تھے۔ (جو اب اس کتاب کی صورت میں تیار ہوئے ہیں) اور بالضرور ان پر تنقید کر رہے تھے۔ بظاہر مقصد یہی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اتحاد و اتفاق پیدا کیا جائے۔

[1] مقابلہ کیجئے سیلی کی کتاب بالا صفحہ ۲۶۱

[2] ایضاً صفحہ ۲۶۱۔

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اٹھارھویں صدی کے اندر حکومت عاملانہ کے متعلق شاہی و پارلیمنٹی اختیار کے تنازعہ پر جو ہرے بھرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ پارلیمنٹ نے ایک ایسی بادشاہی کے تمام قانونی ظواہر کو برقرار رکھا جو قانون کے اندر حقیقی عاملانہ اختیار کو عمل میں لاتی ہو اور وضع قوانین میں بھی اس کی شرکت ہو مگر اس کے عقب میں رقوم کا اختیار پارلیمنٹ ہی کے ہاتھ میں تھا اور قانون غدر کی منظوری سے وہ ہمیشہ انکار کر سکتی تھی۔ بادشاہ اس سے واقف تھا، اور وہ پارلیمنٹ سے علانیہ پرخاش کی فکر نہیں کرتا تھا اس نے اپنے حق امتناع کو متروک ہو جانے دیا مگر اس کے عقب میں اس کے پاس ایک مہیب قوت شاہی اثر کی تھی۔ بادشاہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور داخلی سیاسیات میں وہ زیادہ اثر انداز نہ رہا مگر جو لوگ اٹھارھویں صدی میں ان تاریخی بے اثر بادشاہوں کے تحت میں رہتے تھے وہ ہمیشہ ان کی ضرورت سے زیادہ اختیار کے شاکی رہتے تھے۔ شاندار انقلاب کے تقریباً سو برس بعد، جارج سوم کے دور حکومت کے وسط میں ایک قرارداد دارالعوام میں پیش ہوئی تھی کہ "تاج کی طاقت بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے، اسے گھٹانا چاہیئے"۔ واقعہ یہ ہے کہ اٹھارھویں صدی کے وسط میں بہت ہی تھوڑے زمانہ کے لئے یہ طاقت کسوف کے تحت میں آگئی تھی۔

۱۶۸۹ء کے بعد کے بادشاہوں پر ہم مختصر نظر ڈالتے ہیں۔ ولیم سوم کو کوئی شخص محض رسمی بادشاہ نہیں سمجھتا۔ این خود اپنی مرضی سے وزرا کا عزل و نصب کیا کرتی تھی۔ حکمت عملی کے اہم تغیرات کے تعین میں اس کی مرضی کو خاص الخاص حیثیت حاصل تھی[1]۔ جب ہم جارج اول اور جارج دوم کے دور میں پہنچتے ہیں تو بیشک اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مدت طویل کے لئے اختیار والپول کے قبضے میں چلا گیا تھا، مگر فرانسیسی بادشاہوں کے تحت میں بھی ایسا ہوا تھا تا آنکہ لوئیس چہاردہم کے بعد تک کے زمانے میں اکثر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اختیارات وزرا کے ہاتھوں میں مرکوز ہو گئے ہیں۔ دونوں صورتوں میں اصل وجہ یہ ہے کہ بادشاہ کی عنایت وزیر کے شامل حال تھی[2] اور والپول کے ہمعصر اس معاملہ کو اسی نظر سے دیکھتے تھے۔ ۱۶۸۹ء کے بعد نصف صدی تک بھی

---

(۱) مقابلہ کیجئے سیلی کی کتاب مذکور صفحہ ۲۷۴۔

(۲) لیکن والپول اور (مثلاً) رشلیو یا مازارین کے درمیان مقابلہ اس اعتبار سے ناکمل ہے کہ

نہیں ہے اس کا اظہار نہیں ہوتا کہ دارالعوام کو اس کی خواہش بھی رہی ہو کہ وہ قانون سازی و اجرائے محصول پر قابو حاصل کر کے بادشاہ کو وہ اس وزیر کا تقرر کرنے پر مجبور کرے جسے دارالعوام نے منتخب کیا ہو۔ کوئی وزیر جسے دارالعوام کے فرقۂ کثیر کی تائید حاصل ہو وہ بے شک ایک زبردست وزیر ہوتا مگر یہ خیال تک نہیں تھا کہ وہ بادشاہ کے مقابلے میں زبردست ہوگا[1]۔ ایسا نہیں ہوتا تھا کہ بادشاہ اسے برطرف کرنا چاہے اور اس میں اسے کامیابی نہ ہو ایک دوسرے کی قوت کی آزمائش نہیں تھی، بلکہ یہ خیال بھی نہیں تھا کہ بادشاہ کے ایسا کرنے میں کوئی امر سد راہ ہے، بجز اس کے کہ اسے یہ یقین تھا کہ والپول اپنے کام کو دوسروں کے مقابلے میں خوبی کے ساتھ انجام دیتا ہے، اسے (بادشاہ کو) روپیہ کی جب ضرورت ہوتی وہ مہیا کر دیتا اور اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ وزیر بڑی حد تک اپنی رائے پر چلتا تھا تو مطلق العنان بادشاہی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب والپول کے خلاف اتحاد قوی ہو گیا تو اس سے بادشاہ کا کام ناممکن ہو گیا تھا، چنانچہ اسے ساقط کرنا پڑا مگر اس سے یہ مقصود نہیں تھا کہ بادشاہ کے جدید انتخاب پر کسی قسم کا دباؤ پڑے۔ ہماری تاریخ میں بہت بعید زمانہ تک گاہ بگاہ ایسا ہوا ہے کہ پارلیمنٹ نے بادشاہ پر یہ حکم لگا دیا ہو کہ کن وزرا سے اسے مشورہ نہ کرنا چاہیئے،[2] یہ اس سے بہت ہی مختلف امر ہے کہ انتخاب کو بادشاہ

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ آخرالذکر کو ان کے اختیارات بادشاہ کے سوا اور کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں حاصل ہوئے تھے برخلاف ازیں والپول کو یہ اختیار ایک حد تک اس وجہ سے بھی حاصل ہوا تھا کہ اس نے دارالعوام کو اپنے قابو میں کر رکھا تھا۔ میرا خیال یہ ہے کہ پارلیمنٹی وزرا کی جانب میلان اسی وقت سے قایم ہو گیا تھا جب سے رقوم کے اختیار کو اپنے قبضہ میں لے کر پارلیمنٹ کی حیثیت مستقل ہو گئی اگر بادشاہ اس جانب مائل ہو گیا ہو کہ وہ اپنے وزیر اعظم کا انتخاب اس کے پارلیمنٹ پر قابو رکھنے کی قابلیت کا لحاظ کر کے کرے تو پھر اس ـــــ کے بعد اس منزل پر پہنچ جانا کچھ دور نہیں ہے کہ بادشاہ اسے ضروری سمجھنے لگے کہ وہ اس شخص کو وزیر مقرر کرے جسے فرقۂ غالب کے سرگروہ وزیر بنانا چاہتے ہوں

[1]۔ ایضاً صفحہ ۲۷۶۔

[2]۔ ایضاً صفحہ ۲۷۶۔

کے ہاتھ سے نکال لیا جائے تاہم جو اسباب وزیر کو بادشاہ سے آزاد کرنے میں ممد ہوئے بلاشک و شبہ اس وقت سے اپنا عمل کرنے لگے جب سے کہ خاندان ہانوور کے بادشاہ انگلستان میں آئے ؟ میں سیلی کے ساتھ اس خیال میں متفق ہوں کہ اس نظم کی ترقی کے پہلے بدیہی آثار جارج دوم کے عہد حکومت کے آخری پندرہ برسوں میں ظاہر ہوئے۔
بہر حال کوئی سی صورت ہو یہ اسباب انقلاب کی وجہ سے نہیں پیدا ہوئے، بلکہ وہ اس نہایت ہی مخصوص فریقانہ نظم کے عمل کی وجہ سے پیدا ہوئے جو خاندان ہانوور کے ساتھ ساتھ ظاہر ہوا[۱] اس طریق کار کا خلاصہ یہ ہے کہ وہگ ہمیشہ برسر اقتدار رہیں جسے ہانووری بادشاہوں کو اس وقت تک قبول کرنا پڑا جب تک ٹوریوں نے خود کو دوحمایت جیمز" سے صاف نکر لیا۔ اس سے عملاً بادشاہ وہگوں کے ہاتھ میں پڑ گیا اور اس لئے وہ باہم متفق رہنے سے اپنی پسند کے شخص کے اختیار کرنے پر بادشاہ کو مجبور کر سکتے تھے۔
اس طرح براوراست پلہیم ۱۷۴۴ء میں اس کے گلے منڈھے گئے لیکن غالباً اس میں کوئی گہرا درخیال اس امر کا نہیں تھا کہ اصول انقلاب کو اور آگے بڑھایا جائے اور بادشاہ کے اختیار کو اور پست کیا جائے[۲] تاہم اس سے یہی اثر پیدا ہوا اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جارج دوم کو اس امر کا احساس تھا کہ بادشاہی پر آہستہ آہستہ سکتہ کی حالت طاری ہوتی جاتی ہے ایک دفعہ جب اس نے کسی شخص کو انگریزی دستور کی تعریف کرتے ہوئے سنا تو اسنے کہا کہ "بادشاہ کے لئے یہ اچھا نہیں ہے[۳]۔
مگر جب ہم جارج سوم کے عہد پر پہنچتے ہیں تو پھر شاہی اختیارات کی تجدید ہو جاتی ہے۔ فی الحقیقت ٹینجلی کے ایک حاشیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آئینی بادشاہی کے صحیح خیال" کو جو اس نے انگریزی دستور تک وسعت دی تو اس وقت یہی جارج سوم کے عہد کا دستور اس کے پیش نظر تھا، اس سے یہ غلطی سرزد ہوئی ہے کہ وہ جارج سوم کے زمانے کے دستور اور وکٹوریا کے عہد کے دستور کو یکساں تصور کرتا ہے۔ گو انگریزی

---

[۱] سیلی۔ حسب بالا صفحہ ۲۷۸۔
[۲] ایضاً ۲۸۰ - ۲۸۱
[۳] ایضاً ۲۸۳ -

مصنفین اکثر بظاہر اس سے متخالف غلطی میں پڑ جاتے ہیں اور وہ جارج سوم کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا وہ انقلاب کے قائم کردہ دستور کے خلاف جدوجہد کر رہا تھا، جارج سوم کو جیمز دوم کی کشمکش کے از سر نو زندہ کرنے کا مطلق کوئی خیال نہیں تھا۔ وہ یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی قانون کو معلق و ساقط کر دے یا اس کی خلاف ورزی کرے یا کسی قانونی ذمہ داری سے بچ نکلنے کی کوشش کرے یا یہ کہ پارلیمنٹ کے تشریعی اختیار کو معرض بحث میں لائے یا اسے کم کرے۔ وہ جس شے کے خلاف جد و جہد کر رہا تھا وہ وہگ فریق کا وہ نیا اغتصاب تھا جو ۱۷۴۵ء میں شروع ہوا اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس میں آسانی اس وجہ سے ہو گئی کہ قدیم شاہی فریق کا ایک اہم جز واب بھی ظاہراً یا باطناً خاندانِ اسٹوارٹ سے وابستہ تھا اور جارج دوم کسی ٹوری حکومت پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا۔

جارج سوم کے عہد کے ساتھ وہگوں کی اس لابدی ماتحتی کا خاتمہ ہو گیا اور اس نے اس " نئے اغتصاب " کے مقابلہ میں جس کے ذریعہ سے برادرانِ پلہم جارج دوم کے گلے منڈھ دیئے گئے تھے، کامیابی کے ساتھ جد و جہد کی۔ جیسا کہ سیلی کہتا ہے " آپ اس کے تمام دورِ حکومت میں یہ دیکھیں گے کہ وہ اس امر پر مصر ہے کہ وزیر اس کا وزیر ہونا چاہیئے "، اور بہ حیثیت مجموعی وہ اس میں کامیاب رہا۔ ۱۷۷۰ء سے قبل کے پریشان دور کا خاتمہ لارڈ نارتھ کی وزارت پر ہوا جو قطعاً بادشاہ کا وزیر تھا اور جو بارہ برس تک برسرِ اقتدار رہا، پریشانی کا دوسرا مختصر دور پٹ اصغر کی وزارت پر ختم ہوا کہ وہ بھی بادشاہ کے حسب مرضی تھا اور یہ وزارت اٹھارہ برس تک قائم رہی اور پٹ کے انتقال کے بعد فریق ثانی صرف ایک برس عہدہ پر قائم رہ سکا "[۱]

بعض اوقات یہ سمجھا جاتا ہے کہ چونکہ پٹ کو ملک کی تائید حاصل تھی اس لئے وہ فی الحقیقت بادشاہ سے آزاد تھا، اور اس کو منتخب کر کے بادشاہ نے درحقیقت گویا اپنے کو ایک مالک کے تحت میں دیدیا تھا۔ جو شخص ایسا خیال کرتا ہو اس سے میں یہ سفارش کروں گا کہ وہ اس تحریر کو پڑھے جس کا کچھ اقتباس لارڈ روزبری نے شایع کیا ہے اور لارڈ موصوف اس قسم کے معاملات میں سند کا رتبہ رکھتے ہیں۔ یہ

---

[۱] سیلی حسب سابق صفحہ ۲۸۲۔

دارالعوام کی ایک کارروائی منعقدۂ یکم مئی ۱۷۸۸ء کا خلاصہ ہے، جو حال میں پٹ کے ایک معتمد خانگی کے کاغذات میں ملا ہے۔ اس میں "تاج کے فریق"، کا اندازہ ۱۸۵، ارکان کا کیا گیا ہے۔ یہ وہ فریق ہے جو غالباً اعلیٰحضرت کی حکومت کی تائید ہر ایک وزیر کے تحت میں کرتا بشرطیکہ وہ بالتخصیص غیر مقبول نہ ہو، ایوان کے آزاد یا بے تعلق ارکان کا اندازہ (۱۰۸) کا ہے، "فاکس کے فریق میں (۱۳۸)، اشخاص تھے اور پٹ کے فریق میں ۵۲۔ اس غیر خوشکن اندازہ میں اس رائے سے مزید کمی ہو گئی ہے "کہ اگر کوئی نئی پارلیمنٹ ہو اور اس میں مسٹر پٹ وزیر نہ رہیں تو اس آخری فریق میں سے بیس سے زائد اشخاص منتخب نہ ہوں گے"[1] بہر حال اسی زبردست اثر کی وجہ سے جس کی ایسی حیرت انگیز شہادت اس تحریر سے ملتی ہے، "جس فریق نے جارج سوم کے پیشروؤں کو ذلیل کیا تھا اسے اس نے اس طرح اپنے سے دور کر رکھا تھا۔ برادران پلہم کا فریق جس کی رہبری نیوکاسل کے بعد راکنگھم اور راکنگھم کے بعد فاکس کر رہا تھا، اور جو اس عہد میں محض "وھگ فریق" کے نام سے مشہور تھا، وہ بہت طویل و نفوس کے بعد کبھی نہ کبھی لڑ جھگڑ کر اقتدار حاصل کر لیتا تھا بادشاہ کو اگر کوئی چارۂ کار نظر نہ آتا تھا تو وہ کچھ دیر کے لئے اسے برداشت کر لیتا تھا مگر ہمیشہ اعتراض کے ساتھ ایسا کرتا تھا۔ وہ اس کے وزیر نہیں تھے اور اس کی قطعی رائے یہ تھی کہ اسے اپنی مرضی سے اپنے وزیروں کے تقرر کا حق حاصل ہے۔ لہٰذا وہ ترشروئی کے ساتھ انھیں قبول کرتا تھا، ان پر گہری نظر رکھتا تھا، اور اگر وہ پوری مجلس وزرا کا تقرر نہیں کر سکتا تھا تو کسی نہ کسی طرح سے جد وجہد کر کے اس میں تھرلو یا ایلنبرا کے ایسے اپنے دو ایک نمائندے تو مقرر ہی کر دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے موقع کی تاک میں لگا رہتا تھا جو بالعموم سال کے اندر ہی اندر آجاتا تھا اور پھر وہ انھیں برطرف کر کے دوبارہ اپنی پسند کی وزارت منتخب کر لیتا تھا"!

تقریباً نصف صدی تک جارج سوم اس قابل رہا کہ وہ انگریزوں کے نظم کو اس حالت پر قائم رکھے مگر جارج چہارم اور ولیم چہارم کے عہد میں پھر پارلیمنٹ کے

[1] سوانح عمری پٹ Pitt مصنفۂ لارڈ روزبری صفحہ ۷۵

اور وزرا کا انحصار سرعت کے ساتھ ترقی کرنے لگا۔ کیننگ بز ورجارج چہارم پرمسلط ہوگیا اور ارل گرے کے متعلق اگر قطعاً یہ نہ کہا جائے کہ وہ ولیم پر مسلط ہوگیا تھا، تو کم از کم اتنا تو صحیح ہے کہ اس کے تقرر میں قوم کے حصے کے ساتھ بادشاہ کا حصہ ایک اور سو کی نسبت رکھتا تھا۔[ع۱]

۴۔ قانون اصلاح کے بعد ۱۸۳۴ء میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وزرا کے تقرر کا اختیار بادشاہ کے قبضے سے نکل گیا۔ "ولیم چہارم" "اصلاحی وزارت" سے تھک گیا تھا، اس نے لارڈ التھارپ کے ایوان بالائی میں جانے کے موقع سے فائدہ اٹھا کر بقول خود "ایک نیا انتظام کیا"، یعنی موجودہ وزرا کو برطرف کردیا اور سر رابرٹ پیل کو وزارت مرتب کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت یہ ظاہر ہوا کہ انگریزوں کا دستور سیاسی نامحسوس طور پر کتنا کچھ بدل گیا ہے۔ سر رابرٹ پیل کے سامنے جو مسئلہ پیش تھا وہ ناقابل حل تھا۔ ایوان نے اس پر تو کچھ ردوقدح نہ کی کہ بادشاہ کو خود اپنا وزیر مقرر کرنے کا اختیار ہے یا نہیں بلکہ اس نے اس وزیر کا ہر طرح پر مناسب اعزاز واکرام کیا، مگر جب اس نے اپنی حکمت عملی کو ایوان کے سامنے پیش کیا تو وہ کثرت رائے کی تائید حاصل کرنے میں ناکام رہا۔[ع۲]

اس کشمکش کے تفصیلات پر نظر ڈالنا بھی دلچسپ ہوگا۔ قوم کی منظوری سے انکار کرنے کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا، یہاں تک کہ ہیوم کی یہ تحریک بھی کہ اس منظوری کو صرف تین ماہ کے لئے محدود کردینا چاہیئے ساقط ہوگئی، عدم اعتماد کی کوئی تحریک پیش نہیں ہوئی۔ ہم یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ اگر پیل اپنے کام کو صرف عاملانہ فرائض تک محدود رکھتا اور قانون سازی کے کام کو دونوں ایوانوں کے لئے چھوڑ دیتا، تو اس حالت میں کیا صورت واقع ہوتی مگر اغلب یہ ہے کہ وہ استعفا دینے پر مجبور ہوجاتا۔ لیکن اس نے اپنی ایک مخصوص روش کا اختیار کرنا یعنی تشریعی تجاویز کا پیش کرنا ضروری سمجھا، قوانین دیوانی کی اصلاح و ترقی، قانون کلیسا کی اصلاح، آئرلینڈ کے مسئلہ عشر کا انتظام، انگلستان میں عشر کی تبدیل

ع۱۔ پیلی حسب بالا صفحہ ۲۸۳-۲۸۴۔

ع۲۔ ایضاً صفحہ ۲۸۴-۲۸۵۔

رقبی ہکلیسا کی حقیقی خرابیوں کی ہو تو فی " منحرفوں کی ان " تکالیف کا رفعداد جو جائز شکایات پر مبنی ہوں "، ان امور کو اس نے اپنی حکمت عملی کے طور پر چلانا چاہا اور، اس طرح گویا اس نے ایک ایسی حیثیت اختیار کرلی کہ اگر کثرتِ رائے اُس کی حکمتِ عملی کو قبول نہ کرے تو اسے استعفا دینا پڑے ۔

اب سوال یہ ہے کہ جو تغیر واقع ہوا وہ قطعی صورت میں کیا تھا فرض کیجیے کہ "اس قسم کا کوئی تقرر جارج دوم کے عہد میں ہوا ہوتا تو وزیر اس مصیبت سے بچنے کیلئے کیا صورت اختیار کرتا " جواب یہ ہے کہ " اٹھارھویں صدی میں وزیر کو من حیث الوزیر کثرتِ رائے حاصل ہو جاتی تھی "، ع۱ یہ ضروری نہیں تھا کہ رشوت سے ہی ایسا ہو، پیل نے " قانون محصول کا غذاتِ ممہور " کی تنسیخ کے وقت جو تقریر کی اس کا مقابلہ کیجیے۔ وہ کہتا ہے کہ " معزز رکن ہم سے یہ نہیں کہسکتے کہ چونکہ ہم نے خود یہ قانون منظور کیا اس لئے ہم اس کے ویسے ہی ذمہ دار ہیں جیسے وہ خود ہیں، ایسا نہیں ہے ہم نے ان کے وزیر ہونے کے اعتماد پر اسے قبول کرلیا، میری تمنا یہ ہے کہ ایوان کی ایسی عادت نہ ہوتی مگر اب تو ہے، خود صدارت مآب بھی اکثر محل سنٹ جیمز کی طرف نگاہ لگائے رہتے ہیں "۔ مگر مناصب و وظائف کا اثر اس " عادت "، کا زبردست پشتیبان تھا، ع۲ دونوں ایوان یہ جانتے تھے کہ وہ قانون کے ذمہ دار ہیں، اور پیٹ کی تقریر تو ایک وکیل کی سی تقریر ہے، سیلی کے الفاظ میں یوں کہسکتے ہیں کہ " نمایندوں کے دل میں ہنوز یہ خیال پیدا نہیں ہوا تھا کہ

ع۱۔ سیلی حسب بالا صفحہ ۲۰۵۔

ع۲۔ مقابلہ کیجئے ہیوم کا خطبۂ ششم " درخود مختاری پارلمینٹ " (شایع شدہ ۱۷۴۲ء) " بادشاہ کے قبضے میں اتنے عہدے ہیں کہ جب اسے ایوان کے دیانتدار و بے غرض حصہ کی تائید حاصل ہو جائے تو ہمیشہ کل ایوان کی قرار داد پر اتنا قابو تو ضرور ہی رکھے گا کہ قدیم دستور کو خطرے سے محفوظ رکھ سکے پس ہم اس اثر کا جو نام چاہیں رکھیں ہم اسے " رشوت وہی " اور " دربار داری " کے مذموم ناموں سے یاد کرسکتے ہیں مگر دستور کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ یہ تغیر کمیف دکم اس کا کچھ نہ کچھ قائم رہنا لابدی اور انگریزوں کی مخلوط حکومت کی بقا کے لئے ضروری ہے "۔ سیلی کا بھی مقابلہ کیجیے (۱۷۸۰)

ملک کی حکومت انھیں تفویض کی گئی ہے۔" اگر حکومت میں وضع قوانین بھی داخل ہو، مگر میرے خیال میں تو اس میں بہت کچھ مبالغہ آمیزی ہے۔ اس سے بھی بڑھکر وہ یہ کہتا ہے کہ "ان کی عادت یہ تھی کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ملک پر حکومت کرنا بادشاہ کا کام ہے اس لئے جب اسے یہ منظور ہو تاکہ وہ اپنے وزرا کے ذریعہ سے یہ واضح کردے کہ عاملانہ حکومت کے لئے بعض کارروائیوں کو وہ ضروری سمجھتا ہے تو ارکان یہ خیال کرتے تھے کہ ان کارروائیوں کی ضرورت کے لحاظ سے انھیں یہ استحقاق ہے کہ وہ ان کارروائیوں کو بادشاہ کے اعتماد پر قبول کرلیں، وہ اپنے کو اس حد تک پابند سمجھتے تھے کہ وہ یہ دیکھیں کہ ان کارروائیوں کا اثر قوم یعنی رائے دہندوں پر کیا پڑتا ہے" ؎۱ یہ اس صورت حال سے بہت ہی قریب ہے جو شہنشاہ ولیم کو تشاٹاگ کے ساتھ ہے، اس مثال سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ اس قسم کی دستوری بادشاہی کے قایم رکھنے کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس کا انحصار رشوت پر ہو، اگرچہ اٹھارھویں صدی میں انگلستان میں یہ کام واقعاً رشوت دہی کے ذریعہ سے انجام پاتا تھا۔ جرمنی میں ایسا نہیں ہوتا، مگر پارلیمنٹی رائے کے سوا اپنے وزیروں کی آزادانہ پسندیدگی کے لئے بادشاہ کے مفید مطلب اور بھی تائیدیں حاصل ہیں۔ یہ خیال قائم ہے کہ اگر بادشاہ پر ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑے تو شاہی کے روایات اور فوج کی وفاداری کی وجہ سے بادشاہ پارلیمنٹ سے مقابل پیش آسکتا اور فتح حاصل کرسکتا ہے۔ یہ غور و فکر کے لئے ایک دلچسپ مسئلہ ہے کہ دستوری بادشاہی جو جرمنی میں مضبوطی کے ساتھ قائم ہے اور اسکنڈینوی سلطنتوں میں کشاکش کررہی ہے، اس کا آئندہ حشر کیا ہوگا، مگر پشینگوئی نہ میرا فرض ہے نہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔

انگلستان کے تغیر کی نسبت ہم متعدد اسباب تسلیم کرسکتے ہیں۔ اولاً یہ کہ جارج سوم کے عہد میں بتدریج شاہی اثر کو زوال ہوتا گیا اس کے خلاف اس نے بڑی ہی استقامت سے جد و جہد کی مگر جارج چہارم بالطبع اس کے مقابلے میں بے بس ہوگیا، فریق راکنگھم کے وھگوں نے شاہی سرپرستی کو گھٹا دیا تھا اور اغلب یہ ہے کہ قوم کی دولت

؎۱۔ سیلی حسب بالا صفحہ ۲۸۷۔

وآبادی کی وسیع ترقی نے دربار کے اضافی اثر کو کم دیا تھا۔[علہ] جارج چہارم کے زمانے کے کثیر العمل تجارتی وصنعتی انگلستان میں پارلیمنٹ کے ارکان درباری نہیں رہے تھے۔[علہ]
پارلیمنٹ کے تشریعی کاموں کا بڑھ جانا بھی ایک دوسرا سبب ہوا۔ پس جب قانون سازی وزیر کا خاص فرض ہو گیا اور یہ قانون سازی، جانشینی شاہی، درمیان سلطنت اختیارات، حلف غیاب اور دوسرے ایسے مسائل کے متعلق نہیں تھی جن سے بادشاہ کو دلچسپی ہو بلکہ یہ توضیع قوانین، کارخانوں، صنعت گاہوں، جنگ، محصول درآمد و برآمد اور جہاز رانی سے متعلق ہو گئی تو پھر وزیر کا طبعی میلان یہی ہو گیا کہ وہ پارلیمنٹ کا وزیر ہو جائے (کیونکہ یہ ایسے مسائل تھے کہ تاج کے روایات بادشاہ کو اس پر آمادہ نہیں کرتے تھے کہ وہ ان قوانین میں پر زور مداخلت کرے)، اور اس میلان کا مقابلہ کرنے کے لئے جارج چہارم بلکہ ولیم چہارم سے بھی مختلف طبیعت کے بادشاہ کی ضرورت تھی۔ علاوہ ازیں جارج سوم کے ان بیٹوں اور خاصکر جارج چہارم کی شخصی غیر ہر دلعزیزی اور بدنامی کو بھی جارج سوم کے عہد کے یاران شاہی کی شخصی وفاداری کو زائل کرنے میں کچھ کم اہمیت نہیں تھی۔ سب سے آخری امر یہ ہے کہ خیالات کی تحریک اور ابتدائی اور عمیق دساتیر کے درمیان فرق کے صریح احساس کی عدم موجودگی نے اس تغیر میں سہولت پیدا کر دی۔ لیکن اب یہ صورت حال پیدا نہیں ہو سکتی، اور اگر خاندان ہنوور وکرن کا کوئی بادشاہ پارلیمنٹی وزیر اعظم کے قبول کرنے پر مجبور ہو تو اسے یقیناً یہ علم ہو جائیگا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

علہ - سیلی، صفحہ ۲۰۸-۲۰۹-
علہ - ایضاً صفحہ ۲۰۹-

خطبۂ بست و ہشتم

انیسویں صدی کی دستور سازی

۱۔ سابق خطبات میں ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ جدید مملکت کا جیسا تصور قائم کرنے پر ہم متفق ہوئے ہیں (خاصکر از منۂ وسطیٰ کی مملکت کے مقابلے میں)، اس کی تکوین کی پہلی منزل بالطبع اس مطلق العنان شاہی کے میلان کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی جسے ہم سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں دیکھتے ہیں۔ مملکت کے جدید تصور کیلئے یہ لازمی معلوم ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی ایسی طاقت ہونا چاہئے جو قوانین کے بنانے کے قابل ہو اور چونکہ وہی طاقت قانون کا منبع و مخزن ہوگی اس لئے وہ خود کسی قانون سے محدود نہ ہوگی اور جدید مملکت لاحکومتی میں نہیں بلکہ معمولی حالت میں؛ یہ بھی لازمی تھا کہ یہ طاقت سب سے بالا و برتر ہو اور نیز یہ کہ اہلِ ملک کی بہت ہی کثیر تعداد کی کامل الطاعت اسے حاصل ہو اور ان کی اس اطاعت کے ذریعے سے وہ اس قابل ہو کہ افراد یا جماعات کی علانیہ مقاومت کو کچل دینے کے لئے وہ قوم کی منضبط قوت کو کام لا سکے، اور میں نے یہ ظاہر کیا ہے کہ اس تخیل کو کم و بیش موزوں و مناسب حد تک عمل میں لانے کا آسان ترین طریقہ یہی تھا کہ اس طاقت کو شاہی کی بنیادوں پر قائم کیا جائے اور تمام اعلیٰ اقتدار ایک شخص واحد کے سپرد کر دیا جائے، اور اسی وجہ سے ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اہلِ فکر و اہلِ عمل دونوں قسم کے اشخاص کی ایک اہم جماعت سولھویں صدی سے اٹھارھویں صدی تک اس خیال پر جمی ہوئی تھی کہ مطلق العنان بادشاہی سے نظم و امن کا جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اور طوائف الملوکی کی جو خرابیاں اس سے دفع ہوتی ہیں، ان کا نفع اس طرز حکومت کے نقائص سے بڑھ جاتا ہے۔

اس امر کی نہیں ہے کہ وہ ان قوانین کا پاس ولحاظ رکھے گا۔ ان دونوں امور کا فرق اہم ہے، کیونکہ بالفاظ جی سی لیوئس، "دیدہ ودانستہ، ہمہ گیر و بالقصد جبر ستانی وناانصافی اور بے خیالی، مخصوص واتفاقی جبر ستانی وناانصافی میں بڑا فرق ہے۔ بہت سی حکومتیں جو عادتاً اپنی رعایا کے ساتھ نہایت ہی سخت گیری کا برتاؤ کرتی ہیں، وہ بھی اس سے شرمائیں گی کہ جن اصولوں کی رہنمائی میں وہ فی الواقع چل رہی ہیں انھیں قانون کی شکل میں لاکر اپنی رعایا اور تمام مہذب دنیا کے سامنے شایع کریں"[۱]

پس اگر ایک ہی شخص کو قوانین کے وضع کرنے اور ان قوانین کے عمل میں لانے کا اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہو اور اگر اس پر کم از کم اتنا ہی اعتماد ہو کہ وہ خود اپنے ہی قوانین کی پابندی کرے گا تو بھی بہت غنیمت ہے اس سے ہمیں اس جانب رہبری ہوتی ہے کہ اقتدار اعلیٰ کی بحث سے علحدہ ہو کر بھی تشریعی فرائض کو عاملانہ وعدالتی فرائض سے اس طرح پر علحدہ کرنے میں صریحی نفع ہے کہ جو لوگ قوانین کو عمل میں لاتے ہیں وہ بھی ان قوانین کی اطاعت کے اتنے ہی پابند ہوں جتنے وہ لوگ پابند ہوں جن پر وہ ان قوانین کا نفاذ کرتے ہیں، اور اس مسئلے کے طے کرنے کے لئے کہ آیا انھوں نے قانون کی اطاعت کی ہے یا نہیں کی ہے یہ ہمیشہ بے لاگ ججوں کے سامنے آنا چاہئے۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ اقتدار اعلیٰ جب قوم یا قوم کی نمائندہ جمعیت کے ہاتھ میں ہو اس وقت بھی اقلیات کی حفاظت کے لئے فرائض کی یہ تقسیم کچھ کم ضروری نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی اعلیٰ جمعیت، فرد واحد سے کم ظالمانہ نہ ہو۔ عمومی الدارات کو جس واحد مفہوم میں قطعی طور پر بادشاہی کے بہ نسبت "ورکزیادہ آزاد"، کہا جا سکتا ہے وہ صرف یہ مفہوم ہے کہ بادشاہی کے تحت میں حصۂ کثیر پر ظلم ہو سکتا ہے برخلاف ازیں عمومیت کے تحت میں اس ظلم کا تختۂ مشق صرف حصۂ قلیل ہوگا[۲]

---

[۱] حکومت توابع، تحقیقات ابتدائی Ge veinment and dependences, Pseliminary صفحہ ۳

[۲] مقابلہ کیجئے۔ مبادی سیاسیات باب بستم پیرا ۲۔

جیسا کہ میں قبل ازیں کہہ چکا ہوں، مطلق العنان بادشاہی کی جانبدارانہ رائے
پر خیالات کی ان ترقیوں کا بھی لازماً اثر نہیں پڑا جنھوں نے بتدریج بادشاہوں کو
اس قدیم نیم جاگیری تخیل سے نکالکر کہ ملک پر انھیں ایک طرح کی مِلک حاصل ہے،
ان میں جدید خیالات پیدا کر دئے تھے۔ درحقیقت انقلاب فرانس سے عین
ماقبل ہی ۱۷۶۶ء میں شاہی مہر بردار نے اس عدالتی جماعت کے سامنے جسے پیرس
کی پارلمان کہتے تھے، دعوی کے ساتھ یہ کہا کہ "فرانس کے اندر اقتدار اعلی کا محل
صرف بادشاہ کی ذات ہے، اور وہ اس کے استعمال کے لئے صرف خدا کو جواب دہ ہے،
قوانین کے وضع کرنے کا اختیار آزادانہ و غیر قابل تقسیم طور پر کلیتہً اسی کے ہاتھ میں ہے"
گر شاہی مہر بردار نے زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی نہیں کی تھی۔ لوئی چہار دہم کے عہد میں
اس بیان سے بہت ہی شد و مد کے ساتھ رائج الوقت رائے کا اظہار ہوتا ہے مگر
جب زمانہ ترقی کر گیا اور فرانس میں آزادانہ تنقید کو ترقی ہوئی اور اس کا اثر یورپ
کے دوسرے حصص میں بھی پہنچا تو (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) تعلیم یافتہ رائے کا
میلان شدت کے ساتھ دوسری جانب ہو گیا۔ اس انتقاد کی نسبت یہ ملحوظ رہنا
چاہئے کہ اس کی ابتدا مذہبی حکمرانی سے ہوئی (اور اس کے بعد دنیاوی حکمرانی بھی اس
کی زد میں آگئی) اگرچہ فی الواقع ہمیں یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ جس انقلاب نے نئے
نظم سلطنت کا راستہ کھول دیا اس کا واحد سبب صرف یہی سیاسی خیال کی رو تھی تاہم مجھے
اس میں شک نہیں کہ رائے کا یہ میلان بھی ایک حقیقی اہم عنصر تھا (اور ان مالیاتی اسباب
پر تو میں خصوصیت سے نظر ڈال چکا ہوں جنھوں نے اس میں اہم اتحاد عمل کیا اور جن
کے وجود میں آنے کا سبب وہ خاص طرز تھا جس طرز پر ترقی کر کے فرانس جاگیریت
سے نکلا تھا) یہ امر لحاظ رکھنے کا ہے کہ مطلق العنان بادشاہی میں دو مختلف اقسام
کے نقائص ہیں، صرف یہی ایک نقص نہیں ہے کہ وضع قوانین کا اعلی اختیار ایک
فرد واحد کے ہاتھ میں ہے اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسے قوم کے مفاد کے لئے نہ استعمال
کرے، بلکہ ایک مزید نقص یہ بھی ہے کہ چونکہ قوانین کا عمل میں لانا بھی اسی شخص کے
اعلی اقتدار کے تحت میں ہوتا ہے اس لئے اگر اپنی خواہشوں یا کسی کی رعایت کے
خیال سے وہ خود اپنے ہی قوانین کی خلاف ورزی کرنا چاہے تو کوئی کافی ضمانت

دستور سازی کی جس صدی میں ہو کر اس وقت ہم گزر چکے ہیں اس کے ابتدائی حصہ میں ان صداقتوں کا عام طور پر تسلیم کیا جانا زیادہ تر مونٹسکیو کا زیر بار احسان ہے۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، اس نے یہ معلوم کیا اکہ یہ تقسیم اختیارات اس کے وقت کے برطانوی دستور میں نمایاں حد تک عمل پذیر ہو چکی ہے اور انہی کے اثر نے یہ کر دکھایا کہ دنیا کی نگاہوں نے اس دستور کو نمونہ بنا لیا۔ مونٹسکیو نے برطانوی دستور کے جس خاص وصف کی مدح سرائی کی ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ حکومت کے تشریعی، عاملانہ، و عدالتی ان تینوں فرائض کو مختلف الترکیب اور زیادہ تر جداگانہ و آزاد جماعتوں کو سپرد کرنے سے اس دستور نے خلاف قانون ظلم و زیادتی سے افراد کی آزادی کو محفوظ کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسی جمعیت اکو جو قوم کی نمائندہ تھی جماعت مقننہ کا ایک حقیقی جز و بنا دیا۔ اس دستور سے کم و بیش یہ اطمینان ہو گیا کہ کم از کم قوم کے ایک اہم جز و کی پسندیدگی کے بغیر کوئی قانون منظور نہ ہو گا اور خاصکر کوئی محصول عائد نہ کیا جائے گا۔

مونٹسکیو کے زمانے کے انگریزی دستور میں بلکہ در حقیقت "روح القوانین" کی اشاعت کے اسّی برس بعد تک، نمایندگی کے اصول پر بہت ہی ناکمل طور پر عمل ہوتا تھا، اس نمایندگی کی نسبت اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ایک حد تک اس کی خرابیوں کا انسداد ایک وسیع اور مناسب حق رائے دہی سے ہو گیا ہے، تو پھر اس صورت میں ایک ایسا دستور حاصل ہو جاتا ہے جس میں اگر عمومی اقتدار اعلیٰ کا تخیل تمام و کمال عمل پذیر نہ ہو تو پھر بھی اتنا تو ضرور ہے کہ بالواسطہ شکل ہی سے سہی مگر ایک حد تک وہ اس طرح حاصل ہو گیا ہے کہ وضع قوانین و اجرائے محصول پر نمایندہ جمعیت کا اقتدار قایم ہے اور عاملانہ حکومت پر بایں طور روک قایم ہو گئی ہے کہ اس جمعیت سے قوم کی منظوری لینا ضروری ہو۔ اس کے ساتھ ہی شمول جوری عہدہ داران عدالتی کی آزادی، اور مقدمے سے پیشتر کسی کے گرفتار کرنے اور قید کرنے کی بابت حکومت عاملانہ کے اختیار کی قطعی تحدید سے قانون کی حکومت اور افراد ملک کی آزادی کی موثر حفاظت مستحکم ہو گئی تھی۔

پس یہ ایک مختصر بیان سیاسی ارتقا کے اس آخری نتیجے کا ہے

جو مغربی یورپ کی سلطنتوں میں سے بیشتر میں حاصل ہو سکا ہے۔ جیسا کہ میں ظاہر کر چکا ہوں یہ طرز ایک بہت ہی وسیع الاختلاف طرز ہے، اور جس تخیل کا ابھی ابھی خاکہ کھینچا گیا ہے اس کے عملی حصول کی بابت بھی اُس کے مدارج میں بہت فرق ہے۔ اجمالاً یہ کہ انگلستان و جرمنی گویا وہ دو نقطہائے قطبی ہیں جن کے اندر ہی اندر یہ اختلافات و تنوعات واقع ہوتے ہیں اور یہ صرف حکومت کی شاہی شکل تک محدود نہیں ہے، اس کے سب سے زیادہ حقیقی خصایص جمہوری فرانس کی موجودہ حکومت میں پائے جاتے ہیں[1]

ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے دستوروں میں مونٹسکیو اور روسو دونوں کے تخیل معقول حد تک عمل پذیر ہو جاتے ہیں، مگر مجھے اس میں یہ اضافہ کرنا چاہئے کہ روسو میری اس رائے سے منکر ہو جاتا، وہ اسے لازمی خیال کرتا کہ قوم کے اقتدار اعلیٰ کا نفاذ براہ راست ہونا چاہیئے نہ کہ نمایندوں کے توسط سے بالواسطہ، وہ کہتا ہے کہ "انگلستان کے لوگ صرف پارلیمنٹی انتخابات کے اوقات میں آزاد ہوتے ہیں،"[2] میں اسے اس وجہ سے بیان کرتا ہوں کہ زمانۂ حال کی دو قوموں نے جن میں عمومی خیالات پوری طرح ترقی کر گئے ہیں، انھوں نے روسو کے تخیل کی جانب بہت اہم قدم اٹھائے ہیں، اول تو ممالک متحدہ امریکہ ہے جہاں کے دساتیر کی رو سے معمولی قانون سازی کو محدود کر دیا گیا ہے، دوسرے سویٹزرلینڈ ہے جہاں مراجعہ جاری ہے یعنی نمایندگان جو قوانین وضع کرتے ہیں انھیں جملہ رائے دہندگان کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔

یہ دونوں وفاقیتیں ہیں اور سردست مجھے وحدانی مملکتوں کی دستور سازی سے بحث ہے جو وفاقی مملکتوں سے بالکل ممیز ہیں۔ میں تفصیل کے ساتھ اس کا بیان

---

[1] ۔ مقابلہ کیجئے میری تصنیف مبادی سیاسیات Elements of Politics باب بست و دوم فقرہ ۵۔

[2] ۔ انگریزی قوم کا خیال ہے کہ وہ ایک آزاد قوم ہیں، لیکن انہیں بہت بڑا دھوکہ ہوا ہے اس لئے کہ وہ صرف پارلیمنٹ کے انتخاب عام میں حصہ لینے کے زمانے میں آزاد ہوتے ہیں۔ "معاہدۂ معاشرتی"، کتاب ۳، باب ۱۵۔

نہیں کروں گا، اپنے حدود کار کے اندر میرا ایسا کرنا، بیکار تاریخوں کا طومار اور بے
کیف بیانات کا جمع کرنا ہے، مگر میں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ فرانس اس میں پیش پیش
تھا اور انیسویں صدی کے وسط تک کے تجربات میں وہی سب سے زیادہ بیباک
اور دوسری سلطنتوں پر اثر اندازی میں سب سے بڑھا ہوا تھا یعنی اصلاح و انقلاب
کے فریق کو جوش و تحرک فرانس ہی سے حاصل ہوتا تھا۔ انقلاب کے نازک زمانے
متعلقہ مختصر الحیات آئینی تجربے، قومی مطلق العنانی کی طرف گامزنی، اس مطلق العنانی
کے خلاف یورپ میں ردعمل، اور فرانس میں یورپ کے دباؤ سے رجعت شاہی یہ سب
منزلیں یکے بعد دیگرے طے ہوتی رہیں مگر ان سب کے بعد بھی انیسویں صدی کے
ربع ثانی میں فرانس سیاسی تخیلات کے میدان کا خاص مرکز اثر بن گیا تا آنکہ (سنہ ۱۸۴۸ء
کی) دوسری جمہوریت کے بعد پھر دوسری شہنشاہی قایم ہوگئی، اس وقت مغربی
یورپ میں فرانسیسی طریقوں کے متعلق یہ عام بدگمانی پھیلی کہ ان طریقوں سے
آزادی اور نظم و امن کے متحد کرنے کے غایت المرام تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور
تیسری جمہوریت (سنہ ۱۸۷۰ء - سنہ ۱۸۷۵ء) جس کی بنا تباہی و ابتری پر رکھی گئی تھی
قرب و جوار کی قومیں توصیف آمیز ہمدردی سے دیکھنے کے بجائے ہنوز زیادہ تر
سرد مہری و استعجاب سے دیکھ رہی ہیں۔

۲۔ اس تحریک کے ساتھ انگلستان کا تعلق کلیتہً مختلف نوعیت کا رہا ہے
جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، انگلستان نے حکومت کی اس شکل کا خاص نمونہ مہیا کیا جو
اس تمام کشمکش و تصادم کے بعد انجام کار میں نتیجہ کے طور پر حاصل ہوئی، اور جیسا کہ
ہمیں اس خیال کے اظہار کا موقع مل چکا ہے، قبل ازیں کہ یہ انگریزی دستور نمونے
کے طور پر کام میں آئے خیالات کی اس تحریک میں اسے جگہ مل چکی تھی جس کا مرکز
فرانس تھا کیونکہ اس تحریک میں ایک خاص عنصر وہ مقابلۂ باہمی ہے جسے بعض باشندہ
فرانسیسی مصنفوں نے (جن میں اول والٹیر اور بعد ازاں مونٹسکیو کا درجہ ہے) فرانس
کی فقدان آزادی اور اس آزادی کے درمیان قایم کیا ہے جسے انھوں نے
اٹھارھویں صدی کے وسط میں واقعاً انگلستان میں دیکھا تھا۔ درحقیقت ہم
کہہ سکتے ہیں کہ برطانی دستور (بالخصوص مونٹسکیو کے زیر اثر) واقعہ سے نکالکر

تخیل کے عالم میں داخل کر دیا گیا، مگر اس طرح جو تخیل قائم کیا گیا وہ اس وقت کے واقعہ کی ٹھیک ٹھیک نمایندگی نہیں کرتا تھا، اور جیسا کہ ہم آخری خطبہ میں دیکھ چکے ہیں اس وقت واقعہ کی جو صورت ہے اس سے بالکل ہی غیر مشابہ تھا، واقعہ یہ ہے کہ انگلستان کے ۱۶۸۸ء کے انقلاب کا آخری نتیجہ اس انقلاب کے اصل مقصد سے بالکل مختلف ہوا۔

آخری نتیجہ اس نظم کی صورت میں ظاہر ہوا ہے جسے بحث "دو کابینی حکومت" کہتا ہے، جس میں عاملانہ اختیارات عملاً دونوں ایوانوں کی ایک ذیلی مجلس کے ہاتھ میں ہیں جس کا انتخاب ان کا سر گروہ یعنی وزیر اعظم کرتا ہے اور خود اپنی باری میں اس کا تعین معمولی حالات میں عملاً دار العوام کی کثرت رائے سے ہوتا ہے جو اسے اور اس کے شرکا کو جب چاہے برطرف کرا دے، بشرطیکہ وہ انتخاب کنندگان کی جانب رجوع کرے۔ وزیر اعظم اس ایوان کے بالکلیہ مطیع و منقاد ہو جانے سے اس طرح محفوظ ہے کہ اسے ایوان کو برطرف کر دینے کا اختیار حاصل ہے۔ موروثی بادشاہ اور دار الامراء دونوں کے اختیارات بھی غیر اہم نہیں، ان کا درجہ محض ثانوی ہے، امرا اپنے ایوان کے ذریعہ سے وضع قوانین کو روک سکتے ہیں، لیکن عملاً وہ اس کا دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ کسی مسئلہ کے اہم خصوصیات پر (جس کے متعلق دار العوام کی رائے انتخاب کنندگان کی قطعی کثرت رائے سے صریحاً و حتماً ہم آہنگ ہو) دار العوام سے بہ تقابل پیش آئیں گے، وہ صرف ضروری تاخیر، غور مکرر اور انتخاب کنندگان کی جانب رجوع کرنے کے دعویدار ہیں۔ بادشاہ کو یہ حق حاصل ہے کہ اسے ہر معاملہ کا علم ہو اور ہر معاملہ پر اس سے گفتگو کی جائے اور اس گفتگو ہی کے ذریعہ سے وہ اہم فیصلوں پر اثر ڈال سکتا ہے۔ نیز اسے یہ اہم اختیار بھی حاصل ہے کہ دار العوام کو برطرف کر دے اور اس طرح یہ تحقیق کرے کہ آیا کابینہ یعنی دار العوام کے فریق غالب کو حقیقتاً قوم کی تائید حاصل ہے یا نہیں[1]۔ مگر حکمتِ عملی کی رہبری وزیر اعظم و کابینہ کے ہاتھ میں ہے۔ موجودہ

[1] یعنی بادشاہ کے لئے یہ امر خلاف آئین نہ ہوگا کہ وہ اپنے وزرا کو اس حالت میں بھی

امور متنازعہ فیہ میں یہ سب باتیں مسلمہ ہیں۔

مگر جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، حکومت کی یہ شکل اُس شکل سے بالکل ہی مختلف ہے جس کا پیدا کرنا ۱۶۸۸ء کے انقلاب سے مقصود تھا، اور جس سلسلۂ عمل سے تدریجاً یہ صورت واقع ہو رہی تھی اسے ایک مدت تک دقیق النظر مبصروں نے بھی نامکمل طور پر محسوس کیا تھا۔ انقلاب کا مقصود یہ تھا کہ قانون سازی میں پارلیمنٹ کو فوقیت حاصل ہو جائے مگر اس کا یہ مقصود نہیں تھا کہ عملاً دارالعوام کے فریق غالب کو حکام عاملانہ کے مقرر کرنے کا اختیار دیدیا جائے بلکہ یہ بھی مقصود نہیں تھا کہ دارالعوام کو یہ قدرت حاصل ہو جائے کہ وہ اپنے وضع کردہ قوانین کو بادشاہ پر (جس کی منظوری ہنوز باضابطہ طور پر مسودات پر لازمی تھی) بزور علید کر سکے۔ لاک کی صاف رائے یہی ہے (اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں ملکی حکومت پر اس کی تصنیف کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اس میں ۱۶۸۸ء کے انقلاب کا نظریہ بیان کر دیا گیا ہے) لاک کے نزدیک، بادشاہ حکام عاملانہ کا اصلی سرگروہ ہے، نظم و نسق میں اسے حقیقی فوقیت حاصل ہے اور جس پر ہیئت عضو کا کام قانون سازی ہے وہ حقیقتاً اس نظم کا ایک رکن ہے۔ لاک کی تمام بحث کا ماحصل یہ ہے کہ وہ قانون سازی میں فایق نہیں ہے، یعنی اس کا فرض یہ ہے کہ جو قوانین پارلیمنٹ متعین کرے ان کی تصدیق کر دے، اور اگر اس قسم کے قانون کو وہ معلق یا معطل کر دے تو یہ گویا اپنے اختیار کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

اور اگر آپ بادشاہ کے حقوق کے متعلق بلیکسٹن (۱۷۶۵ء) کے بیان کو دیکھیں تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ اس کی نسبت نہ صرف سمجھ لیا گیا ہے کہ "جنگ و صلح،

بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ۔ برطرف کر دے جبکہ انھیں مجلس نیابتی میں کثرت رائے حاصل ہو، اور ان کے بجائے دوسرے وزیر مقرر کرے جو بعد ازاں اس امید میں مجلس کو برطرف کر دیں کہ نئے انتخاب سے پارلیمنٹ کے اندر فریقوں کا توازن بدل جائیگا"۔ ملاحظہ ہو مصنف کی "مبادی سیاسیات" باب بست و دوم صفحہ ۴۳۹ (طبع ثانی) اس بحث پر اسی خطبہ کے دوسرے حصہ میں جو بحث کی گئی ہے، ان کے متعلق بھی اس باب کو دیکھ سکتے ہیں۔

[مدیر]

معاہدات و محالفات کی نسبت اپنے تنہا حق امتیازی کے ذریعہ سے، معاملات خارجہ کا چلانا اس کا کام ہے بلکہ داخلی معاملات میں بھی، جماعت مقننہ کے شریک کار، فوج کے سپہ سالار اعظم، انصاف و اعزاز کے سرچشمہ، اور کلیسا کے سرگروہ ہونے کے لحاظ سے اس کے اختیارات کے حدود بہت ہی وسیع ہیں بلیکسٹن یہ سمجھتا ہے کہ دارالعوام کو ان اختیارات کے ناواجب استعمال کے روکنے کا موقع وزرا پر مقدمہ چلانے کے ذریعہ سے حاصل ہے مگر بلیکسٹن کی تصنیف کے کسی پڑھنے والے کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آئے گا کہ ان اختیارات کا ماحصل ایک ایسی کمیٹی کے ہاتھ میں چلا گیا ہے جس کا انتخاب وہ سرگروہ کرتا ہے جسے خود دارالعوام کے فرقۂ غالب نے منتخب کیا ہو اور جیسا کہ ہم آخری خطبہ میں دیکھ چکے ہیں حقیقت یہ ہے کہ یہ تغیر بلیکسٹن کے زمانہ میں مکمل بھی نہیں ہوا تھا، مگر جس شے نے اس وقت تک بادشاہ کو یہ قوت دے رکھی تھی کہ وہ دارالعوام میں توازن قایم رکھے وہ حق الحاق نہیں تھا، جو عملاً متروک ہو چکا تھا بلکہ یہ وہ اثر تھا جو بادشاہ دارالعوام کے ارکان پر عمل میں لاتا تھا، یہ کچھ تو اس رائے کے باقیات کی وجہ سے تھا جو قانون کے اندر شاہی حکمرانی کی جانبدار تھی (اور یہ حالت بالخصوص ٹوری فریق کی تھی) مگر زیادہ تر یہ اثر منصبوں اور وظیفوں کی مستحکم ترغیبات کی وجہ سے تھا۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس آخرالذکر منبع کا لابدی ہونا ہیوم کے پرسکون مگر گونہ لاابالیانہ مشاہدات سے صاف ظاہر تھا جس نے رشوت کے خلاف غوغا کرنے والوں سے یہ کہا تھا کہ وہ اس قوت پر حملہ کر رہے ہیں جس سے نظام سلطنت کا توازن برقرار ہے اور اگر یہ رشوت بند ہو گئی تو انگریزی نظام کے جمہوریت تامہ کی جانب مائل ہو جانے میں کوئی روک نہ رہے گی[1] مگر مونٹسکیو پر یہ امر صاف واضح نہیں ہوا، مونٹسکیو جس دستور کی مدح سرائی کرتا تھا، وہ، دستور وہ تھا جو سرکاری طور پر مسلم تھا نہ کہ وہ جس پر عمل ہو رہا تھا۔ اس کی خاص خوبی اس امر میں مضمر سمجھی جاتی تھی کہ اس میں اختیارات کی تقسیم اس طرح کر دی گئی ہے کہ کسی ایک حصے کو ایسا مطلق العنانہ

[1] - ہیوم خطبۂ ششم۔

غلبہ نہیں حاصل ہو سکتا جس سے انفرادی آزادی کو خطرہ ہو، برخلاف ازیں کابینی حکومت کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں پارلیمنٹ کی ایک چھوٹی سی ذیلی جماعت کے اندر جسے دار العوام کی کثرت رائے کا اعتماد حاصل ہو جاتا ہے تشریعی و عاملانہ فرائض کا عملاً گہرا اتحاد ہو گیا ہے۔ کابینی حکومت کے تحت میں جماعت مقننہ و جماعت عاملانہ کی جو زبردست روک ایک دوسرے پر واقعاً قائم ہے وہ اس سے بالکل ہی دوسری نوعیت کی ہے جس کا خیال بھی مونٹسکیو کے ذہن میں آیا ہو۔

یہ غلط فہمی تاریخی حیثیت کے لحاظ سے اس وجہ سے اہمیت رکھتی ہے کہ بلیکسٹن اور مونٹسکیو نے جس طرح پر برطانی دستور کا تصور پیدا کیا تھا اسی حیثیت سے وہ امریکی دستور کے بانیوں کے سامنے تھا، اور یہ ان کے لئے محض نمونہ نہیں تھا بلکہ وہ ایک طرز تھا جس کی خوبیوں کی وہ نقل کر سکتے اور اس کے نقائص کو بچا سکتے تھے اور فی الحقیقت اگر امریکی دستور کا برطانیہ کے دستور کے مختلف مدارج سے مقابلہ کیا جائے تو ہمیں یہ نظر آئے گا کہ بہت بڑی حد تک یہ نتیجہ حاصل ہو گیا ہے۔ امریکی صدر جمہوریہ کو حقیقتاً وہ حق امتناع حاصل ہے[1] جو مدتوں سے انگلستان کے بادشاہ کے اختیار میں محض رسماً رہ گیا ہے۔ رئیس جمہوریہ حقیقتاً اپنے وزرا کو مقرر و برطرف کرتا ہے، جماعت عاملہ کے فیصلے درحقیقت اُس کے فیصلے ہیں نہ کہ ان وزراء کے اور اس غرض سے کہ وہ اس اختیار سے ایوان نمایندگان یا مجلس سینا پر قابو حاصل کرنے کا کام نہ لیکے، اس کے وزرا ان ایوانوں میں بیٹھنے سے ممنوع قرار دئے گئے ہیں۔

مگر مغربی یورپ کی سلطنتوں میں جہاں آئینی دستور حکومت زیادہ تر انیسویں صدی کی پیداوار ہے، وہاں اکثر صورتوں میں اس ارتقا کے دوسرے درجہ یعنی کابینی حکومت کو اختیار کیا گیا ہے۔ اگرچہ دونوں مدارج کے درمیان صاف فرق کے نہ ہونے کی وجہ سے حکمران کے اختیار کسی قدر غیر معین و مختلف

---

[1] البتہ موتمر کی دو ثلث کثرت رائے اس اختیار کو بیکار کر سکتی ہے۔

رہ گئے ہیں۔ درحقیقت جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں آئینی بادشاہی انھیں دو طرزوں کے درمیان کم و بیش حائل رہی جو وسیع معنی میں بلنچلی کے "صحیح" و "باطل" طرزوں کے مرادف ہیں، مگر انھیں جرمانی و انگریزی کہنا زیادہ مناسب ہوگا (انگریزی سے مراد جدید انگریزی طرز ہے کیونکہ جرمانی طرز تو قدیم انگریزی طرز کے بہت ہی مشابہ ہے) ان میں سے ایک موروثی بادشاہ واقعاً حکام عاملہ کا سرگروہ ہے، اگرچہ قانون سازی و اجرائے محصول کے لئے جمعیت نیابتی کی منظوری شرط ہے۔ دوسرے میں اہم و خاص عاملانہ اختیار کابینہ کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں جس کی صدارت اس فریق کا سرگروہ کرتا ہے جسے جمعیت نیابتی میں کثرت حاصل ہوتی ہے۔

یہ ملحوظ رہے کہ چونکہ اس فرق کا مدار کار زیادہ تر رواج و رائے پر ہے، قانون پر نہیں ہے، اس لئے ہمیشہ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کسی خاص وقت میں کوئی خاص دستور کس طرز سے زیادہ قریب ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر بادشاہ کا اعتماد کسی ایسے وزیر اعظم پر ہو جسے ملک کا اعتماد[1] اور جمعیت نیابتی کی مسلمہ کثرت کی تائید بھی حاصل ہو تو اس صورت میں یہ صاف عیاں نہیں ہوتا کہ اختیارات کس جانب واقع ہیں۔ سوال یہ ہے کہ بادشاہ اگر وزیر کو برطرف کرنا چاہے اس حالت میں کیا صورت پیش آئے گی اور یہ ہم اسی وقت کہہ سکتے ہیں جب اس کا وقت آ جائے[2] امر بحث طلب یہ نہیں ہے کہ کسی خاص وقت میں بادشاہ کالعدم ہے اور وزیر مختار کل ہے کیونکہ مطلق العنان بادشاہی میں بھی کسی کمزور بادشاہ کے تحت میں اکثر ایسی صورت پیش آجاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر بادشاہ وزیر کو برطرف کرنا چاہے تو آیا وہ وزیر اتنا قوی ہوگا کہ بادشاہ ایسا نہ کر سکے۔

---

[1] ۔ جارج سوم کے عہد میں ولیم پٹ (ولیم اصغر) کی حالت یہی تھی اور زمانۂ حالیہ جرمنی میں بسمارک کی یہی کیفیت تھی۔

[2] ۔ علاوہ ازیں، اگر ایک مرتبہ اس کا تجربہ کیا جائے اور اس میں ناکامی ہو تو بھی یہ ہو سکتا ہے کہ دوسری مرتبہ زیادہ مناسب موقع سے کارروائی کرنے سے اس میں کامیابی ہو جائے۔ اس طرح اختیار کا پلہ کبھی ادھر کبھی ادھر جھکتا رہے گا۔

۳- اس کہنے سے کہ انگریزی طرز رائج الوقت طرز ہے، میں نسبتاً غیر اہم جزوی اختلافات کو نظر انداز کر دیتا ہوں۔ مثلاً ایک اختلاف ایوان اعلیٰ کے متعلق ہے، یہ ایوان اگر ایوان ادنیٰ کے منظور کردہ قوانین سے مسلسل اختلاف کرے تو انگلستان میں اس کا تدارک نئے امرا کے بنانے سے ہو سکتا ہے مگر براعظم کی اکثر سلطنتوں میں یہ صورت نہیں ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ظاہرا اس میں جتنا خلاف معلوم ہوتا ہے عملاً اتنا نہیں ہے کیونکہ براعظم کے امرا میں مقاومت کی زیادہ قوت ہی نہیں ہے، وہاں اصلی کشمکش ملوکیت و عمومیت کے درمیان ہے۔

لیکن وسیع معنی میں، جسے میں نے انگریزی طرز کہا ہے اس کی نقل عملاً بلجیم میں ہو گئی ہے، جس نے ساٹھ برس سے زائد تک انگریزی نوع کی دستوری بادشاہی کے عملدرآمد کی بہت ہی منضبط و قطعی مثال پیش کی ہے، اور ۱۸۴۸ء سے ہالینڈ میں بھی یہ طرز اختیار کر لیا گیا ہے۔ پرتگال میں انیسویں صدی کے ربع ثانی میں انقلابات کا طوفان برپا رہا، کبھی وہ پیچھے ہٹتا تھا اور کبھی آگے بڑھتا تھا مگر میرا قیاس یہ ہے کہ ۱۸۵۲ء کے بعد سے اس نے پرامن پارلیمنٹی حکومت اختیار کر لی ہے جس میں یہ اصول عملاً قبول کر لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹی فریق غالب کا سرگروہ وزیر اعظم ہوا کرے، نیز، سارڈینیا کے ۱۸۴۸ء والے دستور کا عمل بھی اسی اصول پر رہا ہے اور اسی دستور کو ۱۸۶۰ء اور ۱۸۷۰ء کے مابین بقیہ حصص اطالیہ پر وسعت دیگئی ہے۔ ۱۸۷۶ء کے بعد سے اسپین کے متعلق بھی یہی کہا جا سکتا ہے، مگر انیسویں صدی کے پہلے تین ربع میں اس کے سیاسی ارتقاء میں خصوصیت کے ساتھ ابتری و ناپائداری برپا رہی۔

پس رومانی ملکوں میں علی العموم ہم بے شک و شبہہ پارلیمنٹی طرز حکومت کو شایع دیکھتے ہیں اور فرانس کے سوا ہر جگہ یہ طرز شاہی صورت اختیار کئے ہوئے ہے، ہر جگہ پارلیمنٹ دو ایوانی طریق پر ترتیب دی گئی ہے، مگر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ برسر اقتدار وزرا کو لازمی تائید ایوان نیابتی سے یعنی اس ایوان سے حاصل ہوتی ہے جس میں نیابت براہ راست اور سادہ طریق سے ہو میں نے یہ آخری الفاظ اس لئے استعمال کئے ہیں کہ ایک اطالیہ کو مستثنیٰ کر کے اور تقریباً تمام جگہوں میں،

مجلس سینات یا ایوان اعلیٰ کے ارکان کا تقرر کلاً یا جزاً انتخاب سے ہوتا ہے۔
اس انتخاب کی مختلف شکلیں ہیں، بلجیم میں سینا یتوں کا انتخاب زیادہ تر وہی
انتخاب کنندگان کرتے ہیں جو ابتدائی ایوان نیابتی کا انتخاب کرتے ہیں،
مگر قابل انتخاب اشخاص کی تعداد زیادہ مرفہ الحال قلیل التعداد افراد تک محدود
ہوتی ہے۔ اسپین میں جہاں نصف سینات انتخاب سے مقرر ہوتی ہے،
وہاں بھی قابل انتخاب ہونے کا تعین ایک حد تک آمدنی کی بنا پر ہوتا ہے مگر
یہ ضروری ہے کہ سینائی نے ملکی، فوجی، اور پیشہ کے متعدد کاموں میں سے
کوئی کام انجام دیا ہو، کسی جامعہ کی معلّمی بھی انھیں کاموں میں داخل ہے، لیکن یہاں
مجلس سینات کے انتخاب کنندگان ایوان نمایندگان کے انتخاب کنندے
نہیں ہوتے بلکہ یہ جداگانہ انتخابی جماعتیں ہوتی ہیں جن میں منجملہ اور جماعتوں کے
صوبے کی مجالس کے ارکان بھی داخل ہوتے ہیں۔ اسی طرح فرانس میں بھی سینا یتوں
کا انتخاب مقامی حکمراں جماعتوں کے ارکان کو حاصل ہوتا ہے مگر وہاں قابل انتخاب
ہونے کے لئے آمدنی کی شرط نہیں ہے۔ ہالینڈ میں بھی صوبے کی حکومتیں انتخاب
کرتی ہیں مگر قابل انتخاب ہونے کا حق زیادہ متمول اشخاص تک محدود ہو جاتا ہے
اطالیہ میں سینا یتوں کی نامزدگی مدت العمر کے لئے ہوتی ہے۔

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ جزئیات معاملۂ زیر بحث کو اور پیچیدہ نہ بنا دیں میں نے
ان کی تفصیل دو مطالب پیدا کرنے کی غرض سے کی ہے۔ اول، یہ کہ انگریزی
نمونے کی نقل میں دار الامرائی نقل کی نوبت نہیں آئی بجز اس کے کہ جہاں تک
رومانی ملکوں کا تعلق ہے، صرف ایک اسپین میں کسی حد تک اس کی نقل ہوئی
ہے، دوسرے یہ کہ مختلف قوموں کا طریق کار بہت ہی مختلف و مغائر ہے یہ اختلافات
اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ غالباً ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کسی قوم نے بھی
ایوان بالائی کے بنانے کے مسئلہ کو نمایاں کامیابی کے ساتھ حل نہیں کیا ہے۔
شاید ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس اصول کی طرف میلان پایا جاتا ہے کہ جو لوگ
خود منتخب ہوئے ہوں (خاص کر حکومت کے منتخب شدہ صوبجاتی مجالس کے
اراکین) وہ (ایوان ثانی کا انتخاب کریں، اور اب اس اصول کی نسبت زیادہ قطعی

صورت میں یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ وفاقی مجالس مقننہ جو دو ایوانی طریق پر مرتب ہوئی ہیں ان میں بالعموم اس اصول کا انطباق ہوا ہے[۱]۔ جب ہم اسکنڈینیوی سلطنتوں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، تو سوئیڈن میں بھی ہمیں یہی اصول نظر آتا ہے۔ مغربی یورپ کی سلطنتوں میں سے صرف ناروے کی سلطنت ایسی ہے جہاں ایوان بالائی ایوان زیریں کی جانب سے اور اسی میں سے منتخب ہوتا ہے مگر یہ بھی خیال کرنے کی بات ہے کہ سوئیڈن اور ناروے دونوں میں اور خاص کر ناروے میں جماعت مقننہ کی دو ایوانوں میں تقسیم اور جگہوں کی بہ نسبت کم مکمل ہے، چنانچہ ناروے میں دونوں ایوانوں میں جس قانون کے متعلق عدم اتفاق ہو جائے، اس پر آخری رائے دینے کے لئے وہ یکجائی کارروائی کرتے ہیں اور سوئیڈن میں یہ طریقہ مالی معاملات کے ایسے الجھاؤ کو روکنے کے لئے عمل میں آتا ہے جو دونوں ایوانوں کے مابین پیدا ہو گیا ہو۔

نیز، حق رائے دہی کی وسعت کے متعلق بھی انگلستان کے نمونے کی تقلید نہیں کیجاتی، اس معاملے میں تو انگلستان رہبری کرنے کے بجائے خود برا عظمی تحریک کے پیچھے پیچھے گھسٹتا چلتا ہے۔ تقریباً تمام مقاموں پر اس تحریک کا میلان ہمہ گیر حق رائے دہی کی طرف ہے۔

۴۔ دوسری طرف، انگلستان کے عدالتی طریق کی بہت ہی اہم تقلید کی گئی ہے، اول تو جوری کے معاملہ میں، لیکن اس موقع پر دیوانی و فوجداری کے مقدمات میں فرق کرنا ضروری ہے، جہاں تک مجھے معلوم ہے سلطنت متحدہ سے باہر دیوانی مقدمات میں جوری کا طریقہ صرف پرتگال میں اختیار کیا گیا ہے، لیکن فوجداری کے مقدمات میں مغربی یورپ کی اکثر سلطنتوں میں اس کا شیوع ہو گیا ہے اور اسے آزادی کی ضمانتوں میں سے ایک اہم ضمانت سمجھا جاتا ہے اور دستوری حکومت کا مطالبہ زیادہ تر اس آزادی ہی کے لئے ہوا ہے۔

نیز، وہ عدالتی تحفظ جس نے انگلستان کے اندر اہل ملک کی انفرادی آزادی پر

---

[۱] ۔[مصنف آسٹریلوی دولت عامہ کے قیام کے دیکھنے تک زندہ نہ رہا۔]

حکامِ عاملانہ کی دست درازیوں کو بہت خوبی کے ساتھ روکا ہے اسے بھی مختلف صورتوں میں اور مختلف حد تک کم و بیش نقل کیا گیا ہے، مگر یہاں ہمیں مختلف ممالک خاص کر انگلستان و فرانس کے اندر تقسیمِ اختیار کے اصول کی تاویل کے بارے میں نمایاں فرق بلکہ قطعی اختلاف کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے اور یہ بھی عجیب بات ہے کہ دونوں مغائر رائیں ایک ہی اصول کے ارادۂ صادق کے ساتھ عمل میں لانے سے پیدا ہوئیں اور دونوں رائیں ایک طرح پر مونٹسکیو ہی سے ماخوذ ہیں جو تاریخی اعتبار سے پہلا شخص تھا جس نے افرادِ ملک کے تحفظ کے اصول کی اساسی اہمیت کی جانب پہلے توجہ دلائی ؎۱

مونٹسکیو کے اصول کی تاویل انگلستان میں ہمیشہ یہ کی گئی ہے کہ اہلِ ملک کی قانونی آزادی کے تحفظ کے لئے چاہئے کہ ایک خاص عضوِ حکومت یعنی جماعتِ مقننہ، قانون مرتب کرے، دوسرا عضوِ حکومت یعنی محکمۂ عدلیہ یہ فیصلہ کرے کہ آیا خلاف ورزی قانون ہوئی ہے یا نہیں اور تیسرا یعنی جماعتِ عاملہ، اس مادی قوت کی تنظیم و ہدایت کرے جو قانون کی اطاعت حاصل کرنے کے لیے درکار ہو اور قانون کو عمل میں لانے کے لئے دوسرے جو کام ضروری ہوں انھیں بھی عمل میں لائے، نیز چاہئے کہ ان تینوں کو مناسب حد تک آزادی حاصل ہو۔ لیکن یہ مناسب آزادی کیونکر حاصل ہو یہ ایک مشکل مسئلہ ہے اور مونٹسکیو نے یہ رائے دی ہے کہ جدید قوانین کے لئے حکامِ عاملہ کی منظوری لازمی قرار دینا چاہئے تاکہ جماعتِ مقننہ کو حکامِ عاملہ کے معاملات میں غیر ضروری مداخلت سے روکا جا سکے پس جس بنا پر تقسیمِ کار کا مطالبہ کیا جاتا ہے اسی کا اقتضا یہ ہے کہ تقسیم مکمل نہ ہو، مگر حکامِ عدالت کے ساتھ حکامِ عاملہ کے تعلق کے بارے میں اس اصول کا انطباق انگریزوں کی

؎۱ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ خاص امرِ زیرِ بحث کے متعلق مونٹسکیو کی رائے مجھے بالکل ہی مبہم معلوم ہوتی ہے درحقیقت اس نے اپنی تصنیف "دو برطانی دستور"، کے مشہور باب (کتاب یازدہم باب ششم) میں اس پر صریحی طور پر بحث نہیں کی ہے مگر اس کا عام خیال بالیقین یہ ہے کہ "خود رایانہ جور و ستم کو روکنے کے لئے اختیاراتِ حکومت مختلف ہاتھوں میں رکھے جائیں"۔

نظر میں ایک سیدھی اور صریحی بات معلوم ہوتی ہے۔ بڑا اہم سوال یہ ہے کہ حکام عاملانہ قانون کے حدود کے اندر رکھے جائیں، یہ سوال کہ آیا اسی جماعت کے کسی رکن یا کسی ماتحت نے ان حدود سے تجاویز کیا ہے یا نہیں، اسے خود حکام عاملانہ کے فیصلے کے لئے نہ چھوڑنا چاہئے، یہ انگریزوں کے نزدیک بدیہی امر ہے۔ "کسی شخص پر اعتماد نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اپنے معاملے میں بے لوث منصف ثابت ہوگا" اس لئے انگریز یہ دلیل لاتے ہیں کہ ان سوالات کا فیصلہ ایک آزاد محکمۂ عدلیہ کے سپرد ہونا چاہئے۔

لیکن فرانسیسیوں کی تاویل اس سے قطعی مخالف ہے۔ چنانچہ مسٹر ڈائیسی نے اس مسئلے کے متعلق اپنی تصنیف "قانونِ دستوری" (حصۂ دوم باب دوازدہم) میں یہ لکھا ہے کہ "تقسیم اختیارات" کے فقرے کی تاویل جس طرح، فرانس کی تاریخ، فرانس کے قوانین اور فرانس کی عدالتوں کے فیصلوں سے ہوئی ہے اس کے معنی اس سے زیادہ یا کم کچھ نہیں ہیں کہ اس اصول کو برقرار رکھا جائے کہ جس طرح جج ناقابلِ برطرفی اور اس لئے حکام عاملانہ سے آزاد ہونا چاہئے، اسی طرح حکومت اور اس کے عہدہ دار (جب سرکاری حیثیت سے کام کرتے ہوں) وہ بھی معمولی عدالتوں کے حیطۂ اختیار سے خارج اور ایک حد تک آزاد ہوں"، اسی سلسلہ میں وہ (ڈائیسی) کہتے ہیں کہ اس طرح مونٹسکیو کے اصول مسلمہ کا "دور انقلاب کے فرانسیسی مدبرین نے غلط انطباق کیا، ان لوگوں کی قوت فیصلہ پر دو امور سے خراب اثر پڑ گیا تھا، ایک تو ان دقتوں کا علم تھا جو سلطنت کے معاملات میں فرانسیسی پارلمان کی دخل دہی سے پیدا ہوتی تھیں اور دوسرے انہیں مرکزی حکومت کے اختیارات بڑھانے کی روایتی خواہش تھی"۔ نتیجہ یہ ہوا کہ "انفرادا" اہلِ ملک اور حکومت اور اس کے عمال کے تعلقات کے انضباط کے لئے مخصوص قوانین کے ایک پورے مجموعہ کی ضرورت پیش آگئی جو ان قوانین سے مختلف تھے جو افراد کی ذاتی حیثیت سے ان کے تعلقات باہمی پر حاوی ہیں"، اور عام طور پر یہ کہنا چاہئے کہ جسے انتظامی قانون، کہتے ہیں اس کے کسی معاملہ سے معمولی عدالتوں کو کوئی تعلق نہیں ہے۔ اہلِ ملک کی ذاتی حیثیت سے ان کے شخصی حق کے تمام مسائل اور

جرم کے تمام الزامات دیوانی عدالتوں کے حیطۂ عمل میں داخل ہیں مگر عام ججوں کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ چھوٹے بڑے کسی عہدہ دار کے کسی فعل پر (جو اس نے نیک نیتی کے ساتھ سرکاری حیثیت سے انجام دیا ہو) کوئی فیصلہ صادر کر سکیں۔ کسی عہدہ دار کے ادائے فرائض میں اگر کسی شخص کو (ذاتی حیثیت سے) کوئی نقصان پہنچے تو وہ اس کی رفعداد کے لئے انتظامی عدالتوں کی طرف رجوع کرے۔

ان عدالتوں کی بابت مسٹر ڈائیسی یہ کہتے ہیں کہ "ان نام نہاد عدالتوں" نے ابھی حال میں ایک طرح کی نیم عدالتی حیثیت حاصل کر لی ہے مگر ہمیں ہوشیار رہنا چاہئے کہ ہم نام سے مغالطے میں نہ پڑ جائیں۔ وہ انتظامی حکام جو قانون انتظامی کے معاملات کے متعلق تمام تنازعات کا فیصلہ کرتے ہیں، انھیں "محکمہ" کہنا زیادہ مناسب ہے، وہ ضابطے کی وہ صورتیں اختیار کر سکتے ہیں جو "عدالتوں" کے طرز پر ہوں مگر وہ سب کے سب سرکاری اشخاص پر مشتمل ہوتے ہیں اور قانون انتظامی کے معاملات کو دیوانی عدالتوں کے قبضے سے نکال لینے کی حمایت میں جو عذرات پیش کئے جاتے ہیں، ان عذرات ہی میں یہ مقدر ہے کہ جو تنازعات ان سرکاری اشخاص کے سامنے آتے ہیں وہ ان پر حکومت کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کا تصفیہ ان جذبات کے ساتھ کرتے ہیں جو عام طور پر ججوں کے احساس قلبی سے مختلف ہوتے ہیں"۔

پس، آپ دیکھتے ہیں کہ "تقسیم اختیارات" کے مسئلہ کو فرانسیسی انگریزوں سے کس درجہ مختلف سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عدالتی طور پر اس امر کا فیصلہ کرنا کہ حکومت عاملانہ کا کوئی رکن یا ماتحت قانونی حدود کے اندر رہا ہے یا نہیں، اسے عاملانہ فرائض سے الگ کر لینا چاہئے"۔ فرانسیسیوں کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ "عدالتی طور پر اہل ملک کے انفرادی حقوق باہمی کے تنازعات کے فیصلے کو اس امر کے فیصلہ کرنے کے فرض سے جدا رکھنا چاہئے کہ آیا حکومت عاملانہ کے ارکان یا ماتحتوں نے قانون کی خلاف ورزی کی ہے یا نہیں۔ اس لئے یہ موخر الذکر فرض خاص انتظامی "محکمات" کو تفویض ہونا چاہئے"۔ مجھے تو بالیقین یہی واضح معلوم ہوتا ہے کہ

انگریزوں کی تاویل مونٹسکیو کے خیالات کے عام میلان سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔[1]

---

[1] لیکن اس سے لازماً یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ مونٹسکیو کے خیالات سے الگ ہو کر خوبی کار اور ترکیب سیاسیہ کی عام بناؤں کے موافق فرانسیسی نقطۂ نگاہ کی حمایت میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ملاحظہ ہو مسٹر دائیسی کی کتاب صفحہ ۳۲۶ - ۳۲۸ - (طبع چہارم) اور میری تصنیف "مبادی سیاسیات" باب بست و چہارم فقرہ ۸۔

خطبۂ بست و نہم

وفاقیت جدیدہ

۱۔ میں نے اپنے آخری دو خطبات میں وحدانی مملکتوں میں دستور سازی کی تاریخ کے خصوصیات مختصراً بیان کئے ہیں، اور ان دونوں صورتوں کا فرق دکھایا ہے جن کے بین بین، وہ واقعی نظامہائے سلطنت واقع ہیں جو عام طور پر دستوری بادشاہی کے نام سے مشہور ہیں۔ بعض صورتوں میں جیسا کہ انگلستان میں ہے وہ طرز حکومت قایم ہے جسے دستوری بادشاہی کی شکلوں کے تحت میں پارلیمنٹی حکومت کہنا چاہیئے اور بعض صورتوں میں اس طرز دستوریت اور اس شاہی میں ہنوز کشمکش جاری ہے جسے صحیح دستوری بادشاہی یا محض دستوری بادشاہی کہنا چاہیئے جس میں بادشاہ صاحب تاج و تخت بھی ہوتا ہے اور کار فرما بھی ہے۔ برخلاف ازیں جرمنی میں اختیار کی باگ ابھی تک بے قیل و قال مضبوطی کے ساتھ موروثی بادشاہ کے ہاتھ میں ہے۔ صرف فرانس کی ایک صورت ہے جس میں پارلیمنٹی حکومت شاہی شکل کے اندر نہیں بلکہ جمہوری شکل کے اندر قایم ہے لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ ابھی ہم پر اس طرز کے اس نوع کی کامیابی و استقامت اس درجہ صاف طور پر عیاں نہیں ہوئی ہے کہ اس نوع کی جانب دلکشی کی قوت منسوب کر سکیں یا یہ پیشینگوئی کر سکیں کہ مغربی یورپ کی دوسری سلطنتیں بھی اغلباً فرانس کی نقل کرینگی۔ زمانے کے آثار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اغلباً آنے والی نسل کے مدبروں کی خاص توجہ

اندرونی نظم سلطنت کی صورت کے تغیر کے مسایل کے بجائے زیادہ تر فرائض حکومت کی وسعت کی طرف منعطف رہے گی۔

تاہم، میرے سامعین کے دل میں یہ خیال آیا ہو گا کہ جدید دستوری بادشاہی کی دو شکلوں کو انگریزی و جرمانی طرز قرار دیکر مقابلہ کرنے میں میں نے ان دونوں ملکوں کے (جنھیں نمونہ کے طور پر منتخب کیا گیا ہے) ایک اہم فرق کو نظر انداز کر دیا ہے یعنی یہ کہ جرمنی دستور وفاقی ہے اور انگلستان کے دستور کا یہ حال نہیں ہے۔ سہولت مقابلہ کی کسی غرض سے یہ کہنا چاہئے کہ انگلستان، فردی مملکت ہے۔ لیکن درحقیقت میں نے اسے نظر انداز نہیں کیا ہے، البتہ اتنا تھا کہ میرے استدلال کے لئے اس جانب اشارہ کرنا ضروری نہیں تھا۔ وجہ یہ ہے کہ جس امر پر مجھے زور دینا تھا یعنی جو وزرا عاملانہ فرائض کو انجام دیتے ہیں اور قانون سازی و موازنہ کے لئے جس مجلس نیابتی کی منظوری کی ضرورت ہے ان دونوں کے ساتھ بادشاہ کا تعلق کیا ہو، یہ امر جرمانی شہنشاہی اور اس کی خاص خاص ترکیب وہ سلطنتوں بالخصوص پروشیا میں زیادہ تر ایک ہی سا ہے۔ پس وفاقی طریق سے فرائض کی جو تقسیم لازم آتی ہے اس پر اس کا کوئی قوی اثر نہیں پڑتا۔ ولیم ہوہنزولرن خواہ شہنشاہ جرمنی کی حیثیت سے کارروائی کرتا ہو، خواہ شاہِ پروشیا کی حیثیت سے دونوں صورتوں میں وہ خود اپنے وزرا کا تقرر کرتا ہے اور نیابتی مجلس خواہ وفاقی کی ہو یا پروشیا کی، وہ بادشاہ پر کسی ایسے وزیر اعظم کے مسلط کرنے کی کوشش نہیں کرتی جسے عملاً اس مجلس کے فرقۂ غالب نے منتخب کیا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جب ہم مغربی یورپ کے سیاسی تغیر کے مجموعی نتیجہ پر بحث کر رہے ہوں تو جس شے کو میں نے جرمنی کی "وفاقیت" کہا ہے (یعنی آسٹریا سے باہر جرمانی ریاستوں کا بعض اعتراض خاص کر خارجی معاملات و جنگ کے لئے ایک وسیع تر مجموعہ میں متحد ہو جانا اور اس کے ساتھ داخلی و ملکی قانون سازی و نظم و نسق کے بہت سے اہم معاملات میں اپنی آزادی کو برقرار رکھنا) یہ شے نہایت قابل لحاظ بن جاتی ہے۔

ہمیں یہ بھی غور کرنا ہے کہ اسی سے کسی قدر مشابہ مگر زیادہ پیچیدہ طرز کی

وفاقیت آسٹریا میں بھی پائی جاتی ہے ۔ یہ پیچیدگی اس وجہ سے ہے کہ آسٹریا و ہنگری میں ایک بالکل ہی خاص قسم کا اتحاد ہے اور اس پر یہ مستزاد ہو گیا ہے کہ ہنگری سے علیحدہ آسٹریا جن دوسرے صوبجات یا ممالک پر مشتمل ہے ، ان صوبوں کی مقامی "مجلس ملی" اور آسٹریا کی شہنشاہی "مجلس ملی" کے درمیان تشریعی فرائض کی تقسیم ہو گئی ہے ۔ پس اس طرح آسٹریا کے معاملات کے لئے تین مباحثی جماعتیں ہیں (۱) ایک قسم کی ثنائی جماعت ہے یعنی مساوی تعداد کی دو "وفود" "ڈیلیگیشن" آسٹروی اور ہنگروی پارلیمنٹوں کی جانب سے منتخب ہوتی ہیں جو ایک ہی وقت میں مگر بالعموم علیحدہ علیحدہ آسٹریا اور ہنگری کے مشترکہ مفاد کے مسائل پر غور کرتی ہیں ، باہم گفت وشنود کرتی اور کبھی کبھی یکجا ملکر کام کرتی ہیں ۔ (۲) آسٹروی شہنشاہی "رائخسراٹ" (۳) بوہیمیا ، آسٹریا میٹر دل وغیرہ کی مقامی "مجالس" ہیں اسی کے مطابق عاملانہ فرائض کی بھی تقسیم ہے ۔ اس کے بعد پھر خود ہنگری کے معاملات میں اور بھی زیادہ عجیب قسم کی وفاقیت داخل ہو گئی ہے جو اس حکومت خود اختیاری کے مشابہ ہے جس کے اجرا کی تجویز سلطنت متحدہ میں پیش ہے ۔ شاید مجھے یہ کہنا چاہیئے کہ وہ "سوراج" کی اس شکل کے مشابہ نہیں جس کی آئرلینڈ کیلئے واقعاً یہاں تحریک ہوئی تھی بلکہ اس شکل کے مشابہ ہے جو نیابتی حکومت کے عام اصولوں سے بہت زیادہ مطابقت رکھتی ہے یعنی ہنگری کے ایک خاص حصہ کروشیا میں ۱۸۶۷ء سے ایک جداگانہ پارلیمنٹ قائم ہو گئی ہے اور جن معاملات کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا ہے ان کا تعلق تاج ہنگری کے جملہ زیر نگیں ممالک سے ہے ، ان معاملات کے ایک جزو کی بابت یہی پارلیمنٹ قوانین وضع کرتی ہے ، اور باقی اس قسم کے معاملات کے متعلق بوداپسٹ کی ہنگروی پارلیمنٹ میں قوانین وضع ہوتے ہیں جس میں کروشیا بھی اپنے نمایندے بھیجتی ہے کروشیا کے نمایندے ہنگروی پارلیمنٹ میں جملہ امور پر رائے نہیں دیتے بلکہ صرف ان امور پر رائے دیتے ہیں ، جو کروشیا کی پارلیمنٹ میں جداگانہ طور پر وضع نہیں ہوتے ۔

پس آپ دیکھتے ہیں کہ جس شے کو میں وفاقی اصول کہتا ہوں ، اس کے عملدرآمد کی یہ کس قدر پیچیدہ صورت ہے ، وفاقیت سے مقصود حکومت کے بعض اغراض کے لئے چند قوتوں کا اس طرح متحد کرنا ہے کہ بعض دوسرے اہم اغراض کیلئے

ان کی جداگانہ حیثیت و آزادی قایم رہے۔ میں اس قسم کی مبہم اصطلاحات اس وجہ سے استعمال کرتا ہوں کہ مختلف صورتوں میں اختیار کی تقسیم مختلف طور پر کی گئی ہے، مگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی وفاقیت کا رواج ہوتا ہے وہاں مرکزی حکومت کو جو معاملات تفویض کیے جاتے ہیں، ان میں خارجی معاملات کا جملہ انتظام یا ان کا بیشتر حصہ اس کو تفویض کر دیا جاتا ہے۔

شمالی یورپ یعنی سکینڈنیویا میں ایک ثنے مملکت بھی ہے جو سویڈن اور ناروے سے ملکر بنی ہے۔ اگرچہ یہاں کا رشتۂ اتفاق اس رشتہ کے مقابلہ میں بہت ہی کمزور ہے جس نے آسٹریا اور ہنگری کو ملا رکھا ہے۔

۴۔ آخر میں سوئزرلینڈ میں وفاقیت کی وہ مشہور تاریخی مثال ملتی ہے جو ازمنۂ وسطیٰ سے ازمنۂ جدیدہ تک بالکل ہی غیر منقطع طور پر چلی آئی ہے اور جدید یورپی تاریخ میں اپنی آپ مثال ہے۔ تسلسل ارتقا کے اعتبار سے وفاقی طرز میں سوئزرلینڈ کی وفاقیت کا تقریباً وہی رتبہ ہے جو وحدانی طرز میں انگلستان کا ہے، اور ازمنۂ وسطیٰ میں سوئزرلینڈ وفاقیہ کا نشو و نما اور اس کا ارتقا موخر زمانہ کی یورپی تاریخ میں ایک ایسا واقعہ ہے جس کی افسانہ نما دلچسپی اس جد و جہد کی ہمسری کرتی ہے جو یونانیوں اور رومانیوں سے اپنے غیر ملکی دشمنوں کے خلاف ظہور میں آئی تھی۔ ۱۲۹۱ء میں اوری، شویتز اور انٹر والڈن کے کسانوں نے باہمی اتحاد قائم کیا جس کی غرض اولاً سیاسی آزادی نہیں تھی، کیونکہ یہ لوگ شہنشاہ کے ساتھ اپنی وفاداری کو بے خلل قائم رکھنا چاہتے تھے وہ یہاں تک کہ وہ اپنے ملک کے اندر شہنشاہ کے ماتحت جاگیری امرا کے حقوق کو بھی برقرار رکھنا چاہتے تھے بلکہ یہ اتحاد ان مخلصین یا متوسطین کے ظلم و جور کے خلاف گویا ایک دفاعی مخالفہ تھا، جو جاگیری امرا کی جانب سے کاربرداز تھے۔ ۱۳۱۵ء میں ان دہقانی سپاہیوں نے لیوپولڈ (شہنشاہ آسٹریا) کی جاگیری فوج کو ملورگارٹن کی بلندیوں سے پتھر اور درختوں کے تنے لڑکا لڑکا کر تباہ کر دیا۔ پھر اس کامیاب عہدیت نے جاگیری امرا کے اقتدار کی بیخ کنی شروع کی، اور جب اس کے ہمسایوں نے اس میں شرکت چاہی تو ۱۳۵۳ء میں یہ آٹھ ریاستوں کی لیگ

کی صورت میں بدل گئی جس میں برن اور زیورش کے آزاد شہنشاہی شہر بھی داخل تھے، بعد ازاں پچیس برس بعد، یہ وسعت یافتہ عہدیت، زمپاخ کی مشہور جنگ میں آسٹریا کی ایک دوسری فوج پر (جو ایک دوسرے لیوپولڈ کی سرکردگی میں تھی) مظفر و منصور ہوئی اور اس فیروزمندی نے عملاً اسے خاندانِ ہاپس برگ کی سیادت سے آزاد کر دیا۔ یہ تمام باتیں ان لوگوں کے حافظے میں جمی ہوئی ہیں جو ہنوز نا فرسودہ مگر قدیم طرز و خیال کے ساتھ اس جستجو میں تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں کہ ایسی قوموں اور ایسے واقعات سے روشناس ہوں جن سے ان میں ہمدردی پیدا ہو۔ پھر اس دو بہادرانہ چودھویں صدی" کے بعد وہ صدی آئی جو اخلاقاً اس درجہ قابلِ وقعت نہیں ہے مگر خوشحالی کے اعتبار سے اس سے کم نہیں ہے۔ اس صدی میں عہدیت نے فتوحات کئے اور اپنی حفاظت کو اپنے کمزور ہمسایوں تک وسعت دی، یہاں تک کہ چارلس برگنڈنوی (۷۶-۱۴۷۷ء) کے ساتھ ایک کامیاب جنگ کے بعد اس کا فوجی اقتدار تمام یورپ میں اس طرح قائم ہو گیا کہ اس کے بعد جو اطالوی لڑائیاں پیش آئیں ان میں ہر جانب یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ اول درجے کے اجیر سپاہیوں کے لئے سوئیزرلینڈ سب سے افضل وا قدم معدن و مخزن ہے۔ پندرھویں صدی کے اختتام تک یہ اقطاع جرمانی شہنشاہی کے عملاً آزاد ہو گئے اور ۱۶۴۸ء میں ان کی آزادی کا باضابطہ اعلان ہو گیا۔ یہ سولھویں صدی کے اوائل ہی میں یہ آٹھ سے بڑھ کر تیرہ ریاستیں ہو گئی تھیں، اور ان کے ساتھ ان کے ماتحت علاقے بھی تھے۔ یہ ریاستیں دورِ اصلاح کی کشاکش سے بغیر کسی قسم کی شکست و ریخت کے گزر گئی تھیں۔ وفاقی اصول نے اس وقت تک جو قوت حاصل کر لی تھی اس کا یہ ایک حیرت انگیز ثبوت تھا۔ اس کے بعد سے اٹھارھویں صدی تک پھر کوئی بڑا تغیر نہیں ہوا۔

مگر اس دوران میں یہ عہدیت کسی نوع سے یکرنگ یا عمومی نہیں تھی، چودھویں صدی کے وسط سے یہ عہدیت بہت ہی متغائر دساتیر والی ریاستوں کی ایک لیگ تھی، جس میں چند زرعی کینٹن اور برن کی طرح چند ایسے شہر شامل تھے جن میں عہدیت کے محدود کرنے کا تھوڑا بہت میلان پایا جاتا تھا جس پر میں ازمنۂ وسطیٰ کے شہری نظامِ سلطنت کے ارتقا کی آخری صورت کی بحث میں

نظر ڈال چکا ہوں)[1]۔ شہروں کے ساتھ جو دیہاتی قطعات ملے ہوئے تھے، انھیں وہ نظر حقارت سے دیکھتے تھے، اور خاص کر برن کی شہری عدیدیت اپنے ماتحت اقطاع پر سختی کے ساتھ حکومت کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فرانس کی انقلابی تحریک کو یہاں ایسے عناصر ملگئے جنھوں نے ذوق وشوق سے اس کا خیر مقدم کیا، اور قدیمی عہدیت کا ۱۷۹۸ء میں زوال ہوگیا۔ اس وقت پہلی اور آخری مرتبہ اصول وفاقیت کا خاتمہ معلوم ہوتا تھا، اور واحد و غیر منقسم "جمہوریہ ہیلویتیہ" کا اعلان ہوگیا۔ مگر وفاقی روایت بہت قوی تھی چنانچہ ۱۸۰۲ء میں نپولین کو اس کے سامنے دبنا پڑا اور اس نے کسی حد تک وفاقیت کو بحال کردیا، اور ۱۸۱۵ء میں کچھ اس قسم کا ردعمل ہوا جس سے سابق دستور ایک حد تک بحال ہوگیا۔

اس کے بعد ۱۸۴۸ء میں ایک جدید وفاقی دستور قائم کیا گیا جو ایک بڑی حد تک ایک نئے نمونے یعنی ممالک متحدہ امریکہ کے طرز پر تھا۔ اب یہاں پہنچکر سوئیزرلینڈ اور انگلستان کے تشابہ کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ سوئیزرلینڈ وفاقی اصول کا قطعی نمونہ نہیں پیش کرتا، یہ نمونہ ممالک متحدہ امریکہ پیش کرتا ہے۔ پس یورپی سیاسی ارتقا جن وفاقیتوں کے بروئے کار آنے کا باعث ہوا ہے ان سب میں اہم ترین یعنے امریکی وفاقیہ کی جانب میرا خیال رجوع ہوتا ہے، اس کی اہمیت بالخصوص اس ملک کی وسعت کی وجہ سے ہے جس پر اس اصول کا عملدرآمد ہوا ہے، مگر اس کے متعلق میں کچھ اور آگے چل کر ذکر کروں گا۔

۳۔ سوئزرلینڈ کے دستور کے ارتقا کا یہ خاکہ میں نے اس کی اس حیرت فزا یا افسانہ وار دلچسپی کی وجہ سے نہیں دیا ہے جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے بلکہ (جیسا میں کہہ چکا ہوں) یہ خاکہ اس وجہ سے پیش کیا ہے کہ انگلستان کے مانند سوئیزرلینڈ بھی ازمنۂ وسطی سے ازمنۂ جدیدہ تک نظم سلطنت کے ایک خاص طرز کے عجیب وغریب مسلسل دستوری ارتقا کا ایک نمونہ ہے حالانکہ اس قسم کے دوسرے متعدد نمونے اپنی بقا میں ناکام ہوگئے ہیں۔

---

[1] خطبۂ شانزدہم، ہفدہم، بستم

یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ سوئزرلینڈ کے صوبوں اور شہروں کا اتحاد اپنے پہلے دور میں کوئی منفرد یا مخصوص واقعہ ہے، پہلے دور سے میرا مقصود چودھویں اور پندرھویں صدیوں سے ہے جب کہ یہ ریاستیں شہنشاہی فوقیت کو پوری طرح تسلیم کرتی تھیں۔ برخلاف ازیں، اس دور میں سترھویں صدی کے بعد ہی جب یہ صاف عیاں ہو گیا کہ مقدس رومانی شہنشاہی جرمنی و اطالیہ میں بحالی نظم و امن کی سعی میں ناکام ہو گئی تو اس دور میں (بشرط ضرورت بزور اسلحہ) مشترک اغراض و حقوق کی حمایت کے لئے وفاقیتیں قایم ہوئیں (جیسا کہ مجھے سابق کے ایک خطبے میں ظاہر کرنے کا موقع مل چکا)! آپ شمالی جرمانی شہروں کی "ہمسائی لیگ" پیش نظر رکھئے جس نے ۱۳۷۰ء تک اسکینڈینیوی سلطنتوں کے خلاف کامیاب جنگ کی تھی، اور جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس سے کم مشہور مگر اسی قسم کے شہروں کے اور بہت سے معاقدات تھے نہ صرف شہروں کے بلکہ چھوٹے امرا بڑے امرا کی دست درازیوں کے خلاف اس قسم کے معاقدے قائم کر لیتے تھے بلکہ یہ میلان اور آگے بڑھتا اور امیروں اور شہروں میں اسی قسم کے معاقدے ہو جاتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ از منۂ وسطی کے نیابتی ادارات جس حد تک نیچے سے اٹھنے والے تحریکات پر مبنی تھے (جیسا کہ جرمنی میں زیادہ تر تھا)، اسی حد تک ہم ان کی نسبت یہ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے مقاصد جاگیری نوعیت کے تھے لیکن جرمنی جب ملکی سلطنتوں کی صورت میں بکھر گئی اور اس جاگیری ارتباط میں روز بروز برابر ضعف آتا گیا جو ان سلطنتوں کو شہنشاہی کے اندر مربوط کئے ہوئے تھا، تو پھر انجام کار میں جس دستور کی صورت میں اس کا نتیجہ ظاہر ہوا، اس صورت میں جاگیری حیثیت ملکی سلطنتوں کی شاہی سرگروہی حیثیت کے سامنے مٹ گئی۔

پس جہاں تک شہروں کا تعلق ہے، سوئزرلینڈ کی عہدیت ایک منفرد واقعہ ہونے کے برعکس ہے مگر زرعی کینٹنوں کی یہ حالت نہیں تھی۔ جرمنی کے بیشتر حصص میں کسانوں میں آزادانہ اتحاد کی تحریک نہیں تھی، اس لئے کہ نظم معاشرت کے جاگیری تنظیم کے باقیات نے انھیں بہت زور کے ساتھ دبا رکھا تھا۔ سوئزرلینڈ کے علاوہ جو مستثنیات ہیں ان کی توجیہ بھی سوئزرلینڈ ہی کی طرح ملک کی حالت و نوعیت سے ہو سکتی ہے۔ کسانوں کی آزادانہ جماعتوں کی ترقی و اتحاد کے لئے آلپس کے

کوہستان یا فریزستان و ڈتمارشش کے سواحل زیادہ مناسب معلوم ہوتے تھے لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سمندر کی حفاظت پہاڑ کی حفاظت کی بہ نسبت کم مؤثر تھی فریزستان میں آزاد عمومیت اور وفاقی دستور کے تخم برباد ہو گئے اور ڈتمارشن میں بھی جو عام رفتار حالات میں بحری استثنا تھا، یہ صورت استثنا سولھویں صدی میں ختم ہو گئی۔

لیکن سمندر اور فریزلینڈ کے ذکر سے آپ کو یہ یاد آیا ہوگا کہ میں نے ایک یورپی سلطنت کو حذف کر دیا ہے جس میں ایک مدت تک وفاقی دستور موجود تھا، اور یہ موجودگی اس کی تاریخ کے ایک ایسے دور میں تھی (جس کی حیرت فزا جد وجہد دجو فتحمندی اور شاندار کامیابی پر ختم ہوئی) اس کی دلچسپی سویزرلینڈ کی جد وجہد کی ہمسری کرتی ہے۔ میرا یہ اشارہ لازماً ولندستان یا یہ کہ متحدہ نشیبستان کی طرف ہے۔ میں نے یورپی وفاقی اصول پر نظر ڈالتے وقت اسے اس وجہ سے ترک کر دیا تھا کہ انیسویں صدی میں ندرلینڈز کی وفاقیہ آثار باقیہ سے زیادہ نہیں تھی وہاں کا دستور زیادہ تر معمولی دستوری بادشاہی ہے، صرف اتنا ہے کہ قدیم متحدہ صوبہ جات کو جو کسی وقت میں ذی اقتدار ومتحد تھے، کسی قدر وسیع اختیارات اور اعلیٰ اعزاز حاصل تھے۔ اس لئے میں ان کے وفاقی نظم سلطنت کی تکوین اور طبقات مجتمعہ (اسٹیٹس جنرل) پر جو وفاقی آلۂ کار تھا، اور شاہ نما (اسٹیٹ ہولڈر) کے پیچیدہ وتغیر پذیر تعلقات پر درجہ بدرجہ بحث نہ کروں گا، اٹھارھویں صدی میں آخر الذکر کو غلبہ ہوتا جاتا تھا۔ میں متحدہ ندرلینڈز کی کشاکش کی تاریخ میں بھی نہیں پڑوں گا، یہ تاریخ سویزرلینڈ کی تاریخ سے زیادہ دلچسپ ہے کیونکہ ولندیزوں کو مسلسل کامیابی حاصل نہیں ہوئی، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خشکی پر اسپین کے مقابلے میں (جو انھیں زیر کرنے کی کوشش کر رہا تھا)، وہ علانیہ کمزور تھے۔ یہ بھی صاف عیاں ہے کہ جس طرح اہل سویزرلینڈ، اپنے پہاڑوں کی وجہ سے بچے اسی طرح یہ لوگ اپنے سمندر کی وجہ سے بچے مگر یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سمندر کا تحفظ نسبتہً کم مکمل ہے۔ یہ صاف ظاہر ہے کہ اس دستور کو وفاقی جمہوریت کی شکل سے نکال کر شاہی محدود کی شکل میں لانے کے لئے جس امر کا خاص زور پڑا وہ جنگ کا

خطرہ مزید تھا۔

۴۔ اب اس کا موقع آگیا ہے کہ ہم وفاقی اصول کے تصور، اس کی ترویج واشاعت کے حسب خواہ شرائط اور وفاقی مملکت کے امتیازی خصوصیات پر زیادہ دقت نظر سے غور کریں۔

میں اس کے آغاز میں یہ خیال ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ جرمانیوں نے "وفاقی مملکت" (Bundes Staat) اور "عہدیت ممالک" (Staaten bund) کے تصور میں تمیز پیدا کرنے میں اپنی ساری ذہانت وفطانت صرف کر دی ہے مگر میرا خیال یہ ہے کہ ان دونوں کے درمیان صریحی وقطعی امتیاز کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے، تاہم میں ان تمام ممکنہ فرقوں پر بحث نہیں کرنا چاہتا جو ان دونوں کے درمیان قائم کئے جا سکتے ہیں، نہ میں قطعی طور پر یہ معین کرنا چاہتا ہوں کہ جو قومیں بہ ارادۂ دوام آپس میں اتحاد قائم کر سکتی ہیں ان کا انفرادی اقتدار اعلیٰ کس حد پر پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے، خاصکر جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ سویزرلینڈ کی وفاقیہ نے کسی قسم کے اقتدار اعلیٰ کا دعویٰ ایک طویل زمانہ گذرنے کے بعد ہی کیا ہو۔ ہمارے نقطۂ نظر سے اس امر پر خیال کرنا زیادہ اہم ہے کہ جب ایسی قوموں کے اتحاد سے جو پہلے خود مختار تھیں کوئی وفاقیہ وجود پذیر ہوتی ہے تو جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے اسی قدر یہ اتحاد زیادہ مربوط ہوتا جاتا ہے اور حالات زیادہ متعین ومستحکم ہوتے جاتے ہیں، اور کس طرح عہدیت ممالک اور وفاقی مملکت کے ان دونوں تصورات سے وفاقیت کے ارتقا میں مختلف مدارج کا اظہار ہوتا ہے، آگے چل کر میں یہ بتاؤں گا کہ اگرچہ مذکورۂ بالا طریق وفاقی اصول کی ترویج کا سب سے اہم طریقہ ہے مگر یہی ایک تنہا طریقہ نہیں ہے، لیکن یہاں میں اپنے کو صرف ایسے ہی اتحادات پر غور کرنے تک محدود رکھوں گا جو نسبتاً زیادہ پائدار حالت میں ہیں اور جن پر وسیع مفہوم میں "وفاقی مملکت" کی اصطلاح کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

میں ابتدا ہی میں یہ ظاہر کر دینا چاہتا ہوں کہ وفاقی مملکت مرکب سلطنت کی صرف ایک نوع ہے۔ جیسا کہ میں اپنی تصنیف "مبادی سیاسیات" (Elements of Politics) میں کہہ چکا ہوں، جس مملکت میں ایسے اجزا شامل ہوں جن میں کسی نہ کسی وجہ سے

سیاسی علیحدگی کا وقوف ایک نمایاں حد تک پہونچ گیا ہو، اس کو مرکب مملکت کہہ سکتے ہیں، خواہ اس کے اجزا کی حکومتیں باقاعدہ طور پر ایک ہی اعلیٰ جماعت مقننہ کے اس حد تک زیر نگرانی ہوں کہ اس کے دستور کو رسمی طور پر دو دوبارا نیا دستور کہہ سکتے ہوں۔ جو مملکت اس طرح پر مرکب ہو اگر وہ کسی عمومی حکومت کے تحت میں ہو اور اس کی اعلیٰ مجلسی جماعت مقننہ کا انتخاب اس کی قلمرو کے صرف ایک جزو کے باشندے کرتے ہوں، یا وہ مجلس صرف ایک ہی جزو قلمرو کے باشندوں پر مشتمل ہو، تو اس صورت میں اس مملکت کے دوسرے اجزا بالعموم اس حصہ کے توابع کہلاتے ہیں جس کے سامنے مجلسِ مقننہ باضابطہ جوابدہ ہوتی ہے، اور عملاً اسی قسم کا فرق حکومت کی اور دوسری شکلوں میں بھی ہو سکتا ہے خواہ اس کے باشندوں کے حصہ کثیر کے رسمی آئینی دستوری حقوق مملکت کی تمام قلمرو میں یکساں ہوں، مثلاً مطلق العنان بادشاہی کے تحت میں اگرچہ مملکت کا کوئی حصہ باضابطہ طور پر کسی دوسرے حصہ کا ماتحت نہیں ہو سکتا مگر عملاً ایسا ہو سکتا ہے۔ بادشاہ ایسا کر سکتا ہے کہ اپنے اعلیٰ ماتحتوں کا انتخاب کلیتہً یا بیشتر اپنے زیرِ نگیں ممالک کے ایک ہی حصہ سے کرے اور خود عملاً تمامتر اسی حصہ کی رائے عامہ کے زیرِ اثر ہو۔ تبعیت کی یہ صورت خواہ باضابطہ ہو یا صرف عملاً، اس سے بددلی کا پیدا ہونا لازمی ہے اور اغلب یہی ہے کہ جو قومیں حکومت عمومی کی عادی ہوں اور تہذیب و تمدن میں اپنے کو اس حاوی قوم کے برابر خیال کرتی ہوں، وہ دائماً اس ماتحتی پر رضامند نہ رہیں گی البتہ اس صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ ان کی وسعت میں بہت ہی زیادہ فرق ہو، یا یہ کہ سیاسی حقوق سے دست برداری کا معاوضہ معاشی فوائد سے ہو جاتا ہو، لیکن پھر اس صورت میں ظن غالب یہ ہے کہ اس سے مملکت کے حاوی حصے کے باشندوں کا رشک و حسد بھڑک اٹھے گا۔ پس جب تک کہ اس قسم کی مرکب مملکت میں ایک حصہ اپنی وسعت و قوت کے لحاظ سے دوسرے حصص پر بے اندازہ غالب نہ ہو اس وقت تک یہ میلان رہے گا کہ اس کے اجزا کے مابین سیاسی امتیازات میں کم و بیش مساوات پیدا ہو جائے، اور اس کے ساتھ اگر یہ عام خواہش بھی ہو کہ مجموعۂ اعظم میں اتحاد کے ساتھ ہی، اجزائے سیاسی علیحدگی کی طرف سے بھی اطمینان ہو جائے تو اس صورت

یہ مزید سیلان بھی پیدا ہو جائے گا کہ حکومت کلی اور حکومت جزوی کے فرائض کے درمیان ایسے دستور کے ذریعہ سے تفریق کر دی جائے جس میں کل مجموعہ کی مشترک جماعت مقننہ کے ترمیم کرنے کی مجاز نہ ہو، یا کم از کم یہ کہ قانون سازی کے معمولی طریق عمل سے اس میں تغیر نہ ہو سکتا ہو۔

میرا خیال یہ ہے کہ وفاقی مملکت کے متعلق زمانۂ جدید کا جو اندازہ کیا جاتا ہے اس کے حقیقی اوصاف وہی ہیں جو اوپر بیان ہوئے، یعنی وہ ایک مجموعہ ہے جو اجزا سے مرکب ہے، یہ اجزا سیاسی حیثیت سے کم و بیش مساوی الرتبہ ہیں اور مجموعہ کی حکومت اور اجزا کی حکومت کے درمیان حکومتی فرایض کے متعلق دستوری طور پر صاف و قطعی اور اس کے ساتھ ہی متوازن و مستحکم تقسیم قائم ہے، لیکن تاریخی حیثیت سے آخرالذکر وصف بعد میں حاصل ہوا ہے۔ تاریخی وفاقیتوں کی ممتاز مثالوں میں ہم مدت تک اس قسم کی صاف و قطعی دستوری تقسیم اختیارات نہیں دیکھتے، اگرچہ اجزا ایک مجموعہ کے اندر پر زور طور پر متفق ہونے کے ساتھ ہی عملاً اپنی خود مختاری پر بھی قائم تھے۔ اس لئے تقسیم اختیار میں صفائی و قطعیت کی بہ نسبت کسی حد تک توازن اختیار زیادہ حقیقی و لازمی ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر اس قسم کی صاف تقسیم نہیں ہے تو پھر اجزا اور مجموعہ کی حکومتوں کے درمیان ناچاقی و تصادم کا خطرہ اور وفاقی مملکت کے انصافی توازن اختیار کے برقرار رکھنے کی دشواری صاف عیاں ہے۔ پس انیسویں صدی میں جبکہ دستوری خیالات اچھی طرح ترقی کر گئے ہیں، معمولی جماعت مقننہ جو اُن معاملات پر قوانین وضع کرتی ہے جنھیں آئینی تقسیم اختیارات کے بموجب اجزائی ریاستوں کے لئے محفوظ نہیں کیا گیا ہے، اور (بالفاظ آسٹن) اس غیر معمولی جماعت مقننہ کے درمیان جسے اساسی دستور کی تبدیلی کا اختیار حاصل ہوتا ہے، ان دونوں کے درمیان اس تقسیم کی برقراری بالطبع اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ امتیاز بھی شامل رکھتی ہے۔ یہ فرق فردی مملکت میں بھی پیدا ہو سکتا ہے مگر کسی منتظم و ہم آہنگ وفاقی مملکت کی طبعی حفاظت صرف اس طرح سے ہو سکتی ہے۔

اس سے وفاقی مملکت کے بقاء و قیام کے متعلق ایک عجیب الاختلاف نتیجہ پیدا ہوتا ہے، ایک جانب تو اجزا کی بڑھی ہوئی خود مختاری سے اس کا سیلان

یہ ہوتا ہے کہ وحدانی مملکت کی بہ نسبت اس میں ارتباط کم ہو جائے، یعنی اگر نا چاقی پیدا ہو تو اس کے اجزا زیادہ آسانی و سہولت کے ساتھ الگ ہو سکتے ہوں۔ شمالی امریکہ کی خانہ جنگی (۱۸۶۱ء تا ۱۸۶۵ء) سے یہ امر بہت واضح ہو گیا ہے۔ اگر ممالک متحدہ امریکہ کی حیثیت وحدانی مملکت کی ہوتی اور اس کے ایک حصہ میں غلامی رائج ہوتی تو بھی بیشک خانہ جنگی برپا ہو سکتی تھی مگر اس صورت میں یہ دشوار تھا کہ باغی ایسے مستحکم مجموعات میں کٹ کٹ کر الگ ہو جاتے جیسے ظاہری ترتیب و انتظام کے ساتھ جنوبی ریاستوں نے یکے بعد دیگرے اپنے کو اتحاد سے الگ کرنے کی قرار دادیں منظور کیں، اور شمالی ریاستیں دم بخود دیکھتی کی دیکھتی رہیں، دوسری طرف جب تک اختلال و انتشار کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک دستور غیر معمولی طور پر مستحکم رہتا ہے، اس کی مثال بھی ممالک متحدہ امریکہ سے ملتی ہے، جہاں دستور سلطنت میں ترمیم کے لئے وفاقی ریاستوں کے تین ربع کی منظوری کی ضرورت ہوتی ہے، اس سے سو برس تک تقریباً کسی قسم کی ترمیم نہ ہو سکی بجز اس کے کہ خانہ جنگی کی وجہ سے حبشیوں کی رائے دہی کے معاملہ میں ایک عظیم الشان تغیر کرنا پڑا۔

مجموعہ کی مرکزی حکومت اور اجزا کی جداگانہ حکومت کے درمیان فرائض کی تقسیم لازماً مختلف نوعیت کی ہوتی ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ خارجی تعلقات کے لئے وفاقیہ مختار کار اور داخلی معاملات کے لئے ہر جزو کو مختار ہونا چاہیئے، مگر اس سے (۱) یہ اصول نہیں طے ہوتا کہ جو مسائل اجزا کے لئے خارجی حیثیت رکھتے ہیں اور مجموعے کے لئے داخلی حیثیت رکھتے ہیں ان کا تصفیہ کیونکر ہو، اس سے مراد وہ مسائل ہیں جن کا تعلق اجزا کے روابط باہمی سے ہے، مثلاً آپس میں آزادانہ تجارت کا مسئلہ۔ (۲) بعض مسائل ایسے ہیں جو ظاہری اعتبار سے اجزا کے لئے داخلی مسائل ہیں مگر اس اعتبار سے کہ ان میں عدم اتحاد کی وجہ سے فساد یا دقت نہ پیدا ہو جائے مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ انھیں مجموعے کی حکومت کے ہاتھ میں چھوڑ دیا جائے۔ (مثالاً) اس صنف میں ضرب مسکوکات، افلاس، اجارہ جات ایجاد، اور بالعموم تجارتی قانون، تعزیری قانون وغیرہ داخل ہیں، جو معاملات

ان دونوں اصناف سے تعلق رکھتے ہیں وہ موجودہ زمانہ کی وفاقی مملکتوں میں
مختلف الوسعت حد تک مرکزی حکومت کے قبضے میں کر رہنے دیئے جاتے ہیں۔

۵۔ اب ہمیں ان شرائط پر غور کرنا چاہیئے جن کے تحت میں دستور
کی وفاقی صورت موزوں ہوتی اور طبعاً اس کے پیدا ہونے کا میلان پایا جاتا ہے
ان حالات میں سب سے زیادہ اہم خارجی تعلقات میں قوت کی ضرورت ہے۔
یہ ضرورت تاریخ کے اس تمام دور میں قائم رہی ہے جس کا بہت قریبی زمانہ تک
ہم نے سراغ لگایا ہے اور اب تو اس کی اہمیت تمام سابقہ زمانوں سے زیادہ
بڑھ گئی ہے جس جگہ ایسی قومیں قریب قریب میں آباد ہوتی ہیں جو اپنی حقیقی
خود مختاری کے قائم رکھنے کے لئے مضطرب ہوتی ہیں مگر انھیں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ
فرداً فرداً وہ اتنی کمزور ہیں کہ اپنے قرب وجوار کی زبردست سلطنتوں کے مقابلہ
میں ٹھہر نہیں سکتی ہیں وہاں وفاقی اتحاد حصول بقا کا صریحی و بدیہی ذریعہ ہوتا ہے۔
جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، یونانی تاریخ کے تمام دور میں وفاقیت نے جو کچھ کارنمایاں
کیا ہے اس سے اس کی مثال روشن نظر آرہی ہے، اور تاریخ ازمنۂ وسطی کے
دور آخر اور تاریخ زمانۂ جدیدہ کے دورِ ابتدائی میں وفاقی اتحاد کے لئے جو کچھ کامیاب
یا ناکامیاب کوششیں بارہا کی گئیں ہیں ان سے بھی اس کی مثال کچھ کم عیاں نہیں ہوتی۔
چنانچہ جو مثالیں اوپر دی گئی ہیں، ان پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے
کہ شمالی جرمنی کے "ہنسیاٹی" شہروں کی لیگ تجارتی مفاد کے برقرار رکھنے کے لئے
قائم ہوئی تھی اور یہی حال رائن کے شہروں کی لیگ کا تھا۔ سوئزرلینڈ کے
زیادہ دیرپا وفاقی اتحاد کی ابتدا پہاڑیوں کی چھوٹی چھوٹی کسان جماعتوں کی اپنی
خود مختاری کو قائم رکھنے کی کوشش سے ہوئی اور ہالینڈ کے صوبوں کا اتحاد سولھویں
صدی کے ربع آخر میں اسپین کی ستمگار فوجوں کے مقابلے میں خطرناک دلیرانہ
جد وجہد کی وجہ سے وجود پذیر ہوا۔ ان تمام صورتوں میں یہ صاف واضح ہے کہ
خارجی معاملات میں تقویت مزید کی ضرورت کے سوا کوئی امر ایسا نہیں تھا جو ان
اتفاق کرنے والی قوموں میں اتنے پائدار قسم کا اتحاد پیدا کر دیتا۔ لہذا جزوی
وفاقیت کی وہ مختلف النوع کوشش جو تیرھویں صدی کے بعد سے رومانی جرمانی شہنشاہی کی

خصوصیت خاص بنگئی تھیں ان کا باعث زیادہ تر مرکزی حکومت کی کمزوری تھی ۔

حال کے زمانہ میں ممالکِ متحدہ امریکہ میں جو صورت پیش آئی اس میں بھی انگلستان کی جن نوآبادیوں نے ملک مادری کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکا تھا اور ابتداً وہ ایک دوسرے سے جدا تھیں ان کی باہمی رقابت اور جب آزادی بہ حیثیت مجموعی قطعاً غالب آجانیوالا امر یہی محرک تھا ۔ تاہم ممالک متحدہ امریکہ کی حالت میں پہلا وفاقی اتحاد جنگ خود مختاری کے باعث وقوع میں آیا مگر ۱۷۸۹ء والے پایدار اتحاد ثانی کے قائم ہونے میں تجارتی خیالات کو بھی اہمیت حاصل تھی ، اور آئندہ بھی جب تک مختلف سلطنتیں اپنے وقتی انتظامات محاصل درآمد و برآمد کے ذریعے سے اپنے بازاروں سے غیر ملکی پیداوار کو خارج کرتی یا ان میں وقت حائل کرتی رہیں گی اس وقت تک اس قسم کے خیالات لظنِ غالب اہم اثر پیدا کرتے رہیں گے ۔ عام طور پر کسی بڑی مملکت کے ارکان کے لئے فی الجملہ یہ مفید ہوگا کہ ایک زیادہ وسیع رقبہ میں تعلقیہ تجارت کے مفاد سے مستفید ہوں بشر طیکہ داخلی تجارت ہیں کسی قسم کی روک نہ ہو ۔ ممالک متحدہ کی مثال جب اس حیثیت سے پیش کی جاتی ہے کہ وہ تحفظِ تجارت سے حاصل کردہ خوشحالی کا ایک نمونہ ہے تو اس کا صاف جواب یہ ہے آزاد تجارت کا بڑے سے بڑا رقبہ جو اب تک کہیں عالم وجود میں آیا ہے وہ یہی ممالک متحدہ امریکہ ہے ۔

۶۔ اب میں وفاقیت کی اس حیثیت کی طرف پلٹتا ہوں کہ وہ نظم وامن کو قائم رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ آزادی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے ، اور اس حیثیت میں وحدانی سلطنت کی بہ نسبت جدید عمومیت کے تخیل سے زیادہ چھوا معلوم ہوتی ہے ۔

عمومی اقتدار اعلیٰ کا جو اصول مسلمہ روسو نے شایع کیا تھا وہ ایک ہمہ گیر اصول تھا ، اور جب روسو کی بلا واسطہ عمومیت کا تخیل ایک مرتبہ ترک کر دیا گیا تو صاحب اقتدار اعلیٰ قوم کے حدود کا اصولی تعین کسی قدر مبہم چھوڑ دیا گیا ۔ پس جب فرانس میں تغیر کے بحران عظیم کے بعد ہی ، فرانس کو مرکز قرار دیکر انقلابی تبلیغ شروع ہوئی تو یہ بہت آسانی کے ساتھ قومی حدود کے توسیع کی قدیم خواہش کیساتھ خلط ملط ہو گیا اور اس طرح جمہوری نظریے کے نام سے یورپ کے مشہور آزادی کی

پرجوش اشاعت کے بعد نپولین کا ان کوششوں کی طرف عود کرجانا کہ یورپ کے اندر فرانس کی شہنشاہی حیثیت قائم ہوجائے، یہ کوئی ناگہانی تغیر نہیں تھا۔ "قومیت" کی تحریک (جوانیسویں صدی کا ویسا ہی وصفِ خاص ہے جیسے تکوین دساتیر) وہ جس طرح فرانس کی انقلابی تحریک کے تسلسل میں داخل تھی اسی طرح وہ اس کے خلاف رجعتِ قہقری بھی تھی، اور "مظالم اکثریت" کے خطرے کا صاف وصریح اندیشہ جسے روسو نے نظر انداز کردیا تھا اور جس پر ٹوک ویل کے مانند دوسرے مصنفین نے زور دیا ہے، اس اندیشہ نے آزادی کی اس اہم ضمانت کی طرف توجہ دلائی جو مقامی حکومت خود اختیاری سے حاصل ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ دوسری جانب بھی اہم ملحوظات موجود تھے، اور یہ بھی خیال رہے کہ کوئی ملک جس قدر زیادہ مہذب اور جس قدر زیادہ آباد ہوتا جاتا ہے اسی قدر یہ ملحوظات زیادہ قوی ہوتے جاتے ہیں مقامی مجالس مقننہ میں بالا وسط تدبری روشن خیالی کی توقع نسبتاً کم کرنا چاہئے اور حاوی طبقے کے مفاد میں مضر قوانین کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے کیونکہ اس قسم کے غلبۂ واستیلا کو مجموعی ملک کی بہ نسبت متعدد اضلاع میں سے کسی نہ کسی ضلع میں زور دکھانے کے مواقع زیادہ مل جاتے ہیں، لیکن اس وقت مجھے جس امر سے بحث ہے وہ یہ ہے کہ جو قومیں پہلے سے آزاد ہوں ان کے اتحاد کے علاوہ یہاں ایک اور طریقہ ہے جس کی وجہ سے زمانۂ جدید میں وفاقیت کو ترقی کا موقع مل گیا ہے، وہ یہ کہ جو مملکتیں پہلے فردی طرز کی تھیں ان میں احساس قومیت کے اثر کے تحت مستحکم مقامی آزادی قائم ہوگئی ہے۔ یہ ملحوظ رہنا چاہئے کہ اس قسم کی مملکتوں میں اکثر ایک طرح کے وفاقی اصول کا اثر تھا اور اس پر صرف مشترک شاہانہ حکومت کے استیلا کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا تھا جاگیری دور اور جاگیریت کے بعد کے ارتقائی دور میں ان مملکتوں کی تکوین بالطبع اس طرح ہوتی تھی کہ موروثی امراء وسربراہ ممالک کی وارث عورتوں سے عقد کرلیتے تھے۔ آسٹریا اس کی ایک نمایاں مثال باقی ہے مگر اور بھی بہت سی مملکتوں کی یہی حالت تھی، صرف ازمنۂ وسطیٰ کے نیابتی ادارات کے زوال اور شاہی طاقت کی ترقی نے بتدریج وفاقی اصول کو محو کردیا۔

۷۔ دستوری بادشاہی کی آئندہ حالت کی پیشینگوئی کرنا مجھے منظور نہیں مگر وفاقیت کے ارتقا کی نسبت کچھ پیشینگوئی کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جسکی وجہ کچھ تو طریق عمل کا وہ عمومی میلان ہے جس کا ذکر ابھی ابھی ہو چکا ہے اور کچھ وجہ وہ رجحان ہے جس کا اظہار تمدن کی تمام تاریخ میں ہوتا رہا ہے وہ یہ کہ وسیع تر سیاسی معاشرے برابر "ترکیب تامہ" حاصل کرتے جاتے ہیں جو تمدن کی ترقی کے ساتھ ساتھ بڑھتی معلوم ہوتی ہے (یہ "ترکیب تامہ" کا لفظ اسپنسر کا ہے)۔ یونانی اطالوی شہری مملکتوں کی ابتدائی تاریخ میں بھی ہیں اس میلان کا پتہ دے چکا ہوں، اروما وایتھنز بظاہر ایسے عناصر کے اجتماع سے بنے تھے جن میں سابقاً عناد کی حالت قائم رہ چکی تھی، ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ جرمانی قبائل کی تاریخ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ برابر وسیع و وسیع تر مجموعے میں متحد ہوتے جاتے تھے اور اسے تو ہم خصوصیت سے دیکھ چکے ہیں کہ تیسری صدی قبل مسیح میں سکندر اعظم کے جانشینوں کی جنگ وجدل میں جب یونانی شہر چالیس برس تک بے بسی کے ساتھ زیر وزبر ہو چکے (اور یہ محض اس وجہ سے ہوا کہ یہ شہر اپنی قلت وسعت کی وجہ سے ان کی فوجوں کی تاب نہیں لا سکتے تھے) تو پھر اس کے بعد اکائیائی لیگ کی تجدید ووسعت نے انھیں حقیقی خود مختاری کا ایک مختصر زمانہ عطا کیا۔ (وہ قدیم لیگ جس میں اکائیہ کے نسبتاً مختصر شہر شامل تھے، اسی کے ساتھ اب متعدد اہم شہری مملکتیں متحد ہو کر ایک جماعت بن گئی تھیں)، حال کے زمانے میں ہم نے جرمنی و اطالیہ کی تکوین میں بھی یہی میلان دیکھا ہے اور شمالی امریکہ سیاسی معاشرے کی ایک ایسی موثر مثال پیش کرتا ہے جس میں مغربی یورپ سے ایک وسیع تر قطعۂ ارض پر اندرونی امن قائم کیا گیا ہے۔ اس لئے میں اس تخیل کو پیش بینی کے حدود سے باہر نہیں سمجھتا کہ مغربی یورپی سلطنتوں میں کوئی اس سے بڑھی ہوئی "ترکیب تامہ" وقوع پذیر ہو جائے، اور اگر ایسا ہوا تو اغلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ امریکہ کی مثال کی تقلید کیجائے گی اور جدید سیاسی مجموعہ ایک وفاقی دستور کی بنیاد پر قائم ہوگا۔[۱]

---

[۱] ملاحظہ ہو "مبادی سیاسیات"، باب چہاردہم فقرہ ۱۔

جب میں اپنی نگاہ کو ماضی سے مستقبل کی طرف پھیرتا ہوں تو مجھے شکل حکومت کے متعلق سیاسی پیشینگوئیوں میں سب سے زیادہ اغلب پیشینگوئی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وفاقی اصول کو وسعت ہو گی۔

تمّت
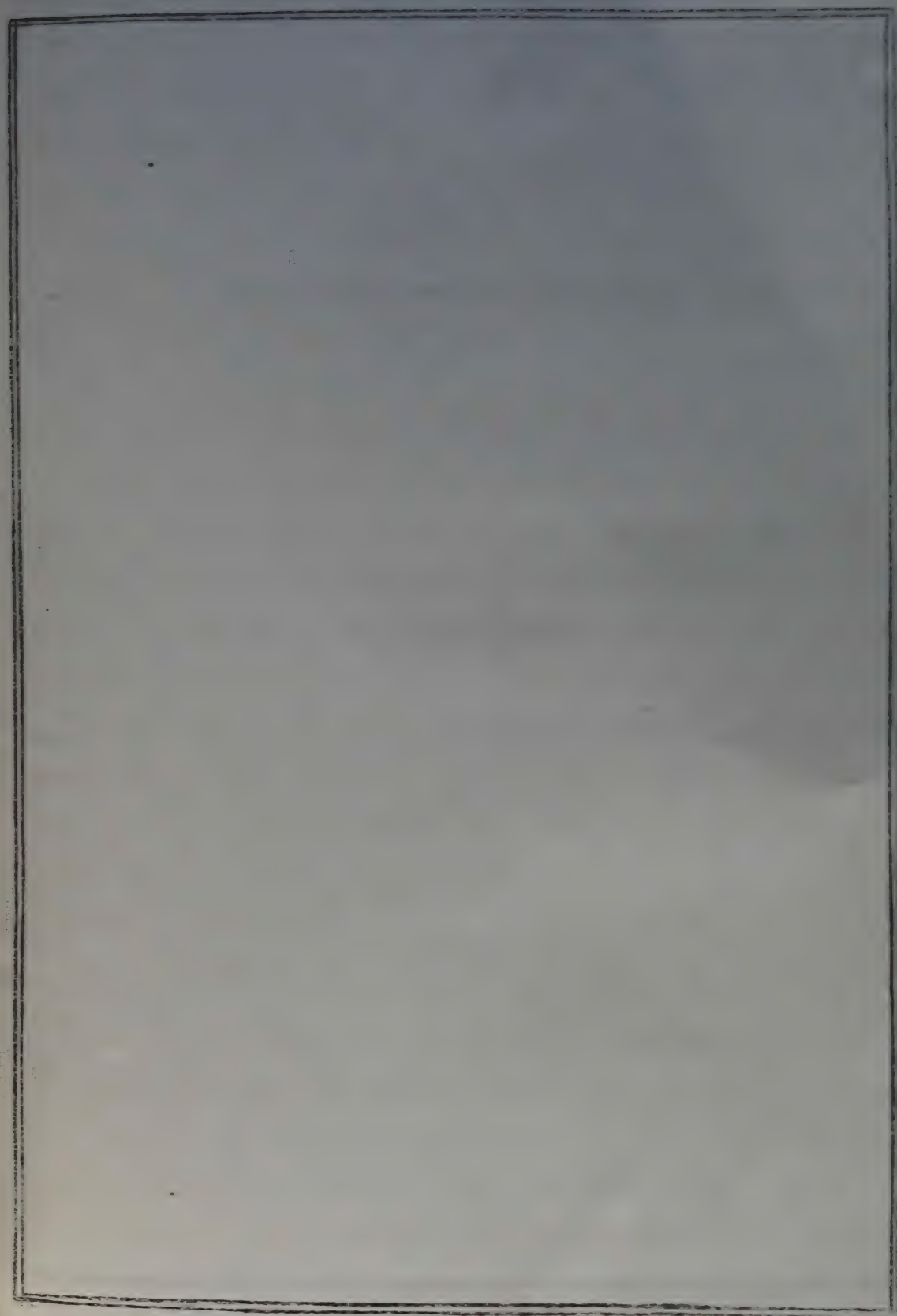
ضمیمہ

تعلیق (الف) متعلقہ صفحہ ۹۰

اہلِ اسپارٹا کی تعداد کا زوال

اہلِ اسپارٹا کی تعداد کا زوال نہایت ہی متحیر کن ہے۔ ہیروڈوٹس (جلد ۷، صفحہ ۲۳۴) جنگ تھرموپلی کے وقت (یعنی سنہ ۴۸۰ ق م میں) اہل اسپارٹا کا شمار تقریباً آٹھ ہزار کا کرتا ہے۔ گلبرٹ ("قدیمیات ممالک یونان" (Gilbert: Griech. Staatsalt) یہ اندازہ لگاتا ہے کہ ۳۷۱ ق م میں ان کی تعداد پندرہ سو سے کچھ یوں ہی سی زائد تھی۔ ارسطو تقریباً ۳۳۰-۳۲۲ ق م میں "ایک ہزار بھی نہیں" قرار دیتا۔ پلوٹارک ("اگے سی لاؤس" ۵) ۲۴۳ ق م میں صرف سات سو بتاتا ہے، جن میں سے صرف سو آدمی مالکان اراضی واقطاع مفوضہ تھے باقی لوگ شہر میں ایک ایسے انبوہ کی طرح سکونت رکھتے تھے جن کا نہ کوئی ذریعہ معاش تھا اور نہ وہ کسی طرح کے حقوق رکھتے تھے۔ اس کے متعلق یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ (۱) اہل اسپارٹا کی آبادی میں نمایاں زوال سنہ ۴۸۰ ق م اور ۳۷۱ ق م کے درمیانی برسوں میں ہوا اور (۲) کامل الاوصاف شہریوں میں نمایاں زوال سنہ ۳۳۰ ق م اور ۲۴۳ ق م میں ہوا، کیونکہ ارسطو کے الفاظ سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ افلاس کی بنا پر اخراج بہت بڑی حد تک نہیں پہنچا تھا۔ اگر ایسا تھا تو ایپی تادیوس کا قانون شقِ اول کی توجیہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ایپی تادیوس اس زمانے سے قبل نہ ہو گزرا ہو جس کا تعین پلوٹارک نے کیا ہے ("اگے سی لاؤس" ۵) میں کریتوس (مقالۂ دوم باب اول) سے اتفاق رائے کرنے کی طرف مائل ہوں کہ حقوق شہریت تربیت یافتہ غیر شہریوں کو عطا کئے جاتے تھے جو بعض اوقات اہل اسپارٹا کی ناجائز اولاد ہوتے تھے۔ بعض اوقات "موتھاکیں"

یعنی ہیلوٹ یا غیر ملکی (زینوفون: ہیلے نیکا ۵، ۱۱، ۹) جن کی پرورش و تعلیم اسپارٹیوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس طرح پر بادشاہ کی منظوری سے تبنیت کے ذریعہ سے تعداد قایم رکھی جاتی تھی مگر محض اس کے مسدود ہو جانے سے اہل اسپارٹا کی اس کمی کی توجیہ نہیں ہو سکتی جو تھر موپلی کے مقابلہ میں جنگ پیلوپونیسر میں تھی۔ یہ ممکن ہے کہ جو طبقہ بعد میں "نیو داموڈیس" کہلاتا تھا اسے ہیروڈوٹس نے اہل اسپارٹا کے ساتھ خلط کر دیا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ طبقہ اہل اسپارٹا کے دوش بدوش لڑتا ہو اور بعد میں تفریق زیادہ سخت کر دی گئی ہو؟

بوسولٹ (قدیمیات یونان ۱۰۱) اسپارٹا کی اس سریع تنزل آبادی کو دو اسباب سے منسوب کرتا ہے (۱) مسلسل لڑائیوں کے نقصانات (۲) اختلال خاندانی اور عیش و عشرت لیکن (۱) لی کرگوس کے وقت سے جنگ ایران تک بھی اہل اسپارٹا کو اسی طرح جنگ کرنا پڑتی تھی (۲) یہ سبب، بوسولٹ کے بیان کردہ اسباب و عمل کے بموجب چوتھی صدی میں کچھ یوں ہی سا عمل کر سکتا تھا در انحالیکہ بہت بڑا زوال سنہ ۴۸۰ ق م سے سنہ ۴۱۸ ق م تک ہوا، مگر بوسولٹ کا دعویٰ یہ ہے اور میرے خیال میں یہ دعویٰ بلا کافی دلائل کے ہے کہ سنہ ۴۱۸ ق م میں بمقام مین تی نیہ چھ ہزار اہل اسپارٹا تھے (کتاب متذکرۂ بالا ۹۸) یہ سنہ ۴۱۸ ق م سے سنہ ۳۷۱ ق م تک کے تنزل آبادی کو بالکل ناقابل تشریح بنا دیا ہے۔

تعلیق (ب) متعلقہ صفحہ ۹۴

سوار اور عدیدیت

میرے خیال میں بادشاہوں کے بجائے "مبارزوں کی حکومت" قائم ہو جانے کے بعد (ارسطاطالیس: سیاسیات ۶ (۴)، ۱۳) کے پہلے نظم حکومت کے متعلق ارسطو کی تعمیم کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ ایک باقاعدہ ہمہ گیر صداقت ہونے کے بجائے زیادہ تر ایک تاریخی اہمیت و عام قدر و قیمت رکھتی ہے۔ یہ صحیح ہو سکتا ہے کہ متعدد مملکتوں میں سوار عام جمعیت کے ارکان متوازی الوجود رہے ہوں اور انھیں کچھ سیاسی فرائض حاصل رہے ہوں، لیکن جس واحد صورت میں ہم قطعی طور پر ایسے سیاسی دستور کا ذکر سنتے ہیں یعنے

ایولس میں کیمے کے مقام وہاں یہ ہمارے سامنے اصلی دستور نہیں ہے بلکہ اس کی توسیع شدہ شکل ہے
اس گمان کی کوئی وجہ نہیں کہ تھسلی میں عدیدیت (یا عدیدیتوں کا مجموعہ) جو بظاہر مشترک
بادشاہ کی خفیف نگرانی میں غیر محدود زمانہ تک برقرار رہی وہ اس قسم کی عدیدیت تھی یا
یہ کہ تھسلی کی سوارہ فوج تمامتر ایسے اشخاص پر مشتمل تھی جو اپنی اس حیثیت میں سیاسی حقوق
رکھتے تھے۔ چوتھی صدی میں دیموس تھینس ("اعیانیت" Anstocr (۱۸۰۔۱۸۰) و "تنظیم" فرسالوی
Syntox) ۲۳،۷) کا ذکر کرتا ہے کہ وہ دو سو یا تین سو سواروں اور اپنے خانگی خدام کی
فوج کے ساتھ شامل ہوئے۔

اور میں اس کی کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ پانچویں صدی یا اس سے قبل کی سوارہ
فوج کیوں نہ زیادہ تر اسی طریقہ پر مبنی ہو۔

تعلیق (ج) متعلقہ صفحہ ۱۰۱

ابتدائی عدیدیت اور تجارت

تاجروں کے مخالف احساس کا زمانہ مقرر کرنے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ اپنے
وقوع سے پہلے کا نہ بتا دیا جائے اس کا کوئی کافی ثبوت نہیں ملتا کہ یہ احساس ابتدائی
اعیانیت یا عدیدیت کے زمانوں میں موجود تھا۔

"اوڈیسی (کتاب اول ۱۸۰) میں اتھینیا نے جو خصوصیت اختیار کی ہے وہ جہو
سے محبت رکھنے والے اہل تاخیا نا کے حکمراں " کی سی خصوصیت ہے جو ایک بحری مہم
پر تانبا خریدنے کے لئے تیمیز کو جا رہا تھا، اور اپنے مال تجارت کے طور پر چمکدار
لوہا لے جا رہا تھا" میرے خیال میں اس بیان کی اہمیت اس اظہار حقارت سے
زیادہ ہے جو اوڈیسی (کتاب ہشتم، ۱۵۶) میں سوداگروں کو غیر ورزشی کہنے سے
ہوئی ہے۔ نیز سافو کا بھائی جو بظاہر اچھے خاندان کا شخص معلوم ہوتا ہے، وہ تاجر
کی حیثیت سے لسبوس سے نوکراتس کو شراب لے جاتا تھا (اسٹرابو، ۱۷، ۱، ۸۰۸) اسی طرح سے سولن
کی نسبت یہ نہیں ظاہر کیا گیا ہے کہ تجارت میں مشغول ہونے سے وہ ذات سے خارج ہو گیا ہو

یقینی ہے کہ ساتویں اور آٹھویں صدیوں میں یوبیہ کے بڑے بڑے شہروں کے متعلق ہم جو کچھ سنتے ہیں، اس میں تجارتی و زرعی دولت کے درمیان اس قسم کی کسی رقابت کا نشان نہیں پاتے۔ ہیپوبوٹی کے تحت میں تقریباً ایک صدی تک آباد کارانہ اور تاجرانہ زندگی بسر کرنے کے بعد، کالکس نے ایریتریہ سے قدیم شجاعانہ انداز کے ساتھ زرخیز میدان کے متعلق جنگ کی۔ ایسا ہی مگارہ میں ہوا، ایک صدی سے زائد تاجرانہ سعی و کوشش کے بعد (جس میں مگارہ کورنتھ سے سسلی کے معاملات کے بابت مقابلہ کر رہا تھا، اور اس سے زیادہ موثر طور پر بحیرۂ اسود کی تجارت کے لئے ملطہ سے لڑ رہا تھا، اور دونوں جگہوں (خاص کر بزنطیوم) میں کامیاب نوآبادیاں قائم کر رہا تھا) ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سنہ ۶۳۰ ق م کے قریب جس ہنگامہ نے مطلق العنانی کے لئے موقع پیدا کر دیا وہ عام چراگاہ پر دولتمندوں کی مداخلت کا فساد تھا (ارسطو، سیاسیات" ۸ (۵) ۵، باب ۵) ایک صدی کے بعد نئی دولت کی رقابت کا تلخ اظہار تھیوگنس نے کیا ہے مگر یہ مطلق العنانی کے بعد ہوا ہے اور یہ تلخی ادنیٰ لوگوں کے خلاف ہے نہ کہ تاجروں کے خلاف بحیثیت تاجر کے یہ امر قابل لحاظ ہے کہ قرضداروں اور قرضخواہوں کے درمیان جو تنازعات ہوئے اور جن کی ایک جھلک ہمیں ایتھنز میں اس طرح نظر آتی ہے کہ یہی تنازعات سولون کے وضع قوانین کا باعث ہوئے اور مگارا میں بھی یہی صورت کچھ بعد میں پیش آئی (پلوٹارک: "مسائل یونان") ان مناقشات میں اس کا کوئی اشارہ نہیں ہے کہ قرضخواہ قدیم خاندان کے دولتمند زمینداروں سے کسی مختلف طبقہ کے لوگ ہیں۔ تمام تحریروں ("حیات سولون" مصنفہ پلوٹارک اور نیز اسی مصنف کے رسالہ نظم حکومت ایتھنز سے مقابلہ کیجئے) ان تصانیف سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ "پرانے وقتوں کے دولتمند تھے جو غریب کسانوں کو ہر صورت ان نئے دولتمندوں سے کم نہیں ستاتے تھے جنھوں نے زمین حاصل کر لی تھی۔ میں بوسولٹ (قدیمیات ۳۴) سے متفق ہوں کہ اغلباً یہ تصادم کم از کم جزاً اقتصادیات فطری سے اقتصادیات زر میں بدل جانے کے باعث تھا جبکہ تقریباً ساتویں صدی کے آغاز میں چاندی اور سونا مسکوک ہونے لگا اور بلاشبہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ قدیم خاندانوں کے حلقے میں نئی دولت دخیل ہوگئی یعنے مناکحت میں نسبت کے بجائے دولت کا زیادہ لحاظ رہنے لگا جس کے متعلق تھیوگنس یہ سخت شکایت کرتا ہے کہ "لوگ گھوڑوں میں نسل کا

خیال کرتے ہیں مگر بیویوں کے بارے میں نسل کا خیال نہیں کرتے، اور عورتوں کی بھی یہی حالت ہے" (تھیوگنس، دیتہ - ۳۴) اس سے ضمناً یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مگارا میں عورتوں کو انتخاب زوج میں گونہ غیر متوقع آزادی حاصل ہوگئی تھی۔ سولون کے دستور مملکت میں جو تغیرات ہوئے جن کے بموجب قدیم خاندان کے بجائے دولت کا مل سیاسی امتیازات کی بنا قرار پا گئی، اس قسم کے تغیرات بھی اسی کا نتیجہ تھے۔

ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ دستکاروں اور خردہ فروشوں کے اخراج سے سوداگروں کا اخراج لازم نہیں آتا۔ مثلاً تھبز کا یہ طریق[1] کہ سیاسی امتیازات صرف انھیں لوگوں کو دیے جاتے تھے جو برائے چندے ذلیل پیشہ وری سے پرہیز کرتے تھے اس کا اطلاق ایسے لوگوں پر نہ ہونا چاہیئے جو بڑی قسم کی تجارت کرتے تھے۔

تعلیق (د) متعلقہ صفحہ ۱۰۷

تہذیب و تمدن میں یونانی نوآبادیوں کا تقدم

تہذیب و تمدن میں یونانی نوآبادیوں کے تقدم سے زیادہ کوئی امر نمایاں نہیں ہے۔ مثلاً، فلسفہ، دو صدیوں تک نوآبادیوں ہی میں رہا، اس کا آغاز ایشیائے کوچک میں ہوا اور کچھ دنوں تک وہیں مرکوز رہا، بعد ازاں اس کی تاریخی دلچسپی زیادہ تر اطالیہ اور سسلی کی جانب منتقل ہوگئی۔ پانچویں صدی کے وسط کے قریب جنگ ایران کے بعد جب ایتھنز کو فوقیت حاصل ہوئی ہے، اس وقت فلسفہ کو گویا اس کا طبعی وطن ملگیا۔

تہذیب و تمدن کا یہ تقدم بلا شبہ کسی حد تک زیادہ بڑھے ہوئے طبعی فوائد فایقہ کی وجہ سے تھا، یعنی (۱) زمین کی زرخیزی خاص کر اطالیہ ("یونان کبیر") میں جہاں اس زرخیزی کی وجہ سے سیبارس کا تمول و تنعم چھٹی صدی میں ضرب المثل ہوگیا۔ (۲) توسیع کی زیادہ قدرت یعنی ملک کے اصلی باشندے تمدن کی ایسی پست حالت میں تھے کہ ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا، کم از کم ابتدائی دو صدیوں تک یعنی ۷۳۰ء سے جب کہ آبادکاری کا زیادتی کے ساتھ

[1] ارسطو، سیاسیات، حصہ ۷ (۶)، باب ۷۔

آغاز ہوا چھٹی صدی کے اختتام تک۔ (بعد میں سامنی، لوکانی، اور بیرونی اقوام کی طرف سے خطرہ پیدا ہو گیا۔ اور اطالوی یونانی ساحل تک ہٹ گئے) مزید براں یہ بھی اغلب ہے کہ اس زمانہ کی طرح اُس زمانہ میں بھی مستعمرات میں مملکت مادری کی قوت و مساوات کا بڑا حصہ شامل ہو جاتا ہوگا، اور وہاں ایسے سیاسی ادارات سے آغاز ہونے لگا ہو گا جو قدامت کے ان عناصر سے پاک رہے ہونگے جن سے ترقی میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ ان کا خطرہ یہ رہا ہو گا کہ قدیم سیاسی عادات سے منقطع ہو کر، ان کی ترقی تیز ہوتی رہی ہو گی مگر اس کے نتائج نسبتہً کم پائدار و قابل اطمینان ہوتے رہے ہونگے، اور اگر مثالاً ایتھنز کا سرقوسہ سے مقابلہ کیا جائے تو یہی حالت معلوم ہوتی ہے۔

تعلیق (ھ) متعلقہ صفحہ ۲۰۹

غلامی کے باب میں قانون اجانب اور قانون فطرت کے درمیان تضاد

فلورنٹینس کہتا ہے کہ غلامی قانون اجانب کا ایک دستور ہے جس کے بموجب ایک شخص دوسرے کے تحت میں "فطرت کے خلاف" آجاتا ہے جسٹی نین کے قوانین میں یہ امر اور بھی زیادہ صاف بیان ہوا ہے (۱، ۳، ۲)

رومن مقننین کو جن جماعتوں کا واقعی علم تھا، ان کے ہمہ گیر ادارات اور قانون طبعی کے باہمی تضاد کا مقننین کی جانب سے رضامندانہ تسلیم کر لیا جانا اس امر پر نظر کرتے ہوئے گو نہ حیرت افزا ہے کہ رواقیوں اور سسرو، نیز بعد کے مقننین سے فطرت کے قانون کے خاموشانہ جواز کی (بایں حیثیت کہ وہ اسے عقل ابدی کا قانون سمجھتے تھے) نہایت سخت الفاظ میں تائید کی ہے۔ پلوٹارک نے واقعاً رواقیوں پر یہ الزام لگایا تھا کہ وہ کسی مملکت کے کسی اثباتی قانون کے جواز کو اس حد سے زائد تسلیم نہیں کرتے کہ وہ فطرت اور عقل کے صحیح قانون کے مرادف ہو، اور یہ یقینی ہے کہ قانون فطرت کے متعلق سسرو کے الفاظ سے یہی نتیجہ پیدا ہوتا ہے مگر یہ زیادہ حیرت انگیز ہے کہ گائس یہ کہتا ہے کہ فطری حق کی دلیل پر اقتدار سیناتی کا اثر نہیں پڑ سکتا اور اسی طرح ملکی حقوق کو ملحوظ رکھنے سے فطری حق کی قوت متاثر نہیں ہوتی اور سیل سوس

اس کی تصدیق کرتا ہے کہ فطرت جسے ممنوع قرار دیتی ہے کوئی قانون اسے جائز نہیں کر سکتا"

تعلیق (۹) متعلقہ صفحہ ۳۲۱

دوجے کے اختیار کا بتدریج محدود ہو جانا

سیاسیات کے جدید طالب علم کے لئے وینس کی تاریخ ویسی ہی دلچسپ ہے جیسی مملکتوں کے قدیم ترار تقاء میں اسپارٹا کی تاریخ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے شاہی اختیار کی تدریجی تخفیف کا اظہار ہوتا ہے کیونکہ وینس کا دوجے اگرچہ منتخب ہوتا تھا اور یہ انتخاب ایک ہی خاندان سے نہیں ہوتا تھا پھر بھی بقول سسمنڈی (جلد ۳- باب ۲) علیحدہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہی عادل اعظم تھا مملکت کی تمام فوجوں کا سپہ سالار تھا، اس کا رسمی اعزاز شرقی شان و شوکت سے کسی قدر مشابہ تھا اور اکثر اسے یہ اختیار دیدیا جاتا تھا کہ وہ اپنے منصب کو اپنی اولاد کی طرف منتقل کردے۔ لہٰذا جس تدریجی کارروائی کے ذریعہ سے اس کے اختیارات محدود کئے گئے، انھیں شاہی سے عدیدیت کی جانب بڑھنے کی کارروائی کہہ سکتے ہیں۔
۷۹۶ء میں اول اول ایک ڈیوک یا دوجے کے تقرر کے بعد تین دوجے ہوئے، اس کے بعد ڈیوک کا یہ منصب منسوخ کردیا گیا اور سالانہ صدارت کا تجربہ کیا گیا مگر یہ ناکافی پایا گیا اور ۷۴۲ء میں دوجے پھر واپس آگیا۔ آئندہ کی تین صدیوں میں دوجوں نے موروثیت کے لئے جدوجہد کی مگر ناکام رہے، اس کے بعد (جیسا کہ سسمنڈی کہتا ہے) ۱۰۳۲ء میں اسے دو مشیر دئے گئے جن کی رضامندی ہر ایک حکومتی فعل کے لے درکار تھی اسے اپنے اختیار میں اپنے کسی لڑکے کو شریک کرنے سے ممنوع قرار دیا گیا، اور اسے مجبور کیا گیا کہ ہر اہم موقع پر سربرآوردہ شہریوں سے مشورت کرے، جو صلاح دینے کے لئے مدعو کئے گئے ہوں" (Pregadi) ایک سو چالیس برس بعد (قوم کی عام جمعیتوں کو منسوخ کئے بغیر جو اہم مواقع پر چودھویں صدی تک طلب کی جاتی رہیں) چار سو اسی شہریوں کی ایک سالانہ مجلس مشورت قائم کی گئی جسے وہ تمام اختیارات تفویض کئے گئے جنھیں دوجے عمل میں نہیں لاتا تھا اور ریشرکت دوجے جمہوریت کا اقتدار اعلیٰ بھی اسے تفویض ہوا مگر

دوسرے اطالوی انتخاب کی طرح، اس مجلس کے معاملے میں بھی انتخاب براہ راست قوم کی جانب سے نہیں ہوتا تھا۔ ہر محلے سے دو ٹریبیون مقرر ہوتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک ٹریبیون مجلس کے لئے چالیس ارکان کا انتخاب کرتا تھا، کسی ایک ہی خاندان کے چار سے زائد افراد کے لینے کی ممانعت تھی۔ بارھویں صدی میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان ٹریبیونوں کا انتخاب قوم کی طرف سے ہوتا تھا۔ بعد میں یہ انتخاب مجلس کے ہاتھ آگیا، مجلس نے اس حق مزید کا بھی دعویٰ کیا کہ اپنے سالانہ عہدے سے دست کش ہونے کے قبل ٹریبیون جو انتخاب کریں انھیں وہ چاہے منظور کرے، چاہے رد کر دے، الغرض تیرھویں صدی میں یہ سالانہ منتخب شدہ مجلس جو بظاہر نیابتی معلوم ہوتی تھی، عملاً ایک جزو انتخابی کی جماعت بن گئی۔ لیکن وینس کی امرا عدیدیوں کی معمولی زیادتیوں سے محفوظ رکھے گئے تھے اس لئے ان کے ایک طرف دوجے تھا اور دوسری طرف قوم کیونکہ اگر قوم کے ساتھ جسمانی کشمکش ہو تو وہ کسی ایسے فائدۂ فائقہ پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے جیسے لمبارڈی کے امرا کو میدان میں جنگ ہونے کی صورت میں حاصل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اطالیہ کے دوسرے شہروں میں، امرا کے خلاف انصاف کا نفاذ ایک ایسا معاملہ ہو گیا تھا کہ اسے کسی ایک شخص کے ہاتھ میں رکھنا پڑتا تھا جو عظیم الشان قوت سے مسلح ہو، اس کے برخلاف ۱۱۷۲ء میں وینس میں، تعزیری اختیارات دوجے کے ہاتھ سے نکال لئے گئے اور ایک مجلس کو سپرد کر دیئے گئے جو مجلس اعظم کے چالیس ارکان پر مشتمل تھی اور جسے مجلس چہل بزرگان کہتے تھے۔ اس کے بعد، ۱۲۲۹ء میں مجلس مدعوئین کی (جو دوسری جگھوں کی cuza Consiglio di cred- کی طرح کی تھی) تعداد ساٹھ معین ہو گئی، اور اسے مجلس اعظم کی انتخاب کردہ بنا دیا گیا۔ یہ جماعت، مجلس اعظم کے لئے بمنزلۂ "سابق الغور" مجلس کے تھی، اور اسے خاص طور پر تجارتی اور غیر ملکی معاملات کی نگرانی تفویض تھی۔ اس زمانہ میں پانچ "نگران مواعید دوجے" اور تین مفتش دوجے مقرر کئے گئے۔ ثانی الذکر کا کام یہ تھا کہ وہ اس کے چال چلن کی جانچ کریں اور بصورت الزام اس کے ورثا سے تاوان وصول کریں۔ "دوجے کے حلف کی اصلاح کرنے والوں" کی محنت سے سنہ ۱۲۴۹ء کے بعد سے "مواعید ہائے دوجے" کا ایک بڑا مجموعہ طیار ہو گیا جس میں تیرھویں صدی تک برابر اضافہ ہوتا رہا۔ جیسا کہ سمنڈی کہتا ہے۔ ان وعدوں سے حقوق شاہی

میں کمی آجاتی ہے۔" دوجے صرف یہی وعدہ نہیں کرتا تھا کہ وہ قوانین کو ملحوظ رکھے گا اور مجلسوں کے احکام کو عمل میں لائے گا بلکہ یہ بھی وعدہ کرتا تھا کہ وہ غیر ملکی قوتوں سے مراسلت نہیں کرے گا، رعایا جو خطوط اس کے نام بھیجے گی انھیں اپنے مشیروں میں سے کسی ایک کی موجودگی کے بغیر نہ کھولے گا، مملکت وینس سے باہر کوئی زمینداری اپنے قبضہ میں نہ رکھے گا، کسی فیصلہ میں استحقاقاً یا واقعاً مداخلت نہ کرے گا، مملکت کے اندر اپنی قوت کے بڑھانے کی کبھی کوشش نہ کرے گا، اپنے کسی رشتہ دار کو اپنی جانب سے جمہوریت کے اندر یا باہر کوئی ملکی، فوجی یا کلیسائی عہدہ نہ دے گا، کسی شہری کو یہ اجازت نہ دے گا کہ وہ اس کا ہاتھ چومے یا اس کے سامنے جھکے، شاہی شکلوں کے اندر رہ کر عدیدیت کی جانب جو تقلیب ہوتی ہے اس کی عام خصوصیت کے برخلاف اس فہرست میں اصلیت کے بغیر ظاہر کو برقرار رکھنے میں عجیب غیر مشابہت معلوم ہوتی ہے۔ اس کی توجیہ بلاشبہ یہ ہے کہ سب کچھ ہونے کے بعد وینس والے یہ نہیں چاہتے تھے کہ دوجے محض ایک رسمی و عدالتی شخص ہو کر رہ جائے۔

تعلیق (ز) متعلقۂ صفحہ ۵۰۴

مرضی عامہ کے متعلق روسو کا خیال

ہمیں روسو (معاہدۂ معاشری، مقالۂ دوم۔ باب ۳) کے بموجب "مشیت عوام" میں (جو "مختلف مشیتوں کا مجموعہ ہے اور جس میں شخصی اغراض ملحوظ ہوتے ہیں") اور "مشیت عامہ" میں تمیز کرنا چاہیئے جو صرف "مفاد عامہ" سے غرض رکھتی ہے۔ اگر ہم افراد کی مرضی کے ان عناصر کو جو ایک دوسرے کی تعدیل کرتے رہیں، بحث سے خارج کر دیں تو جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہی "مشیت عامہ" ہوگا۔ ادارۂ مملکت کی غایت جو "مشیت عامہ" ہے (مقالۂ دوم باب ۱) وہ صرف "ان ہی عناصر پر مشتمل ہے جو مختلف قسم کے مفادیں مشترک ہوں" اور وہی سلطنت کے قویٰ کی جانب رہبری کر سکتی ہے مگر اس مرضی کے لئے واقعاً عام ہونے کے واسطے اسے اپنے کو قوانین میں ظاہر کرنا چاہیے جو "جملہ شہریوں پر مساویانہ جبراً ان کی طرف داری کرتے ہوں" امتیازات یا خاص معاملات کے فیصلوں میں (مقالۂ دوم، باب ۴) روسو کی

غلطی یہ ہے کہ (۱) وہ یہ نہیں دیکھتا کہ مجموعے کا فیصلہ واقعی حیثیت سے کثرت کا فیصلہ ہے۔ اور (۲) کسی قانون کی نسبت یہ تیقن نہیں ہو سکتا کہ وہ سب پر یکساں اثر ڈالے گا جب تک کہ سب لوگ حالت اور ماحول کے اعتبار سے کُلیتہً یکساں نہ ہوں۔

مقالۂ چہارم باب ۱ میں وہ یہ تشریح کرتا ہے کہ ایک صحیح الترکیب مملکت میں جس میں "بہت سے لوگ ملکر گویا ایک واحد جسم ترکیب دیتے ہیں" "وضع قوانین ایک سادہ امر ہے" مفاد عامہ ہمیشہ نہایت ممتاز ہوتا ہے اور اس کے احساس کے لئے محض عقل سلیم درکار ہے مگر جب کہ منفردانہ مفاد محسوس ہو اور چھوٹی چھوٹی معاشرتیں بڑی پر حاوی ہو جائیں" تو ایسی حالت میں "مشیت عامہ" تباہ یا خراب نہیں ہوتی بلکہ مغلوب ہو جاتی ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ "مشیت ہمیشہ مستقل" ناقابل تبدیلی اور پاک صاف ہوتی ہے لیکن افراد اپنے شخصی اغراض کو عام اغراض پر مرجح سمجھتے ہیں۔ راشی رائے دہندہ میں بھی اس کا احساس مشیت عامہ فنا نہیں ہو جاتا مگر وہ جس امر کا اظہار کرتا ہے وہ "اپنا ذاتی مفاد" ہے۔ اس کی رائے سے ایک غلط سوال کا جواب ملتا ہے یعنی اس سوال کا جواب نہیں کہ "آیا یہ امر مملکت کے لئے مفید ہے" بلکہ اس سوال کا جواب کہ "آیا یہ میرے اور میرے فریق کے لئے مفید ہے؟ یا نہیں" وغیرہ وغیرہ۔ مختلف مجالس میں قانون ترتیب عام یہ ہے کہ ہمیشہ سوال مشیت عامہ سے کیا جائے اور اسی سے جواب ملے ہم اس پر یہ خیال ظاہر کر سکتے ہیں کہ یہ امر حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے کہ روسو یہ خیال کرے کہ جو مقصد اس کے پیش نظر ہے وہ کسی "قانون ترتیب عامہ" سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اصلی مشکل فریقی اغراض کے باہمی تخالف میں مضمر ہے۔ مزید براں روسو کا یہ خیال ایک نفسیاتی غلطی پر مبنی ہے کہ "مشیت عامہ" اور "مفاد انفرادی" میں جو امتیاز ہے وہ واقعاً افراد کے دلوں میں مرعی ہوتا ہے، زیادہ تر ہوتا یہ ہے کہ عام افراد کے ذہن میں غرض عامہ کا تصور فی الحقیقت خود اپنی غرض کی پر زور خواہش سے متاثر ہو جاتا ہے۔
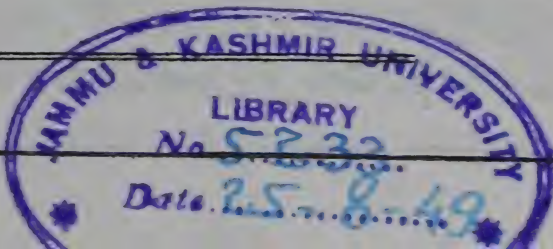
غلطنامۂ ارتقائے نظم حکومت یورپ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۰	اکثر ہوتا ہے	اکثر ایسا ہوتا ہے	۱۴۷	۳	مخلف	مختلف
۲۲	۵	معمل	عمل	۱۵۸	۱	لے	کے
۲۵	۷	دوایوائی	دوایوانی	۱۶۳	۶	وقوعہ	وقوع
″	۱۰	عدیدیہ	عدلیہ	۱۶۶	۱	امر	آمر
″	۲۱	نایئبین	نائبین	۱۷۲	۸	سینیاتی	سیناتی
۲۶	۱۵	اقتدار	اثر واقتدار	۱۷۶	۱۴	حیران	حیرانی
۳۵	۱۶	قدیم ترکوں	قدیم ترکون	″	۱۸	لیکینوس	لیکی نیوس
″	۱۸	کافی تھا ۔	کافی تھا ۔	۱۷۷	۱۶	سیات	سینات
۴۶	۱۷	ساتھ ساتھ	ساتھ	۱۷۸	۴	حرات	جرائت
۵۹	۲۵	Anclent	Ancient	″	۱۵	پیذا	پیدا
″	۲۵	Dercent	Descent	۱۷۹	۵	تفیب	تقلیب
۷۰	۷	جثۂ عصیم	جثۂ عظیم	۱۸۲	۸	معائر	مغائر
۸۱	۴	ارفن	ارخن	″	۱۶	تقلیب	تقلیب
۹۱	۹	قسم	اس قسم	۱۸۸	۲۰	کہنے والے	رکھنے والے
″	۲۱	مفاہمت	اسی مفاہمت	۱۹۰	۸	جمعیت تعلق	جمعیت سے تعلق
″	۱۴	خیال وواقعہ	خیال وواقعہ	۱۹۳	۲۲	منی	مبنی
۱۰۹	۱۶	حجکومین	محکومین	۱۹۵	۱۴	ایتھر	ایتھنز
۱۱۱	۲۴	فرست	فرصت	۲۱۳	۱۳	اوسطہ	اوسط
۱۱۴	۱۴	مقدانوی	مقدونوی	۲۱۶	۹	تائد	تائید
۱۲۵	۴	بیس	ہیں	۲۱۹	۱۴	لی	کی
۱۳۹	۱	اختتام	اختتام	″	۱۹	مدعم	مدغم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۲۱	۲۰	یونانیٔ	یونانی	۳۷۴	۹	محدوود	محدود
۲۲۷	۱۱	کوہِ آلیس	کوہِ آلپس	۳۸۱	۹	مناقی	منافی
۲۳۳	۱۷	انجام دیتے تھے	انجام دیئے تھے	۴۰۰	۱۳	یہلی	پہلی
۲۳۴	″	خصہ	حصہ	″	۱۰	بدادا	مدارا
۲۳۵	۲۰	لقل	نقل	۴۰۴	۳	تعلب	تغلب
۲۳۹	۲۲	شیوع	شیوع	″	۱۶	رہ سکے	رہ سکے
۲۴۰	۱۳	قرنیکی	فرنیکی	۴۰۶	۱	آپ کوآب	آپ کواپ
۲۶۷	۱۱	اہی	اسی	۴۱۴	۲۲	ایسے	ایسے
۲۷۳	۲۴	ہیمت ناک	ہیبت ناک	۴۲۰	″	خلاف وزری	خلاف ورزی
۲۷۵	۷	گر	مگر	۴۲۴	۳۱	ریولو	ریویو
۲۷۵	۲۱	حصیص	حصص	۴۲۴	۲۲	جانس	جانسن
۲۷۹	۲۲	رچڑر	رچرڈ	۴۲۷	۵	میں	مین
۲۹۷	۱۴	کرہستان	کوہستان	″	۱۳	عویت	عمومیت
۳۰۰	۴	جیین	جٹینین	۴۳۲	۱۶	یہ نسبت	بہ نسبت
۳۲۱	۸	انطیاق	انطباق	۴۳۳	۱۳	حب	جب
۳۲۲	۲۲	یوں بعید	بون بعید	۴۶۳	۲۵	سیامیلت	سیاسیات
۳۲۳	۲۴	مناقثات	مناقشات	۴۶۸	۲۰	اپنی پسندگی	اپنی پسند کی
۳۲۹	۲	گرجائیں	گرجامیں	۴۷۱	۹	ینشاگ	رینشاگ
۳۳۰	۲۰	پوڈنٹا	پوڈوسٹا	۴۷۳	۱۸	کام لاسکے	کام میں لاسکے
۳۳۱	۱۴	ادرن کاکام	اوران کاکام	۴۷۵	۲	لیوس	لوئیس
۳۳۸	۱۸	جاتے ہے	جاتے تھے	۴۸۰	۱۲	کرزیا گیا ہے	کردیا گیا ہے
۳۵۳	۹	قسس	قسیتیس	۴۹۲	۶	دتاتی	وفاقی
″	۱۰	اس ظلم	جواس ظلم	۴۹۳	۱۰	میٹرول	ٹیرول

صفحہ	سطر	غلط	صحیح	صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۹۳	۱۳	بیش	پیش	۵۰۳	۲	قصبے	قبضے
"	"	سوراج	حکومتِ خود اختیاری	۵۰۴	"	جب آزادی	حُب آزادی
"	۱۸	قوائین	قوانین	"	۲۵	غلط لمط	خلط ملط
۴۹۴	۱	اصلاحات	اصطلاحات	۵۰۶	۱	پیشین گوگی	پیشین گوئی

تمت